آگرہ
اور آگرے والے
میکش اکبرآبادیؒ

آگرہ اور آگرے والے

میکش اکبرآبادی

مرتّب:

سیّد حیدر علی شاہ رندؔ اکبرآبادی

Agra Aur Agre Wale (Articles) by Hazrath Mekash Akbarabadi,
Compield by Syed Hyder ali Shah Rind Akbarabadi.
2002 Rs. 150 =00

آگرہ

اور آگرے والے

میکش اکبرآبادیؒ

اشاعت	:	۲۰۰۲ء
قیمت	:	ایک سو پچاس روپے
کتابت	:	مجاہد کمپیوٹرس، دہلی
طباعت	:	ایم،آر،آفسٹ پریس، دہلی

زیر اہتمام:
ارشد علی خاں

ملنے کے پتے:

سیّد حیدر علی شاہ نیازی، میوہ کٹرہ، سیو بازار۔آگرہ۔۲۸۲۰۰۳
شاہ اکرام الدین۔۳۔ناناجی کا باغ،موتی ڈونگری روڈ، جے پور۔۳۰۲۰۰۳
نازش بک سینٹر۔۳۲۰۷۔پھاٹک تیلیان، ترکمان گیٹ، دہلی۔۱۱۰۰۰۶
نازش بک سینٹر، گھیر میر عالم خاں۔امیر گنج،ٹونک۔۳۰۴۰۰۱

آگرہ

اور

آگرے والوں کے نام

حقیقت سے فسانے تک فسانے سے نگاہوں تک
مرے پاس آتے آتے اس نے کتنے پیرہن بدلے

— میکشؔ اکبرآبادی

فہرستِ مضامین

حضرت سیّد محمد علی شاہ میکشؔ اکبرآبادیؒ

ولادت: مارچ ۱۹۰۲ء

وفات: اپریل ۱۹۹۱ء

ایک جامع صفات شخصیت

کسی شخص کو شخصیت بننے تک بڑا لمبا سفر پار کرنا ہوتا ہے۔ اگر سمتِ سفر صحیح نہیں ہے تو ایک منفی شخصیت وجود میں آئے گی جو متعلقہ شخص کے لیے بھی اور دیگر اشخاص کے لیے بھی ضرر رسانی پر مائل رہے گی لیکن سفر درست سمت میں ہو تو ایک مثبت شخصیت کا ظہور ہو گا اور عام فیض رسانی جس کی پہچان ٹھہرے گی۔۔۔ حضرت میکشؔ اکبر آبادی ایک ایسی ہی شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے شعر و ادب، فکر و فلسفہ اور عشق و تصوّف کے حوالے سے جو ذہنی اور روحانی اکتسابات کیے ان سے بہت سے تشنگانِ علم و آگہی فیض یاب ہوئے ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔

ایسی باکمال شخصیات سے اگر کسی کو شرف نیاز حاصل ہو جائے تو یہ اس کی خوش نصیبی ہے اور میں اس لحاظ سے خود کو خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ ایسی کئی شخصیتوں سے میرا نیاز مندی کا رشتہ رہا ہے۔ میکشؔ اکبر آبادی صاحب سے یہ رشتہ غائبانہ طور پر لگ بھگ چالیس سال پہلے ان دنوں قائم ہوا جب میں ماہنامہ ''تحریک'' دہلی کے ادارتی شعبے سے منسلک تھا۔ میں نے میکشؔ صاحب کا ایک مضمون جو جگر مرادآبادی کے شخصی اور شاعرانہ اوصاف کا بڑی خوبی سے احاطہ کرتا تھا، کسی رسالے سے ''تحریک'' میں نقل کیا اور اس کے ساتھ ہی میکشؔ صاحب سے گزارش کی کہ وہ براہِ راست بھی ''تحریک'' کے لیے کچھ تحریر فرمائیں۔ یہ میکشؔ صاحب کی عظمت تھی کہ انھوں نے اس درخواست کو قبول فرمایا اور اس کے بعد گاہ بہ گاہ نثر و نظم میں ''تحریک'' کے لیے کچھ نہ کچھ عنایت فرماتے رہے۔

اس وقت میری کیا کیفیت ہوئی ہوگی، اب بیان کرنا مشکل ہے، جب مجھے میکشؔ صاحب کا یہ خط ملا کہ وہ حضرت نظام الدین اولیا کے عرس میں شرکت کے لیے دلّی آرہے ہیں اور انھیں خوشی ہوگی اگر اس موقع پر میں ان سے مل سکوں۔ میں مقررّہ تاریخ پر حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ میں حاضر ہوا۔ میکشؔ صاحب وہاں موجود تھے۔ اتنی شفقت اور محبت سے پیش آئے کہ مجھے محسوس ہوا میں نے برسوں کے بچھڑے ہوئے اپنے کسی خاندانی بزرگ کی خدمت میں حاضری دی ہے۔ مرحومہ ممتاز میرزا جو میکشؔ صاحب کی عقیدت مند تھیں اور غالباً اپنے کلام پر ان سے اصلاح بھی لیا کرتی تھیں، درگاہ شریف کے قریب ہی نظام الدین ویسٹ کی ایک کوٹھی میں رہتی تھیں۔ درگاہ شریف سے باہر آکر میکشؔ صاحب نے ان سے ملنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ ان کے بڑے صاحبزادے ساتھ تھے، میں بھی ساتھ ہولیا۔ ہم لوگ پیدل ہی کوٹھی تک گئے مگر ممتاز میرزا صاحبہ وہاں موجود نہ تھیں۔ اُن کے شوہر مرحوم اخلاق میرزا صاحب ملے۔ انھوں نے بتایا کہ دو تین دن سے ان کی طبیعت ناساز ہے اور ممتاز صاحبہ ڈاکٹر سے ان کا حال کہنے اور ان کے لیے دوا لینے گئی ہیں میرزا صاحب نے بہ اصرار کہا کہ آپ لوگ بیٹھیے تھوڑی دیر میں ممتاز آجائیں گی لیکن غالباً میرزا صاحب کی ناسازیِ طبیعت کا خیال کرتے ہوئے میکشؔ صاحب نے رکنا مناسب نہیں سمجھا۔ واپسی میں میں نے ان سے ''تحریک'' کے دفتر چلنے کی گزارش کی جو انھوں نے قبول فرمالی۔ ''تحریک'' کے مالک و مدیر گوپال متل بھی ان کے نیاز مندوں میں تھے۔ بہت خوش ہوئے۔ میکشؔ صاحب کو اسی دن شام چار بجے کی گاڑی سے واپس آگرے جانا تھا۔ میں اور متل صاحب انھیں چھوڑنے نئی دلی اسٹیشن تک گئے جہاں سے ان کی ٹرین کو روانہ ہونا تھا۔ میکشؔ صاحب کے ساتھ گزرے ہوئے ان چند گھنٹوں کی یاد آج بھی میری متاعِ عزیز ہے۔

کئی برس کے بعد دوسری بار اس عظیم شخصیت کی زیارت تب ہوئی جب میں اور ممتاز میرزا صاحبہ ایک مشاعرے میں شرکت کرنے آگرے گئے۔ مشاعرے کی اگلی صبح ہم میوہ کٹرے میں ان کے درِ دولت پر حاضر ہوئے۔ میکشؔ صاحب سخت علیل تھے، اٹھ بیٹھ نہیں سکتے تھے لیکن انھیں ہماری آمد کی اطلاع دی گئی تو انھوں نے اندر بلانے کو کہا۔ ہمیں اندر بلوایا گیا۔ میکشؔ صاحب مکان کے بالائی حصے میں بسترِ علالت پر دراز تھے، ہماری آہٹ پاکر اُٹھنے کی کوشش کی، یہ بزرگانہ اخلاق اور خوردنوازی کی انتہا تھی لیکن ممتاز میرزا صاحبہ نے آگے بڑھ کر روک دیا۔ میکشؔ صاحب نے زیرِ لب کچھ کہا جو ہم سن نہ سکے۔ تھوڑی دیر ہم اُداس دل کے ساتھ بیٹھے پھر چلے آئے۔ کچھ دن بعد وہ خبر بد ملی جو کسی وقت بھی متوقع تھی لیکن جی چاہتا تھا کہ کچھ اور موخر ہوجائے۔

علم و آگہی کا ایک آفتاب غروب ہو گیا تھا، ہر طرف اندھیرا پھیلتا محسوس ہوا۔

کسی کا قول ہے کہ شاعری، شاعر کی شخصیت کا اظہار بھی ہو سکتی ہے اور اس کا پردہ بھی۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں میکشؔ صاحب کی شاعری ان کی شخصیت کا آئینہ ہے۔ میکشؔ صاحب کی شخصیت کے کئی پہلو تھے لیکن ان کی شاعری میں جس پہلو کا بہ طور خاص اظہار ہوا ہے، وہ حسن کے انسانی مظاہر سے ان کا غیر معمولی شغف اور ان مظاہر کی گونا گوں جلوہ آرائیوں سے ان کا گہرا تعلقِ خاطر ہے۔ ان کے اسی وصف نے ان کی غزل کو تغزل کی وہ کیفیت عطا کی ہے، جو خود ان کے زمانے میں بھی کمیاب تھی اور اب تو عصری حالات کے دباؤ کے زیر اثر اور بھی سکڑتی سمٹتی جا رہی ہے۔ اس کیفیت کی باز آفرینی کے عمل میں میکشؔ صاحب کی غزل ایک اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ زندگی کے بے کیف اور بے رس ہو کر رہ جانے کے ممکنہ خطرے سے نبرد آزما ہونے کے لیے ان کیفیات کی باز آفرینی ضروری ہے جن سے میکشؔ صاحب کی شاعری کا خمیر اٹھا ہے۔ میکشؔ صاحب کی علمی تصنیفات کی غیر معمولی پذیرائی ہوئی ہے لیکن ضروری ہے کہ ان کے شعری کارنامے کو بھی نمایاں سے نمایاں تر کیا جائے اور عصری تناظر میں اس کی معنویت کو سمجھا جائے۔

میکشؔ صاحب ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن انھوں نے جو علمی ادبی اور شعری ذخیرہ اپنے پیچھے چھوڑا ہے وہ ہمیں ہمیشہ ان کی موجودگی کا احساس کراتا رہے گا۔

آگرہ اور آگرے والوں سے متعلق ان مضامین کی اشاعت کا خاکہ بقول محترمہ لطیف فاطمہ نفیسہ شاہ (بنتِ میکشؔ) حضرت میکشؔ اکبر آبادی مرحوم اپنی زندگی ہی میں بنا چکے تھے لیکن افسوس کہ موصوف کی زندگی میں یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ نفیسہ شاہ نے کمال سعادت مندی سے اپنے والدِ محترم کے سرمایۂ ادب کو دستبردِ زمانہ سے بچا کر اپنے پاس محفوظ رکھا۔ ان مضامین کو میکشؔ صاحب کے صاحبزادے سیّد حیدر علی شاہ رند اکبر آبادی نے سلیقے سے مرتّب کیا ہے اور اس کے لیے یہ دونوں منہیت و تبریک کے مستحق ہیں۔

کتاب کے آخر میں "غبارِ کارواں" کے عنوان سے میکشؔ صاحب کی تحریر کردہ خود نوشت بھی شامل کی گئی ہے جو نہ صرف بیحد دلچسپ اور جذبات سے مملو ہے بلکہ کئی تاریخی نکات بھی

اجاگر کرتی ہے۔ موصوف نے یہ خودنوشت الگ الگ وقت میں الگ الگ رسائل کی فرمائش پر لکھی تھی جو اُن رسائل کے حوالوں کے ساتھ اب یکجا کردی گئی ہے۔ یہ کتاب میکش صاحب کے قدر شناسوں کے لیے خصوصیت سے لیکن دیگر دلدادگانِ ادب کے لیے بھی ایک قیمتی تحفہ ہے اور امید ہے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔

مخمور سعیدی
دہلی

سیّد محمد علی شاہ میکش اکبر آبادی

محترم رشید احمد صدیقی مرحوم کے مختصر ترین اور انتہائی جامع فقرے میں ان کے محبِ صادق یعنی حضرتِ میکش اکبر آبادی کے لیے اتنا اضافہ جائز سمجھتا ہوں کہ اگر غزل اردو شاعری کی آبرو ہے تو موجودہ دور میں میکش صاحب متصوّفانہ مسلک، اقتدار اور روایات نیز تغزل کے اکبر آبادی رنگ و آہنگ کی آبرو ہیں۔ سیّد محمد علی شاہ میکش آگرے کے ایک معزز، مقتدر اور باا‌ثر صوفی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کے والد سیّد اصغر علی شاہ ابن سیّد مولوی امجد علی شاہ صاحبؒ اپنے عہد کے ایک برگزیدہ صوفی کی حیثیت سے مشہور تھے۔ خاندانِ میکش کے پس منظر کا تفصیلی جائزہ ان پر تحقیقی مقالہ لکھنے والے کے لیے مفید ہو سکتا ہے اس لیے میں اجمال پر تفصیل کو ترجیح دوں گا۔

مولوی سیّد مظفر علی شاہؒ کی جواہرِ غیبی۔ تصوّف کے اسرار و مقامات، نیز اصطلاحات پر راہِ رواں جادۂ طریقت کے لیے ایک مستند تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے۔ جواہرِ غیبی فارسی میں ہے اور مطبع نول کشور لکھنؤ کی مطبوعہ ہے۔ لیکن ابھی تک اس کا کسی نے اردو میں ترجمہ نہیں کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عوام کے علاوہ خواص کا بھی ایک بہت بڑا طبقہ اس کی افادیت سے آگاہ نہیں۔ مولوی سیّد امجد علی شاہ صاحبؒ اس خاندان کے گلِ سر سبد کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی شہرت ایک عالم باعمل ایک متشرّع و مرتاض صوفی اور ایک منفرد شاعر کی حیثیت سے ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی تھی جس سے وہ قطعی بے نیاز تھے۔ پھول یہ نہیں جانتا کہ نسیمِ سحر نے اس کی خوشبوئے لطیف کہاں تک پھیلا دی ہے۔ آپ نبیرۂ غوث الاعظم حضرت عبداللہ شاہ صاحب بغدادیؒ کے خلیفہ

تھے۔ جب نبیرۂ غوث الاعظم بعہد عالم شاہ ہندوستان تشریف لائے تو بادشاہِ وقت نے آپ کی قیام گاہ پر پہنچ کر شرفِ قدم بوسی حاصل کیا اور دہلی میں مستقل قیام فرمانے کے لیے استدعا کی مگر آپ نے رامپور کو اپنی برکتوں کا مرکز بنایا۔ ہندوستان کے بڑے بڑے صوفی عالم اور درویش آپ کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوئے اور اپنے اپنے مقسوم کے مطابق روحانی فیوض حاصل کیے۔ حضرت سیّدنا بغدادیؒ نے اپنے جدِّ امجد کے اشارے پر حضرت نیاز بے نیازؒ کو خلافت عطا فرمائی۔ بعدہٗ حضرت بغدادیؒ بہ نفسِ نفیس آگرہ تشریف لائے اور حضرت مولوی امجد علی شاہ صاحب کو خلافت عطا فرمائی۔ درحقیقت فقر و درویشی کی دنیا کا یہ اتنا بڑا اعجاز ہے کہ جس پر خاندانِ نیاز یہ، خاندانِ حضرت میکش نیز راقم الحروف کا خاندان حکمائے گڑھیا حکیم صاحب جس میں خلافت حضرتِ مولوی سیّد امجد علی شاہ کے توسّط سے آئی۔ اس نعمتِ عظمٰی پر جتنا شکر کرے کم ہے۔ حضرت امجد علی شاہ صاحب المتخلص بہ اصغر صاحب دیوان شاعر تھے۔ دیوانِ مطبوعہ آپ کے فارسی اور اردو کلام پر مشتمل ہے۔ چونکہ جو قال تھا وہی حال تھا۔ اس لیے آپ کا کلامِ بلاغت نظام عارفانہ اور توحیدی اسرار نیز سلوک کے انتہائی لطیف و بلیغ نکات سے مملو ہے۔ لیکن اس کے باوصف تغزل کی جملہ خصوصیات بھی آپ کے کلام میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ "گلشن بے خار" میں نواب مصطفٰے خاں شیفتہ۔ مولوی سیّد امجد علی شاہ جعفری القادری کے متعلق فرماتے ہیں کہ از خیالاتِ رنگین اوست:

ہوا ہوں بسکہ خفا اب تو اپنے جینے سے
لگا ہی لوں گا، میں تیغ زن کو سینے سے

حضرت امجد علی صاحب اصغر کا انتقال ۱۲۳۰ھ مطابق ۱۸۱۴ء میں ہوا۔

میکش صاحب کے مورثِ اعلیٰ سیّد ابراہیم مدنی عہدِ جہانگیر کے دورِ آخر میں مدینۂ منوّرہ سے ہندوستان تشریف لائے اور سکونت کے لیے آگرہ پسند کیا۔ بحکمِ خدا جب آپ کا فیض جاری ہوا تو لوگ جوق در جوق درِ اقدس پر حاضر ہو کر فیض یاب ہونے لگے۔ عہدِ جہانگیر کے دو مشہور امراء خان جہاں لودی اور خواجہ معین خاں سمرقندی بھی آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے اور ایک حویلی اور اس سے ملحق ایک مسجد آپ کے لیے تعمیر کرائی۔ مرہٹوں اور جاٹوں کے زمانے میں یہ حویلی معہ ایک ہزار قلمی کتابوں کے جل کر خاک ہو گئی۔ عہدِ شاہ جہانی کے دورِ آخر میں آگرہ کے امرا، رؤسا اور دیگر باکمال لوگوں نے آگرہ چھوڑ دلّی جا بسائی۔ قربِ بادشاہ حاصل کرنے کی خواہش اور دارالسلطنت میں رہنے کی افادیت امرا اور اہلِ حرفہ کو کشاں کشاں لیے پھرتی تھی۔ اس عبوری دور میں بڑے بڑوں کے پیر اکھڑ گئے۔ مگر اس خاندان کے بزرگوں کے

پائے استقلال میں جنبش بھی نہ آئی جو متوکل باللہ ہوتے ہیں حقیقت میں وہی عبداللہ کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں۔

مذکورہ بالا حویلی کے جل جانے کے بعد حضرت سیّد امجد علی شاہ اصغر نے تاج گنج میں سکونت اختیار کی۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد حویلی خواجہ، جو محلہ نائی کی منڈی کے روایتی باون محلوں میں سے ایک ہے، میں مکان تعمیر کرایا اور باقی زندگی اسی میں گزار دی۔ سیّد منور علی شاہ صاحب (متوفی ۱۲۳۵ھ) نے اپنے والد کے سامنے ہی میوہ کٹرے میں مکانِ تعمیر کرالیا تھا اور یہیں حضرتِ میکش ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے۔

ابھی میکشؔ صاحب طفلِ شیر خوار ہی تھے کہ ان کے والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ میکشؔ صاحب فرماتے ہیں کہ جب میں ڈیڑھ سال کا تھا تو میرے والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اہل اللہ کے استغراق کو دنیا والے سوائے بے ہوشی کے اور سمجھ بھی کیا سکیں گے۔ انتقال چونکہ اچانک ہوا تھا اس لیے جائداد منقولہ اور غیر منقولہ کی کماحقہ تفصیل بھی والدہ صاحبہ کو معلوم نہ ہو سکی۔ متلاطم سمندر میں مچھلیوں کا شکار کھیلنے والے پیشہ ور کارندے ہر عہد میں ہوئے ہیں۔ چنانچہ والدۂ میکش کی مشرقی اقدار پرستی اور بچوں کی کم سنی کا پیشہ ور کارندوں نے غلط فائدہ اٹھایا۔ میکشؔ صاحب ''نقوش'' کے آپ بیتی نمبر میں رقم طراز ہیں کہ ہمارے ایک کارندے کے پاس دو گھوڑے اور چار بھینسیں تھیں جب میکشؔ صاحب نے ہوش سنبھالا تو انھیں نہ ''متاعِ بردہ'' کا افسوس ہوا اور نہ ''متاعِ نابردہ'' کی خوشی۔ توکّل ان کی گھٹی میں شامل تھا:

من ایں دستے کہ افشاندم زکونین
بدامانِ تمنائے تو باشد

میکشؔ صاحب کے والد ماجد کے عقیدت مند مریدوں نے عالمِ طفلی سے ہی ان کو اپنے پیر و مرشد سیّد اصغر علی شاہ صاحب کا قائم مقام سمجھا۔ درحقیقت میکشؔ صاحب نے گہوارے سے خاندانی گدّی تک سفر ارادت مند مریدوں کے دوشِ عقیدت پر کیا۔ ان کا عالم طفلی مہد سے زیادہ خاندانی گدّی پر گزرا۔ مگر وہ کبھی گدّی سے کھیلے نہیں۔ کم سنی کے باوجود گدّی پر ان کے مہذّب اندازِ نشست نے ان کو محترم اور لوگوں کو ان کا عقیدت مند بنا دیا۔ لوگوں نے ان کے اس غیر معمولی رکھ رکھاؤ کو گدّی کی کرامت اور میکشؔ صاحب کو اس مقام کا نہ صرف موروثی حق دار بلکہ صحیح معنوں میں اہل جانا۔ اب لوگ ننھے منے ہاتھوں سے مصافحہ کر کے باطنی لذّت محسوس کرنے لگے۔ میکشؔ صاحب نے بچپن ہی سے اپنے چاروں طرف کالی اور سفید شرعی ڈاڑھیاں ہی دیکھیں

نہ وہ کھُل کے کھیل سکے اور نہ کھُل کے بات کر سکے۔ ہم عمروں کے جھرمٹ میں بیٹھنے کے دن، ارادت مندوں کے حصار میں گزرے۔ آگرے کی خانقاہوں کے سجّادہ نشین ان کو عرسوں میں کم عمری کے باوجود بصد اُصرار و احترام بلاتے اور ان کو جگہ دینے کے لیے اپنی خاندانی گدّیوں سے سرک جاتے تھے۔ معمر صوفیوں کے اس اندازِ احترام نے میکشؔ صاحب کے یہاں خود آگاہی پیدا کر دی تھی۔ لیکن یہ خود آگاہی نہ تو کسی نفسیاتی پیچیدگی کا ردِ عمل تھی اور نہ اس کا کوئی غلط ردِ عمل ان کی شخصیت پر ہوا۔ درحقیقت یہ خود آگاہی حالات کی قدرتی دین تھی۔ واقعہ تو یہ ہے کہ ان کی متوازن، بے ریا اور تصنّع بیزار شخصیت تمام نفسیاتی پیچیدگیوں سے پاک و صاف ہے۔ ان کی خودداری، عجلت پسندی اور کم سخنی کے تمام چشمے باطنی ہیں خارجی نہیں۔

میکشؔ صاحب اور ان کے برادرِ خورد کی تربیت کے علاوہ تعلیم کی ذمّہ داری بھی والدہ ہی پر تھی۔ وہ اپنے دونوں لڑکوں کو قصص الانبیاء پڑھ کر سنایا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ مختلف کتابوں سے اولیاء اللہ کے حالات نہایت دلنشیں پیرائے میں سناتیں نیز ان پر عمل کرنے کی تلقین کرتی تھیں۔ والدہ کے بنائے ہوئے کرداری سانچوں میں میکشؔ صاحب کا کردار ڈھلنے لگا۔ دونوں بھائیوں کی تعلیم کے لیے عربی و فارسی کے ایک جیّد عالم مقرر کر دیے گئے جو مستقل مکان کے مردانے حصّے میں رہتے تھے۔ والدہ صاحبہ میر اعظم علی (غالب کے مکتوب الیہ اور ہمسایہ) کی پوتی تھیں۔ میر اعظم علی صاحب آگرہ کالج میں فارسی کے پہلے پروفیسر تھے۔ ان کے صاحبزادے سیّد مشیر علی بھی آگرہ کالج میں معلم تھے۔ انگریز پرنسپل کو سلام نہ کرنے پر جواب طلب کیا گیا۔ انھوں نے معافی نامہ لکھنے کے بجائے استعفیٰ لکھ کر بھیج دیا اور تا زیست متوکّل باللہ رہے۔ حضرت میکشؔ صاحب کی والدہ ایک معیاری ماں تھیں۔ رفیق و شفیق ہونے کے علاوہ سخت گیر بھی تھیں۔ اولاد کی محبت ان کے دل میں بھی تھی اور دماغ میں بھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی سعی مشکور فرمائی۔ ان کے دونوں لڑکے ان کی زندگی ہی میں منفرد شخصیتیں بن گئے۔ میکشؔ صاحب آگرے کی متصوفانہ اور ادبی زندگی کی روحِ رواں بن گئے۔ سیّد احمد علی شاہ ریاست جے پور کی منتظمہ کے ایک اہم رکن بنے، ان کے صاحبزادے سیّد حسن علی شاہد مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ سیاسیات سے متعلّق ہیں ان کا شمار شعبے کے لائق اساتذہ میں ہوتا ہے۔

میکشؔ صاحب ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدرسہ عالیہ جامع مسجد آگرہ میں داخل ہوئے اور ۱۹۲۲ء میں تکمیلِ علومِ مروّجہ کے بعد اسی مدرسہ سے سند حاصل کی۔ جامع مسجد اور مدرسہ عالیہ کی عمر تقریباً ایک ہی ہے۔ یہ مدرسہ اپنی قدامت اور اپنے مایۂ ناز اساتذہ کے لیے نہ

صرف ہندوستان میں بلکہ بلادِ اسلامیہ میں مشہور تھا۔ ان کی مذہبی درسیات میں ژرف نگاہی نیز عربی وفارسی کے ادبِ عالیہ پر عبور کے مدّاح نہ صرف ان کے ہم جماعت بلکہ اساتذہ بھی تھے۔

فارغ التحصیل ہو کر میکشؔ صاحب خاندانی مسند پر، جس پر وہ بچپن ہی سے بیٹھتے چلے آئے تھے، اب وہ اسی مسند پر بہ انداز دیگر بیٹھے۔ میکشؔ صاحب کا احترام آگرے کے بڑے بڑے شیوخ اور اکابر سجادہ نشین ابتداء سے ہی کرتے تھے اور آج بھی آگرے کی کوئی ادبی محفل یا اہلِ طریقت کا کوئی اجتماع بغیر ان کی شمولیت کے مکمل تصور نہیں کیا جاتا۔ راقم الحروف کے والد قبلہ حکیم سیّد محمد علی قادری مرحوم (از حکمائے گڑھیا حکیم صاحب) فرماتے تھے کہ جب میکشؔ صاحب دیوان خانہ خانقاہ حکمائے گڑھیا حکیم صاحب سوئی کٹرہ آگرہ میں بسلسلۂ شرکتِ عرس آتے تھے تو قبلہ حکیم سیّد عرفان علی شاہ صاحب، جو اپنے عہد کے قطبِ وقت تھے، بشمول حاضرینِ محفل ان کی تعظیم کے لیے سروقد کھڑے ہو جاتے تھے حالانکہ میکشؔ صاحب ان سے بہ لحاظ عمر اور رشتہ چھوٹے تھے۔ اس احترام کا سبب وہ خلافت تھی کہ جو قبلہ عرفان علی شاہ صاحبؒ کے جدِّ امجد قبلہ حکیم سیّد نورالدین شاہ صاحبؒ کو میکشؔ صاحب کے جدِّ امجد قبلہ ومولوی سیّد امجد علی صاحب سے ملی تھی۔ قبلہ سیّد نورالدین شاہ صاحبؒ قبلہ سیّد امجد علی صاحب کے خلیفہ ہونے کے علاوہ داماد بھی تھے۔ یہ بات کم لوگ جانتے ہیں کہ سراج السالکین حضرت شاہ محی الدین احمد علوی چشتیؒ نے میکشؔ صاحب کو اپنے دستِ مبارک سے دستار ومسندِ خلافت عطا فرمائی۔ میکشؔ صاحب فرماتے ہیں: ''اگر مجھے سراج السالکین شاہ محی الدین احمد بریلویؒ کی مختصر صحبت اور غلامی کا شرف حاصل نہ ہوا ہوتا تو میں سمجھتا کہ جنیدؒ اور بایزیدؒ محض فرضی شخصیتیں تھیں۔ حضرت کی تعلیم سے کائنات کے متعلق میرا نقطۂ نظر بدل گیا اور یقین آ گیا، ز یک آتش چراغ کعبہ و بتخانہ می سوزند، حضرت سراج السالکین کی تربیت نے میکشؔ صاحب کی ترشی ہوئی شخصیت کے نقوش تیکھے کر دیے۔ اس طرح ان کے ارادت مندوں کا حلقہ وسیع ترین ہوتا چلا گیا۔ آج بھی عقیدت مند مریدوں کا ہجوم انھیں گھیرے رہتا ہے۔ تشنگان راہِ سلوک کے لیے وہ میکشؔ نہیں ساقی ہیں۔ تصوّف کی وہ اصطلاحیں جس پر لب کشائی کی ہمت نہیں ہوتی ان پر میکشؔ صاحب اس سادگی اور صراحت سے تبصرہ فرماتے ہیں کہ ان کی قوّت گویائی مدلّل اور فلسفیانہ اندازِ گفتگو اور ان کے عبور مصطلحاتِ صوفیہ پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ ان کی معرکۃ الآرا تصانیف نغمہ واسلام، کفر وشرک، نقدِ اقبال اور مسائلِ تصوّف کا مطالعہ میرے بیان کی تصدیق کے لیے کافی ہوگا۔

میکشؔ صاحب آگرے کی جامع کمالات شخصیت ہیں علم وحلم، انکساری اور تواضع، بے

ریائی و تصنّع، بیزاری، تہذیب و شائستگی، اخلاق و مروّت نیز جوہر شناسی و ہمّت افزائیِ فردگان میکشؔ صاحب کی شخصیت کے تابناک گوشے ہیں۔ وہ علم و ادب کا منارہ نُور ہیں۔ نہ صرف آگرے بلکہ دیگر اضلاع کے تشنگانِ علم آپ سے سیراب ہوتے رہتے ہیں۔ آپ اپنے مکان کے مردانہ حصّے میں پابندیِ وقت سے صبح و شام تشریف لاتے ہیں جہاں پہلے سے ہی لوگ منتظر ہوتے ہیں کافی عرصہ سے ہومیو پیتھک بطور شغل اختیار کر لی ہے نہ جانے کتنے بندگانِ خدا کو مفت دوا تقسیم کی جا چکی ہے بعض مایوس مریضوں کا ایسا معرکۃ الآرا علاج کیا ہے کہ بڑے بڑے ڈاکٹر انگشت بدنداں ہو گئے۔ میکشؔ صاحب اخفائے ہنر میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ غیبت اور خودستائی سے سخت نفرت ہے اگر کوئی صاحبِ نظر ان کے مجموعی اوصاف کی یا ان میں کسی ایک کی حقیقی تعریف کرے تو میکشؔ صاحب بڑی خوبصورتی سے بات کا رخ موسم یا محکمۂ موسمیات کی پیشین گوئی کی طرف موڑ دیتے ہیں لیکن ان کے اندر کا مشک اور زیادہ خوشبو دینے لگتا ہے۔ وہ اپنی محفل میں ادنیٰ و اعلیٰ کا امتیاز نہیں رکھتے۔ چنانچہ سب کی پذیرائی وہ یکساں کرتے ہیں:

به نازم به بزمِ محبت که آنجا
گدائے به شاہے مقابل نشنید

میکشؔ صاحب جمال ہی جمال ہیں۔ لوگ ان کا احترام بھی کرتے ہیں اور محبت بھی مگر ان سے ڈرتے نہیں۔ میکشؔ صاحب کے دونوں صاحبزادے اخلاق، تواضع، مروّت اور شائستگی کا بہترین نمونہ ہیں۔ بڑے صاحبزادے ڈاکٹر سیّد معظّم علی شاہ سینٹ جانسن کالج آگرہ کے شعبۂ نفسیات کے صدر اور ایک انتہائی مقبول اور ہردلعزیز استاذ ہیں۔ دوسرے صاحبزادے سیّد حیدر علی شاہ مرکزی حکومت کے ایک اہم شعبہ سے متعلّق ہیں۔ اور اپنی گوناگوں صفات کی بناء پر آگرے میں بے انتہا مقبول ہیں۔

میکشؔ صاحب کی چند عادتیں، جن سے عوام و خواص بدحظ ہیں، ان کا اظہار بھی اصول سوانح نگاری کے پیشِ نظر ضروری ہے۔ مشاعروں میں وہ اپنے وعدہ کا اعتبار بن کر آتے ہیں، مشاعروں کی صدارت سے پہلو تہی کرتے ہیں اگر بانیِ مشاعرہ کے اصرار یا اپنی مروّت سے مجبور ہو کر کسی مشاعرے کی صدارت قبول کر بھی لی تو تھوڑی ہی دیر بعد اعزازِ صدارت کسی دوسرے کو منتقل کر کے اور اپنی غزل سراپا انتخاب کے چند اشعار سنا کر تشریف لے جاتے ہیں۔ سامعین، شعرا نیز اُدبا آپ کو حسرت سے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ مگر کسی کو بوجہ لحاظ و ادب آپ کو روکنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ آخرِ شب ان کا مخصوص شاعرانہ ترنم سننے کی آرزو اب حسرت بن چکی ہے۔

وہ دعوتیں بھی بہت کم قبول کرتے ہیں۔ انتہائی اصرار سے مجبور ہو کر اگر شادیوں میں جاتے بھی ہیں تو بعد نکاح فوراً کھانا کھائے بغیر چلے آتے ہیں۔ وہ لڑکی والے کے یہاں کھانا نہیں کھاتے۔ کاش میکش صاحب کا یہ اصول ایک سماجی روایت بن جائے۔

میکش صاحب تلمیذ الرحمٰن ہیں۔ ہر فطری شاعر کی طرح ان کی شاعری کی ابتدا بچپن میں ہوئی۔ پہلی غزل نہ تو ان کے حافظہ میں محفوظ ہے اور نہ کسی مجموعۂ کلام میں شامل ہے۔ میکش صاحب فرماتے ہیں: ''میری شاعری کی ابتدا بچپن میں اور کھیل کود کی عمر سے ہوئی جب اچھی طرح پڑھنا لکھنا بھی نہیں آتا تھا لیکن میں گنگنا کر شعر موزوں کر لیتا تھا۔ پھر بڑے اہتمام سے ایک کاغذ سے دوسرے کاغذ پر بار بار نقل کرتا۔ اس عمر کا تعین مشکل ہے۔ رفتہ رفتہ میرے چھوٹے بھائی۔ پھوپھی زاد بھائی اور چچا زاد بھائی سب ہی شعر کہنے لگے اور پھر ایک انجمن سی بن گئی جس میں پندرہ روزہ مشاعرہ ہونے لگا۔۔۔ ہم سب اپنی جگہ اپنے کو استاد سمجھتے تھے لہٰذا کسی استاد کے شاگرد نہ ہوئے۔'' (نقوش لاہور۔ آپ بیتی نمبر)۔ کم عمری ہی میں میکش صاحب کی شاعری کا ذکر اساتذہ کی محفلوں میں ہونے لگا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ آگرے کی ادبی فضا مرزا خادم حسین رئیس اور سیّد تصوّف حسین واصف کے نغموں سے گونج رہی تھی۔ گو دونوں کا انتقال ہو چکا تھا۔ رئیس کے شاگرد خاص فلک اکبر آبادی کے تقریباً سو شاگرد تھے۔ آگرے کی ادبی محفلوں میں حضرت سیماب، حضرت شاہ دلگیر عالی، نثار (استاد بیدم وارثی) شیام، اخضر، بزم آفندی، نجم آفندی جیسے شعرا کا طوطی بول رہا تھا، نو عمر شعرا میں رعنا، صبا، منظر اور شاہد بے حد مقبول ہو رہے تھے، فانی بدایونی، قمر بدایونی، اور مانی جائسی کے آنے سے آگرے کی ادبی محفلوں کا رنگ اور نکھر گیا۔ آگرہ کی ادبی محفلوں میں گو ذرا تاخیر سے جگر، جذبی، تاباں، آلِ احمد سرور اور مجاز بھی شامل ہو گئے۔ ۱۹۱۲ء سے تقریباً ۱۹۲۰ء تک حضرت شاہ دلگیر کا نقاد عصری صحافت کو متاثر کر کے اپنا ایک منفرد مقام حاصل کر چکا تھا۔ نثر کے میدان میں حضرت ل۔ احمد اکبر آبادی نے اپنی انشائے لطیف کے جھنڈے گاڑ دیے تھے۔ عابد حسین فریدی، مولانا حامد حسن قادری (مصنف داستان تاریخ اردو) انتظام اللہ شہابی، مولوی ریاض الدین۔ مولانا طاہر فاروقی اور مخمور اکبر آبادی بھی اس عہد کی مایۂ ناز شخصیت تھیں۔

ایسے جیّد اساتذہ، مایۂ ناز ناقدین نیز طبّاع و ادبی تاریخ ساز شخصیتوں کی ایک پوری نسل نے میکش صاحب کے مخصوص رنگ تغزل کی کھل کر داد دی جو اُن حضرات کی وسیع النظری اور عدم چشمکِ معاصرانہ کا روشن ثبوت ہے۔ حضرت سیماب اکبر آبادی کا یہ قطعہ ایک طرف ان کی وسیع القلبی تو دوسری طرف میکش صاحب کی صلاحیتوں کا نا قابلِ تردید ثبوت ہے:

فطرت میں علم وفضل کی دنیا لیے ہوئے
سیرت میں جلوۂ یدِ بیضا لیے ہوئے
خرقہ بدوش محفلِ نازو نیاز میں
سجادہ وگلیم و مُصلّے لیے ہوئے
خود میکش اور خود ہی قدح نوش و مے فروش
جامِ وسبو وشیشہ وصہبا لیے ہوئے

میکشؔ صاحب میر، دردؔ، نظیرؔ، غالبؔ، حسرتؔ، اقبالؔ، جوشؔ، فانیؔ اور جگرؔ کو بہت پسند کرتے ہیں۔ مگر انھوں نے بہ نظر امعان مطالعہ صرف غالبؔ اور اقبالؔ کا ہی کیا ہے۔ حضرت امیر خسروؔ، عرفیؔ، نظیریؔ اور حافظؔ بھی آپ کے پسندیدہ شعرا ہیں۔ مسلک کے اعتبار سے میکشؔ صاحب وحدت الوجودی اور اہلِ بیت کے عاشق ہیں۔ وہ ابن عربیؔ اقبالؔ اور شنکر آچاریہ سے متاثر ہیں بہائی مذہب کی تصانیف خصوصاً ہفت وادی کی ادبی حیثیت سے متاثر ہیں۔

میرا خیال تھا کہ میکشؔ صاحب کی شاعری کے پس منظر کا نفسیاتی تجزیہ کر کے موصوف کے رنگِ تغزّل کے ان عناصر کی نشاندہی کروں جو اُن کی شاعرانہ شخصیت کا مایہ الامتیاز ہیں اور ضمناً ان کے نظری اسلوب پر بھی روشنی ڈالوں مگر محبی تاجدار صدیقی نے سوانح اور تنقید کے درمیان لکشمن ریکھا جیسی حدِ فاصل قائم کردی ہے اس لیے اپنے خیال کو فی الحال اپنی عافیت کے پیشِ نظر ملتوی کرنا ہی مناسب ہے۔

آپ کے مضامین کا تنوّع محققانہ نیز فلسفیانہ اندازِ نگارش، ان کی تہہ دار شخصیت کی غمازی کرتا ہے۔ خدا کرے کہ اس فخر ارض تاج کی ادبی محفل کبھی ختم نہ ہو۔ ان کا طرزِ تپاک بے پایاں خلوص، باتوں باتوں میں عارفانہ نکتے دلنشیں کرانے کا سلیقہ نیز ان کی پرکشش شخصیت کی لطیف آنچ گردوپیش کے خس خاشاک کو خاکستر کر کے حاضرینِ محفل کو ان کی ذات میں اس طرح گم کردیتی ہے کہ پلکوں کا جھپکنا ذوقِ نظارہ پر گراں گزرتا ہے۔ مصرعہ

نظارہ ز جنبیدن مژگاں گلہ دارد

آفاق احمد عرفانی

(بشکریہ ماہنامہ ''شاعر'' بمبئی جلد ۵۰ شمارہ ۹ ۱۹۷۹ء)

آگرہ اور آگرے والے

عام معاشرت

آگرے کے ہندو مسلمانوں میں معاشرت اور رہن سہن کا فرق تھا تو سہی مگر کم تھا ہاں امیر غریب کا اور طبقاتی فرق زیادہ تھا۔ مذہبی رسم ورواج اپنے اپنے علیحدہ تھے مگر عمومی تہواروں، شادی بیاہ، خوشی اور غمی میں ایک دوسرے کے شریک رہتے تھے۔ رئیس اور شریف وہ لوگ سمجھے جاتے تھے جو نہ تجارت کرتے ہوں نہ اور کوئی کام یا پیشہ۔ یہ لوگ صاحبِ جائداد اور زمیندار جاگیردار تھے۔ ہندوؤں میں بھی اور مسلمانوں میں بھی۔ عوام ان کی عزت بھی کرتے تھے اور ان کی تقلید بھی۔ نشست، برخاست، لباس، بول چال، رسم ورواج سب میں ان کی تقلید کی جاتی تھی۔ یہ خرابی ہندوؤں میں کم اور مسلمانوں میں زیادہ تھی، متوسط بلکہ غریب طبقہ بھی اس مرض میں مبتلا تھا، اندر کچھ ہی حال کیوں نہ ہو مگر باہر کی ٹیپ ٹاپ اور نام ناک کا خیال زیادہ رکھا جاتا تھا۔ شادی بیاہ، پھول چالیسواں، بات بات پر کنبے برادری کا کھانا اور دوسری رسموں اور روایتوں کا لحاظ اور رکھ رکھاؤ ضروری تھا۔ ان خرچوں کے لیے سو میں ننانوے آدمی قرض لیتے تھے خاص کر مسلمانوں میں پس انداز کرنے کا رواج نہ تھا۔ بقول نظیر اکبر آبادی۔

گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

قرض اور سودی لین دین کا بیوپار ہندوؤں کے ایک خاص طبقے کے ہاتھ میں تھا۔ جب بھی کوئی کارج آن پڑتا جائداد والے اپنی جائداد اور غریب آدمی اپنے زیور رہن رکھتے اور جب سود در سود کے انبار رلگ جاتے تو جائدادیں اونے پونے اور زیور دھڑی کر کے بک جاتے

ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا یہ کبھی سننے میں نہیں آیا کہ کسی نے اپنی جائداد واگزاشت کرالی ہو، اور پھر وہی لوگ جنھوں نے مونچھ نیچی نہ ہونے کے خیال سے قرض لیا تھا عزت آبرو سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔

کاروبار اور پیشے:۔

خوانچے والے دوکاندار، حلوائی، بزاز، پنساری، غلے کے بیوپاری سب ہندو تھے۔ کاروبار اور تجارت بھی سب ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا اعلیٰ طبقہ تجارت اور کاروبار کرنے والوں کو اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ بنیے بقال اور کنجڑے قصائی توہین کے لیے بولے جاتے تھے۔ درزی، نان بائی، علاقہ بند قصائی سبزی فروش مسلمان تھے ورنہ عام طور سے صناع اور اہلِ حرفہ مسلمان اور تاجر پیشہ ہندو تھے۔ پرانے زمانے میں آگرے کی چار چیزیں مشہور تھیں۔ دری، دریائی، دال موٹھ اور درگا بائی۔ اس کے بعد قالین اور جوتوں نے شہرت حاصل کر لی۔ کہتے ہیں جب مغلیہ سلطنت پر زوال آیا تو ہزاروں مسلمان سپاہی تتر بتر ہو گئے۔ جن بازاروں میں وہ تلواریں باندھے سینے تانے پھرتے تھے وہاں خوانچہ لگا کر کیسے بیٹھتے چار و ناچار انھوں نے ایسے پیشے اختیار کر لیے کہ دن کو گھروں میں بیٹھ کر کچھ کام کر لیتے اور رات میں چپ چپاتے خود یا کسی کی معرفت اپنا بنایا ہوا سامان دوکانداروں کے ہاتھ بیچ آتے۔ اس طرح آبرو بھی بنی رہتی تھی اور بال بچوں کا پیٹ بھی پل جاتا تھا۔ یہ وہی خاندان ہیں جن میں اب تک زردوزی، کام دانی اور گوٹے وغیرہ کا کام ہوتا چلا آتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ معاشرت بدل رہی ہے۔ مجبوریوں نے بھی بہت کچھ ان لوگوں کو بدلا ہے کباب، دہی بڑے، لونگ چڑے، فالودہ وغیرہ کا خونچہ بھی مسلمان ہی لگاتے تھے۔ یہ پشاوری فالودہ جو ۱۹۴۷ء کے بعد سے رائج ہوا ہے آگرے میں نہیں تھا۔ بھوپال میں ضرور اس کا رواج تھا اور بھی کسی شہر میں ہوگا یہاں تو صرف گرمی میں فالودہ بکتا تھا۔ تانبے کی قلعی دار سینی میں لال ٹول سے ڈھکی ہوئی ایک پانی سے بھری ہوئی صراحی، تانبے کے ہلکے نقشین کٹورے، ایک برتن میں نشاستے کی سوئیاں اور ایک میں تخم ریحان بھیگے ہوئے اور بڑے بڑے بتاشے۔ ایک گلاب پاش کیوڑے سے بھرا ہوا۔ سینی میں یہ کل سامان سلیقے سے لگائے ہوئے خوانچے والے دوپہر کو محلّے محلّے پھرتے تھے ایک پیسے میں ایک کٹورا آتا تھا۔ کسی کسی کے پاس اولے بھی ہوتے تھے، جو بتاشے کے بجائے استعمال ہوتے تھے۔ یہ باریک دانے دار خالص شکر کے لڈو کی شکل کے ہوتے تھے جو آج کل کی چینی سے زیادہ سفید اور زیادہ شیریں ہوتے تھے۔ یہ اعلیٰ ترین شکر کی قسم سمجھی جاتی تھی۔ چائے کا رواج بالکل نہ تھا جاڑوں میں بھی کوئی چائے نہیں پیتا تھا تقریباً پورے شہر میں ایک دوکان سیو کے بازار میں امیر بخش کی تھی اسے دوکان کہہ لیجیے، ورنہ اس کی کل کائنات

ایک تختہ تھا جو اپنے زینے کے پاکھے میں کیلیں ٹھونک انھوں نے لگا دیا تھا اور اس پر ایک لال کپڑا بچھا کر آرائش کر لی تھی۔ جاڑوں میں چائے اور گرمی میں لیمن سوڈا اور شربت بیچتے تھے۔ گرمی آئی تو انھوں نے چار پانچ شیشے کے موٹے موٹے گلاسوں میں لال شکر گھول کر ان کی لائن تختے پر لگا دی۔ جب کوئی گاہک آیا تو ایک ذرا سی ڈلی برف کی ڈال کر اس کی تواضع کر دی ایک آدھ فقرہ ہنسنے ہنسانے کا کہہ دیا، یہ ان کی عادت تھی۔ سارے بازار بلکہ چلنے والوں پر بھی وہ فقرے کسا کرتے۔ خود ہنستے اور دوسروں کو ہنساتے اور جب جاڑے آتے تو تین چار چائے کی پیالیاں اسی تختے پر رکھ دی جاتیں، زینے میں ساوار گرم ہو جاتا بازار میں تین چار سرکنڈے کے مونڈھے ڈال دیتے اور روزانہ چار پانچ آدمی صبح کے وقت ان کے یہاں چائے پینے آجاتے۔ چار پانچ آدمی وہ تھے جو افیون کا شوق کرتے تھے اور روزانہ آکر یہاں چائے پیتے تھے۔ چائے کی پیالی لیمن، سوڈے کی بوتل، اور شربت کا گلاس سب کی قیمت ایک پیسہ ہوتی تھی۔ امیر بخش اس وقت تک بھی زندہ تھے جب ہر چار قدم پر ایک چائے کی دوکان، ریسٹوران اور ہوٹل ہو گئے تھے وہ کہا کرتے تھے میرے ہوٹل سے پرانا کوئی ہوٹل نہیں ہے۔

کوئی کسی سے ملنے آتا تب بھی عموماً پان اور حقّے سے تواضع کی جاتی تھی۔ عام طور سے گھروں میں صبح کا ناشتہ جلیبی، کچوری اور ملائی سے کیا جاتا تھا۔ غریب غربارات کی باسی کھوسی سے اپنا اور اپنے بچّوں کا پیٹ بھر لیتے تھے۔ دو چار صوفی اور رئیس ایسے تھے جہاں کشمیری طرز کی سبز چائے رات کو شدید سردی میں بنائی جاتی تھی جو برابر کے دودھ میں گھنٹوں جوش دی جاتی۔ پھر اس میں بادیان، خطائی، زعفران، جاوتری جائفل بادام اور ملائی وغیرہ ڈالی جاتی، ایک دو پیالی ساری رات کے لیے کافی تھی۔

تفریحات اور کھیل:

یہاں کبوتر بازی، پتنگ بازی، کشتی اور پیرا کی کا شوق عام تھا اب بھی یہ شوق کسی حد تک باقی ہیں۔ مرغ بازی اور مینڈھے لڑانے کا شوق ختم ہو گیا۔ باہر کے کھیلوں میں کرکٹ فٹ بال، ہاکی معززین اور تعلیم یافتہ آدمیوں کے کھیل تھے اور گلی ڈنڈا کبڈّی وغیرہ عوام کے کھیل سمجھے جاتے تھے۔ شرفا ان کھیلوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ شرفا کے یہاں عموماً شطرنج، چوسر، پچیسی اور گول گنجفے کا رواج تھا۔ ایک بوڑھے آدمی تھے سفید لمبی داڑھی، دراز قد، بغل میں چھتری اور ہاتھ میں ڈنڈا۔ جدھر نکل جاتے لوگ ان کو کبڈّی کی لالٹین کہہ کر آواز دیتے اور وہ مادر پدر کرنا شروع کر دیتے۔ کبھی کبھی ڈنڈے سے بھی تواضع کر دیتے اور جب کوئی نہ چھیڑتا تو گالی دے کر کہتے آج

سب مر گئے۔ ان کا واقعہ یہ ہے کہ ایک جگہ بدی ہوئی کبڈّی ہو رہی تھی، پالی ختم ہونے اور ہار جیت سے پہلے شام ہوگئی، سب نے کہا اب اندھیرا ہوگیا کھیل موقوف کردو۔ یہ حضرت بھی تماشائیوں میں کھڑے تھے کہنے لگے لالٹین لے آؤ اس روز سے ان کو سب کبڈی کی لالٹین کہنے لگے۔

ایک زمانے میں ایسے کتنے ہی آدمی تھے جن کو لوگ چھیڑ کر گالیاں کھاتے اور خوش ہولیتے۔ دوستوں اور رئیسوں کی محفل بھی ایسے لوگوں سے خالی نہ ہوتی تھی۔ اسی طرح ہر بازار اور ہر محلّے میں دو ایک ایسے ضرور ہوتے جو سب پر فقرے کستے، سب کو چھیڑتے، جان پہچان اور سلام دعا ہو یا نہ ہو۔ کوئی بھی ان کا برا نہیں مانتا تھا اور اگر کوئی چڑ گیا تو اس کا مستقل مذاق بن جاتا تھا۔ ایسے ہی ہر محلے اور ہر برادری میں دو چار آدمی ایسے ہوا کرتے تھے جو بچوں کو ان کی شرارتوں پر اور جوانوں کو ان کی بے راہ روی پر ٹوکتے رہتے۔ سب ان کا لحاظ کرتے اور ڈرتے تھے۔ ماں باپ اولاد کو ان کا نام لے کر ڈراتے تھے اور جوان انھیں دیکھ کر کترا جاتے۔ اب اس بات پر لڑائی اور فوج داری ہو جاتی ہے کہ تم نے ہمارے بچّوں کو کیوں تنبیہ کی۔

لباس:

سنا بھی اور پرانی تصویروں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عام شرفا کا لباس دلی آگرے میں عمامہ، قبہ نما یا چوگوشیہ ٹوپی، گول پردے کا انگرکھا عبا وغیرہ تھا۔ ہندو مسلمان سب یہی لباس پہنتے تھے۔ میں نے اپنے بچپن میں صرف چار آدمی ایسے دیکھے جو قبہ نما ٹوپی پہنتے تھے اور اسے چوگوشیہ ٹوپی کہا جاتا تھا۔ پنڈت جگن ناتھ صاحب جو کشمیری پنڈت اور آگرے کے روٴسا میں تھے، سیّد سلامت علی صاحب میرے نانا، منشی ہیت لال صاحب وکیل اور منشی حبیب خاں کمبوہ ٹولے والے، ورنہ عموماً عوام کا لباس کرتا اور دوپلّی ٹوپی، دھوتی تہبند اور پاجامہ تھا۔ ہندوؤں کا نچلا طبقہ دھوتی باندھتا تھا، اور مسلمانوں کا نچلا طبقہ دھوتی بھی اور تہبند بھی، شرفا پاجامہ ہی پہنتے تھے۔ دھوتی اور تہبند معیوب سمجھے جاتے تھے۔ پاجامے پرانے لوگ ڈھیلے ایک برے اور وضعدار اور یب پہنتے تھے جسے چوڑی دار کہتے تھے جو اب قومی لباس میں شامل ہوگیا ہے۔ شیروانی بہت کم نظر آتی تھی۔ انگرکھا اور اچکن شرفا کا لباس تھا۔ عمامہ اور چغہ روٴسا نے بھی چھوڑ دیا تھا، صرف بعض مشائخ اور صوفیوں کا لباس رہ گیا تھا وہ بھی خاص تقریبوں میں۔ ہندوؤں کے انگرکھے میں سیدھی طرف چاک ہوتا تھا اور مسلمانوں کے انگرکھے میں الٹی طرف اور کوئی فرق نہ تھا۔ دوپلّی ٹوپی میں بھی جزوی فرق تھا ہندوؤں کی ٹوپی کی باڑھ بہت نیچی اور آگے پیچھے بھی نوک نکلی ہوتی، مسلمانوں کی ٹوپی کی باڑھ قدرے اونچی اور سامنے نوک نہیں ہوتی تھی۔ جو مسلمان لانگ دار دھوتی باندھتے تھے وہ ٹوپی بھی

نیچی باڑھ کی اور نوک دار پہنتے تھے۔ اکثر فیشن ایبل لوگ اٹلی کی فلیٹ کیپ پہنتے تھے۔ ٹوپیاں غالباً اٹلی سے آتی تھیں اور ہندو مسلمان نوجوانوں میں بہت مقبول تھیں۔ پھر مسلمانوں میں ترکی ٹوپی کا رواج بڑھ گیا اور اس کے بعد اور بہت سی مختلف قسم کی ٹوپیاں اور لباس چل گئے اور اب تو ٹوپی کا رواج ہی تقریباً ختم ہو گیا ہے۔

پرانی وضع کی عورتیں محرم اور اس پر کرتی پہنتی تھیں۔ محرم کو چھوٹا کپڑا کہتی تھیں مگر دوپٹہ اس سلیقے سے اوڑھتی تھیں کہ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ ان کا لباس کیا ہے۔ ہندو عورتیں لہنگا اور مسلمان عورتیں ڈھیلا کلی دار فرشی پاجامہ پہنتی تھیں جو کم سے کم سات گز کا ہوتا تھا۔ نئی وضع کی عورتوں کا لباس تنگ مہری کا اور ریب پاجامہ اور کرتا دوپٹہ تھا۔ یہی لباس عام غریب عورتوں کا تھا۔ شریف عورتیں سفید اور ریب پاجامہ پہننا معیوب سمجھتی تھیں۔ یہ طوائفوں کا لباس تھا، شادی شدہ عورتیں رنگین دوپٹہ اوڑھنا ضروری جانتی تھیں۔ سفید دوپٹہ بیوگی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

ہندو مسلمان شرفا میں راجپوتوں کی طرح پردے کا رواج شدت سے تھا۔ عورتیں بغیر سواری کے کہیں نہیں آتی جاتی تھیں۔ مسلمان عورتیں قرب و جوار کے کنبے رشتے میں عموماً ڈولی میں آتی جاتی تھیں جسے دو کہار اٹھاتے تھے اور کوئی ماما اصیل پیدل ساتھ ہوتی تھی۔ دور جانے کے لیے بیل گاڑیاں تھیں۔ اس کا لحاظ رکھا جاتا تھا کہ ڈولی کا پردہ وضع دار اور اچھے کپڑے کا نہ ہو کہ لوگوں کی نگاہوں میں آئے۔ عورتیں جہاں کہیں جاتیں میزبان بغیر کھانا کھلائے واپس نہ آنے دیتا تھا ایک طرف کی ڈولی یا سواری کا کرایہ میزبان دینا ضروری سمجھتا تھا۔ کرایہ تھا بھی دو پیسے چار پیسے سے لے کر دو آنے تک۔ دونوں طرف کا کرایہ خود مہمان کا دینا بہت وہم کی بات اور بدشگونی سمجھی جاتی تھی کیوں کہ صرف موت میں ہی آنے والے اپنا کرایہ خود دیتے ہیں۔ پرانے خاندانوں میں یہ رواج اب بھی ہے۔

لڑکیاں جہاں چار پانچ سال کی ہوئیں کہ ان کے سر پر بال رکھے گئے اور پردے بیٹھ گئیں۔ کنواری لڑکیوں کے لیے پان کھانا، عطر لگانا، چنا ہوا دوپٹہ اوڑھنا، ناک میں نتھنی کے سوا لونگ یا نتھ پہننا سخت معیوب تھا۔

طوائفیں:

جرائم اور جنسی آوارگی سے کسی زمانے کو بھی خالی نہیں کہا جا سکتا کہ اس زمانے میں اس قسم کی آوارگی کے حلقے محدود تھے اور سماجی بندشیں بہت سخت تھیں۔ جو عورتیں باہر پھرتی تھیں ان کی طرف بھی کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اوّل تو یہ عورتیں وہی ہوتی تھیں جن کی عمریں ڈھل چکی ہوتی تھیں اور ان کا کوئی والی وارث نہ ہوتا تھا۔ شوہر دار غریب عورتیں بھی نوکری چاکری نہیں

کرتی تھیں، جو عورتیں بے پردہ تھیں وہ بھی احتیاط کے ساتھ باہر نکلتی تھیں، انھوں نے بے پردگی کو اپنی نمائش کے لیے کبھی استعمال نہیں کیا۔ ضرورت سے خود بازار میں آئیں مگر اپنے حسن و جوانی کو بازار سے علیحدہ رکھا نہ مرد ہی ایسے تھے کہ ہر چلتی پھرتی عورت پر نظر ڈالتے۔

ایک معمّر آدمی نے اپنے ایک ہم صحبت اور دوست کا ذکر کیا کہ وہ جوانی میں بہت ہی آزاد منش اور غلط کار تھے۔ ایک روز ایک بہت پتلی گلی سے گزر رہے تھے دوسری طرف سے ایک برقعہ پوش آ رہی تھی۔ یہ گلی طوائفوں کے بازار کے متصل تھی اور طوائفیں بھی اس زمانے میں بے برقعے کے باہر نہ آتی تھیں اس لیے یہ سمجھے کہ کوئی طوائف ہے اور ازراہِ شرارت چلتے میں اس کے کہنی ماردی۔ بعد میں احساس ہوا کہ وہ طوائف نہ تھی گھر گرہستن تھی۔ اس غلطی پر اور شرمندگی کے سبب سے تین روز تک گھر سے نہ نکلے یہ واقعہ اس زمانے کی معاشرت کے اس پہلو کو ظاہر کرتا ہے کہ آوارگی حلقوں میں محدود تھی اور خود طوائفوں کا بھی ایک کردار تھا اور تماش بینوں کا بھی۔

روزانہ شام کے وقت یہ تماش بین، جن میں ہر طبقے کے لوگ ہوتے تھے، بن سنور کر پہلٹی بازار سے لے کر کشمیری بازار اور مال کے بازار تک چکّر لگایا کرتے تھے۔ یہی بازار تھے جن کے بالا خانوں پر طوائفیں رہتی تھیں۔ شام کے وقت یہ بازار شہر کے سب سے زیادہ بارونق بن جاتے تھے اور بن کیا جاتے تھے، تھے ہی سب سے زیادہ بارونق۔ سارے شہر کے شادی بیاہ اور تہواروں کے جلوس یہیں سے نکلتے تھے۔ جو لیڈر بھی آتے ان کو ان بازاروں کا گشت ضرور کرایا جاتا۔ دنگے فساد کے معرکے بھی یہیں ہوتے۔ چوراہے پر ساقی، چاندی کے مونہال لگے حقّے بھرے ہوئے، چلم پر عرق گیر ڈھانکے۔ لال کھاروے کا پٹکہ کمر سے باندھے، چمڑے کا تھیلہ گلے میں ڈالے کھڑے رہتے تھے۔ جانے آنے والے دو چار کش لیتے دو چار باتیں کرتے اور پیسہ پیسہ ان کے ہاتھ پر رکھ کے اپنی راہ لیتے۔ غالباً پردے کی شدّت، معاشرتی پابندیاں اور اخلاقی تعلیم اور اس طرح کے دوسرے اسباب ہوں گے جنھوں نے طوائفوں کا طبقہ پیدا کیا۔ یہ طبقہ کب اور کیسے وجود میں آیا اس کا جواب کوئی مورّخ تحقیق کر کے ہی دے سکتا ہے۔ ویشیا کا لفظ تو یہ ظاہر کرتا ہے کہ قدیم ہندوستان میں بھی اس قسم کی عورتوں کا وجود تھا مگر اس کردار کی انفرادیت نے اجتماعی اور منظّم صورت کب اختیار کی یہ معلوم نہیں۔ کہتے ہیں کہ اکبر کے زمانے میں یہ طبقہ موجود تھا۔ قیاس یہ ہے کہ گانے بجانے کے پیشے سے اس طبقے کی ابتدا ہوئی ہوگی۔ گانے بجانے کا پیشہ عرب میں جس طرح کنیزیں اور نیچے طبقے کی عورتیں کرتی تھیں شاید اسی طرح ہندوستان میں بھی اسی قسم کی عورتیں کرتی ہوں گی اور پھر مردوں کے اختلاط سے جنسی بے راہ روی پیدا ہوگئی ہوگی۔

طوائفوں کا یہ طبقہ رفتہ رفتہ ختم ہوگیا کیوں کہ جاگیردارانہ تہذیب بھی ختم ہوگئی اور تجارتی تہذیب غالب آ گئی۔ مشینی تہذیب کی طرح اس میں وقت کی قیمت کوئی خاص نہ تھی لیکن نفع اندوزی اور سود و زیاں کا احساس سب پر غالب تھا اس لیے طوائفوں کا وہ طبقہ جو علی الاعلان پیشہ کراتا تھا اوپر کی سطح پر آ گیا۔ پھر بھی یہ طبقہ ڈیرہ داروں کی نقل کرتا تھا اور پرانی قدروں کو ظاہر داری کے طور پر نباہتا تھا۔ نشست و برخاست میں، آداب اور گفتگو میں شائستگی ملحوظ رکھتا تھا لیکن یہ طبقہ بھی اب ختم ہونے کے قریب ہے اور جو عورتیں کہ صرف پیشہ کراتی تھیں اور ٹکیائی کہلاتی تھیں اب منظرِ عام پر آ گئی ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ عورتیں گھروں میں بیٹھ کر پیشہ کراتی تھیں اور خانگی کہلاتی تھیں۔ وہ اب معاشرے میں اس طرح شامل ہوگئی ہیں کہ امتیاز مشکل ہوگیا ہے۔ معاشی بدحالی اور اخلاقی قدروں کے زوال نے سارا نظام تہ و بالا کر دیا ہے۔ سنا ہے کہ ایک زمانے میں ڈیرہ داروں کا سماج میں ایک اہم مقام تھا اور پوری جاگیرداری تہذیب ان سے متاثر تھی۔ وہ رئیس ہی نہیں سمجھا جاتا تھا جس کے یہاں کوئی طوائف نہ ہو۔ رئیسوں کے دیوان خانوں کی رونق بھی انھی کے دم سے تھی اور ان کی موجودگی ضروری سمجھی جاتی تھی۔ رؤسا اپنے لڑکوں کو علمِ مجلسی کی تربیت ان سے دلواتے تھے اور یہ طوائفیں ان لڑکوں کے کردار اور اعمال کی نگہ داشت بھی ان کے ماں باپ سے زیادہ بہتر طریقے سے انجام دیتی تھیں۔

میرا خیال ہے کہ جاگیردارانہ دور کی اردو شاعری کے معشوق کے کردار کو سمجھنے کے لیے ان طوائفوں کے حالات و معاشرت سے واقفیت لازمی ہے۔

گانے والے:

فنِ موسیقی کے لحاظ سے آگرہ گھرانہ ہندوستان میں ایک ممتاز خصوصیت رکھتا ہے۔ ہمارے زمانے میں آفتابِ موسیقی استاد فیاض خاں تصدق حسین خاں، ولایت حسین خاں وغیرہ ہندوستان کے مشہور اور مانے ہوئے صاحبانِ کمال تھے۔ طوائفوں کے طبقے میں سنا ہے کہ کسی زمانے میں زہرہ بائی، منی بائی اور ملکہ جان کا طوطی بولتا تھا۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ منی بائی نے سب سے پہلے غزل گانا شروع کی ورنہ غزل گانا قوالوں کا کام تھا اور موسیقی کے ماہرین غزل گانا اپنی کسرِ شان سمجھتے تھے۔ ان کے بعد بڑی مشتری بائی اور لڈن بائی یہاں کی مشہور گانے والیاں تھیں۔ بڑی مشتری بائی نے ابھی ۶۶ء میں ضعیفی کے عالم میں انتقال کیا ہے۔ ان کے زمانے میں اور ان کے بعد بہت سی گانے والیاں مشہور ہوئیں مگر جو تاثیر چھوٹی مشتری بائی اور ان کی چھوٹی بہن وحیدن بائی کے گانے میں تھی اس کا جواب ملنا مشکل ہے۔ چھوٹی مشتری جب گاتی تھیں تو

راستہ چلنے والے ٹھہر جاتے تھے۔ ان دونوں بہنوں کا جوانی ہی میں انتقال ہوگا اور ان کے بعد آگرے کے اس طبقے سے یہ فن ختم ہوگیا۔ ان دونوں کی قبریں شاہ نورزماں کے تکیے میں سر راہ برابر واقع ہیں۔ مشتری بائی کی قبر کی لوح پر جو تاریخ کندہ ہے وہ مولانا سیماب مرحوم مغفور نے کہی تھی آخری شعر ہے: آگرے کو جب مٹا کر فلک کی سیماب نے

سال رحلت ہوگیا حاصل "غروب مشتری"

۱۹۳۲ء

وحیدن بائی کے لوحِ مزار پر کسی دعا صاحب کی تاریخ کندہ ہے۔ مصرع تاریخ جانے کہاں سے نکال کر لائے ہیں۔ ہو رہے ہیں آہ رنگیں انقلاب عظیم

۱۹۴۱ء

شادی بیاہ:

میں نے وہ زمانے نہیں دیکھے، سنا ہے کہ کسی زمانے میں مسلمان امرا اور شرفا کی برات کے جلوس بھی نوبت نقاروں، باجے تاشوں، بینڈ نفیری کوتل گھوڑوں اور نشان کے اونٹوں کے ساتھ نکلتے تھے۔ ساتھ میں چونے والیاں[2] تخت رواں پر گاتی چلتی تھیں۔ پاڑیں باندھی جاتیں، تورے بندی ہوتی اور بری مہندی بھی آرائش کے ساتھ جاتی۔ میں نے جب آنکھ کھولی تو مسلمان شریفوں کے شادی کے جلوس بالکل سادہ دیکھے۔ برات بھی صبح تاروں کی چھانو میں چڑھتی تھی۔ دولہا گھوڑے پر معمولی بینڈ کے ساتھ جاتا تھا۔ اب یہ رواج بھی ختم ہوگیا اور عموماً صبح نو دس بجے برات چڑھنے کا دستور رہ گیا ہے۔ مسلمانوں کا دولہا جب بیاہنے جاتا ہے تو سہرے پر محضر بھی ہوتا ہے اس طرح چہرہ بالکل چھپ جاتا ہے اور جب دلہن کو رخصت کرا کے لاتا ہے تو منہ کھول لیتا ہے اور کوئی سلام لے یا نہ لے وہ سلام کرتا جاتا ہے۔ کوئی شاید ہی ایسا دولہا ہو کہ یہ فضول سلام نہ کرتا ہو۔ یہ کہ کوئی کتنا ہی ذی فہم کیوں نہ ہو روایاتی موقعوں پر عقل و خرد سے بے گانہ ہو ہی جاتا ہے اور دوسرے بے تعلّق لوگوں کو وہ باتیں کتنی ہی حماقت کیوں نہ معلوم ہوں وہ اس میں مسرّت ہی محسوس کرتا ہے۔ شادی بیاہ بھی اس قسم کا ایک موقع ہے جب بہت سی ریت رسمیں دولہا کو ادا کرنی پڑتی ہیں۔

برات کی رخصت بھی رات ہی کو عموماً ہوتی ہے۔ دولہا گھوڑے پر ہوتا ہے، اس کے پیچھے پہلے زمانے میں دلہن کی پالکی ہوتی تھی اور اب پالکی کی جگہ موٹر کار ہوتی ہے۔ پہلے دہیز کی ایک ایک چیز خوانوں میں سجی ہوئی پالکی کے پیچھے ہوتی تھی اب یہ نمایش معیوب سمجھی جاتی ہے۔ کچھ اس لیے بھی کہ اب زیادہ دہیز دینے کی سکت بھی نہیں رہی ہے۔ دہیز کے ساتھ ایک کھانے کی دیگ ہوتی تھی، اسے بھوڑا کہتے تھے، یہ رسم ابھی باقی ہے۔ قریشی شیخ اور بعض دوسری برادریوں

میں برات ٹھیک دوپہر کو چڑھتی ہے۔ اور بہت ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ چڑھتی ہے پہلے شادیوں میں کھانے بڑے تکلف اور اہتمام کے ہوتے تھے۔صرف پلاؤ زردہ معیوب سمجھا جاتا تھا اور ذی حیثیت آدمی پلاؤ زردے کے ساتھ شیر مال قورمہ اور فرنی ضروری سمجھتے تھے۔کسی زمانے میں تورے بانٹے جاتے تھے اور محفل کے لیے پاڑ باندھی جاتی تھی۔تورے میں فی حصہ ایک پیالہ قورمے کا،ایک پیالہ قلیے کا ایک جوڑ فیرنی کے پیالے اور ایک پیالہ ماقوتی کا جو نشاستے اور شکر وغیرہ سے بنتی تھی،ایک بڑی شیر مال ایک آبی نان ایک طباق پلاؤ کا اور ایک اس سے ذرا چھوٹا طباق زردے یا متنجن کا۔جس زردے میں گوشت ڈالا جاتا تھا اسے متنجن کہتے تھے۔جن برتنوں میں تورے بانٹے جاتے تھے وہ سب مٹی کے بنوائے جاتے تھے اور ان پر لاکھ کا سرخ یا سبز روغن ہوتا تھا۔ان کو لکھوٹے کے برتن کہا جاتا تھا۔تام چینی کے برتنوں سے پہلے ان برتنوں کا رواج تھا اور عام دعوتوں میں لوگ ان ہی برتنوں میں کھاتے تھے۔غریب غربا ڈھومریوں میں کھلاتے تھے۔ ڈھومریاں مٹی کی گہری رکابیاں ہوتی تھیں جن پر روغن نہیں کیا جاتا تھا اور اس لیے سستی ہوتی تھیں۔ پاڑ اس طرح باندھی جاتی تھی کہ میزبان کے مکان سے قریب ترین شاہراہ پر بلیاں گاڑ کر اس کو تختوں سے پاٹ دیا جاتا تھا اور اس طرح ایک طویل عریض فرش بن جاتا تھا۔روشنی کے لیے ان پر شمعیں اور تیل کے گلاس لگائے جاتے تھے۔تختوں کے فرش پر چاندنی قالین بچھا دیے جاتے اور اس پر محفل جمتی تھی۔اس صورت سے مکان کے پاس ایک شاندار محفل خانہ بن جاتا جہاں برات بیٹھتی۔نقالوں اور طوائفوں کے مجرے ہوتے اور نکاح شادی کی مردانہ تقریبیں آسانی کے ساتھ سرانجام دی جاتیں پاڑ شادی سے کئی دن پہلے بن جاتی تھیں اسی پر نوبت رکھ دی جاتی، کہتے تھے کہ بغیر نوبت کے شادی کا سا گھر ہی معلوم نہیں ہوتا تھا۔پاڑ کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ اتنی بڑی محفل منعقد ہو جاتی اور اس کے نیچے سے آدمی اور سواریاں بھی چلتی رہتیں۔کسی کا حرج نہ ہوتا تھا اور نہ راستہ رکتا تھا۔

ہندوؤں میں ویش برادری جن کو بنیا کہا جاتا تھا، شادی بڑی دھوم دھام سے کرتے تھے۔مثل مشہور تھی کہ بنیے کا پیسہ یا شادی میں خرچ ہوتا ہے یا مکان بنوانے میں۔

مالدار ہندوؤں اور خاص کر بنیوں کی براتوں کے جلوس بڑے شاندار اور دیکھنے کے لائق ہوتے تھے۔پھلواری جتنی زیادہ اور بڑی ہوتی برات اتنی ہی بھاری سمجھی جاتی تھی۔کاغذ کے رنگ برنگے بڑے بڑے پھول اور پیڑ بنائے جاتے۔بعض ذی حیثیت ان پیڑوں میں پھلوں کی جگہ پیتل تانبے کے تھالی گلاس لٹکاتے۔ایک مرتبہ کسی بڑے سیٹھ نے پھولواری میں دس دس روپیہ

کے نوٹ بھی لگائے تھے۔ قاعدہ یہ تھا کہ یہ پھلواری جو برات کے ساتھ ہوتی تھی اس وقت لوٹی جائے جب برات دلہن کے دروازے پر پہنچ جائے لیکن کبھی شاید ایسا ہوا ہو ورنہ بےفکرے اوباش اسے راستے ہی میں لوٹ لیتے تھے۔ برات چڑھانے والوں کی منّت سماجت اور پولیس کی موجودگی کا اثر ان لوٹنے والوں پر ذرا بھی نہ ہوتا۔ لوٹنے والوں میں ہندو مسلمان سب ہی ہوتے تھے۔ ان جلوسوں کو ایک بازار سے گزرنے میں گھنٹوں لگ جاتے سب سے پہلے نوبت نشان کے اونٹ ہوتے جن پر سرخ منقش بانات کی جھولیں پڑی ہوتیں اس کے بعد تاشوں کی چوکی ہوتی پھر کوتل گھوڑوں کی قطار ہوتی۔ وہی گھوڑے جو دن کو اکّوں تانگوں میں جوتے جاتے اور مار کھاتے تھے مخمل کی کار چوبی کی زین اور سنہری روپہلی زیور پہن کر اس طرح قدم قدم اٹھلاتے ہوئے چلتے کہ پہچاننا دشوار ہو جاتا تھا۔ کسی ٹھیل میں نوبت بجتی ہوئی ہوتی کسی میں تانبے کے بڑے بڑے گنگال پانی بھرے رکھے ہوتے کسی میں کوئی تنبولی کار چوبی کی صدری اور ٹیڑھی ٹوپی لگائے بیٹھا پان بنا کر براتیوں کی تواضع کرتا چلتا۔ برات کے جلوس میں کولی چماروں کے دس دس بارہ بارہ سال کے لڑکے ضرور ہوتے۔ یہ لڑکے رنگ برنگے کپڑے پہنے کاغذ کی جوکروں کی سی لمبی لمبی ٹوپیاں پہنے منہ پر رنگ رنگ کے بھبوت ملے، کودتے اچھلتے تھرکتے چلتے۔ اس کے بعد پھلواری کے چھوٹے بڑے جھاڑ ہوتے اور پھر دو دو تین تین قسم کے بینڈ اور تاشوں کی چوکی ہوتی، پھر براتی اور آخر میں دولہا کی سواری ہوتی۔

دولہا کی سواری کے پیچھے گلاب باڑ ہوتی۔ اب معمولی باجے تاشے کوتل گھوڑے اور گلاب باڑ رہ گئی ہے۔ گلاب باڑ پہلے کاغذ کی بنائی جاتی تھی اور ہر برات کے لیے بنائی جاتی تھی اب کفایت شعاری کی وجہ سے بجلی کے بلب اور مختلف تصویروں سے سجا کر مستقل گلاب باڑیں بنالی گئی ہیں جو کرائے پر آجاتی ہیں۔ پھلواری مستقل طور سے ختم کر دی گئی اور بظاہر جو نقد روپیہ دولہا کو دیا جاتا ہے وہ بھی ختم کر دیا گیا ہے مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے اور اس معاملے میں اصلاح کی ساری کوششیں اب تک رائیگاں ہی ہوئی ہیں۔

ہندو مسلمانوں کی شادی بیاہ کی رسموں میں فرق ہمیشہ سے تھا اور ہے لیکن اس زمانے میں محفل خانہ سجانے اور محفل جمانے کے طور طریقے امرا و شرفا کے یہاں یکساں تھے دولہا کے پاس صدر قالین پر گاؤ تکیے سے دولہا کے قریبی عزیز بیٹھتے تھے۔ بازوؤں کے قالینوں پر مخصوص مہمان اور معززینِ شہر درجہ بدرجہ بٹھائے جاتے۔ پیچھے کی صفوں میں حسبِ مراتب دوسرے لوگ بیٹھتے۔ میزبان کی طرف سے چند لوگ لب فرش استقبال کے لیے کھڑے رہتے اور آنے والوں کو مرتبے

کے مطابق بٹھاتے جاتے۔ پائیں فرش پر اربابِ نشاط نقال اور طوائفیں اپنی اپنی باری پر مجرا کرتے رہتے۔ کھانا کھلانے کا انتظام کسی دوسری جگہ ہوتا۔ لوگ محفل سے اٹھتے جاتے اور کھانا کھاتے جاتے۔ یہ باتیں ذکر کے قابل نہ تھیں مگر کچھ روز میں اس انداز کی محفلیں دیکھنے والے بھی باقی نہ رہیں گے۔ ہمارے بچپن میں ہفتوں کی شادیاں ہوتی تھیں اور مہینوں پہلے سے شادی کے سامان شروع ہو جاتے تھے۔ دولہا والوں کے یہاں دلہن کے جوڑے کے لیے مامائیں اصیلیں اور کنبے رشتے کے وہ مرد جو ہر ایسے موقعے پر اپنا کام چھوڑ کر دوسروں کا کام سنبھال لیتے تھے۔ گوٹا پٹھا گوکھرو لچکا پیچک کرن کیکری بیسیوں قسم کے گوٹے کناری اور کپڑے خریدتے پھرتے۔ زربفت تمامی کم خواب مخمل غلطاں کے تھان بزاز لے کر ڈیوڑھیوں پر آبیٹھتے۔ دولہا کے جوڑے کا ناپ جاتا تو اس کے ساتھ مٹھائی جاتی اور پھر جب وہ ناپ کا جوڑا واپس آتا تو اس کے ساتھ مٹھائی آتی۔ دلہن کے جوڑے میں قینچی چھوائی جاتی تو اچھی خاصی مہمان داری ہو جاتی اور سارے کنبے میں مٹھائی تقسیم ہوتی، کولنیں تقسیم کرتی جاتیں اور ساری تفصیل گھر گھر بیان کرتی جاتیں مہینے ڈیڑھ مہینے پہلے کولن یا نائن بے تاریخ کا بلاوا سارے کنبے برادری میں دے آتی پھر شادی سے پہلے تاریخ وار مہندی بری اور برات کا بلاوا جاتا۔ مہینوں پہلے کنبے کی عورتیں اپنے اپنے جوڑے اور لباس سنوارتیں۔ یہ جوڑا بری کے دن پہنا جائے گا یہ مہندی کے دن یہ برات کے لیے ہے، یہ چوتھی کے دن ٹھیک رہے گا۔ ایک گھر کی شادی کئی کئی خاندانوں کو سر پر اٹھا لیتی تھی۔ جہاں چار عورتیں جمع ہوئیں اس شادی سے لے کر برسوں کی شادیوں کے ذکر اور اُن پر تبصرے ہو جاتے۔ بیسیوں کے عیب صواب اور کئی پشتوں کے شجرے کھول دیے جاتے۔ سب سے زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ ہر عورت کو ساری عمر یاد رہتا تھا کہ فلاں لڑکی کو اتنا دہیز ملا تھا، اتنے تانبے کے برتن، اتنے کانچ اور چینی کے برتن، اتنا زیور اور اتنے جوڑے ملے تھے۔ پھر زیور کی تفصیل اور رشتے کنبے والوں نے کتنے جوڑے اور کتنی کتنی قم منہ دکھائی میں، کتنی شربت پلائی میں، کتنی سلامی میں دی تھی، کیا کیا کھانے ہوئے تھے غرض ہر چیز یاد رہتی تھی اور اس پر طرّہ یہ ہے کہ ہر عورت کا زیور دوسری عورتیں پہچان لیتی تھیں۔ اب شاید ہی کہیں ایک دن سے زیادہ کی شادی ہوتی ہو۔ جو زمانے کے ساتھ نہیں چلتے زمانہ ان کو مجبور کر کے اپنے ساتھ چلاتا ہے۔

حواشی:

۱ دریائی ایک قسم کا کپڑا تھا۔ دُرگا بائی ایک مشہور طوائف تھی جو شاعر بھی تھی اور صنم تخلص تھا

۲ آگرے کی طوائفیں برات کے ساتھ گاتے ہوئے چلنے کو سخت معیوب سمجھتی تھیں۔ چونے والیوں کی ایک مخصوص برادری تھی جو برات کے ساتھ جاتی تھی۔ وجہ تسمیہ معلوم نہ ہو سکی۔

آگرے کے میلے

بڑے بوڑھے کہا کرتے تھے کسی زمانے میں آگرے میں سات دن اور آٹھ میلے ہوتے تھے۔ وقت وقت کی بات ہے۔ سستا سمے تھا۔ روپیہ کم مگر فراغت زیادہ تھی۔ کمانے سے زیادہ لوگ خرچ کرنے کے رستے نکالتے رہتے تھے۔ کنبے، برادری، دوست احباب کو جمع کرنے اور کھانا کھلانے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے۔ شادی، بیاہ، موت اور غمی کا تو ذکر ہی کیا، کچھ نہ ہوا تو میلاد اور کتھا ہی کے نام سے سب کو جمع کر لیتے۔ بچہ ماں کے پیٹ میں آیا اور ریت رسمیں شروع ہوگئیں۔ آج سدوڑ ہے کل ستوانسہ پرسوں نو وانسہ اور منوں کا پکوان ان رسموں میں بٹ جاتا۔ عقیقے، ختنے، بسم اللہ اور منڈن میں ہی اچھی خاصی مہمان داری ہو جاتی کرکمینوں کو جوڑے بیڑے، سواسنوں کو نیک۔ جوگ غرض جہاں نت نئے ہنگامے رہتے ہوں وہاں میلوں ٹھیلوں کا پوچھنا ہی کیا۔ ایک ایک میلے کا پورے سال انتظار رہتا، مہینوں پہلے شوقین تیاریاں کرتے۔ ان میلوں میں زیادہ تر میلے مذہبی تھے لیکن کوئی میلہ بھی ایسا نہ تھا جن میں ہندو مسلمان برابر شریک نہ ہوتے ہوں۔ اگر کسی کو معلوم نہ ہو تو صرف دیکھ کر کوئی نہیں پہچان سکتا تھا کہ یہ میلہ ہندوؤں کا ہے یا مسلمانوں کا۔ کتنے ہی میلے ایسے بھی تھے جن کا کسی مذہب سے تعلق نہ تھا۔ جیسے پیراکی کا میلہ، ٹرکا میلہ، میاں نظیر کا میلہ وغیرہ۔

پیراکی کا میلہ

آگرے کی پیراکی مشہور ہے۔ معلوم نہیں کب سے یہ میلہ چلا آرہا ہے۔ اس میلے سے پیراکی کا فن زندہ ہے اور اس فن کے مظاہرے کے لیے یہ میلہ ہوتا ہے۔ برسات

ہوئی، دریا چڑھا اور پیراکوں کے دل میں پیرنے کی امنگ لہریں لینے لگی۔ یہ میلہ بھادوں کی نوچندی کو ہوتا ہے مگر ایک مہینے پہلے سے پیراکوں کے غول اپنے نشان (جھنڈے) لیے ہر جمعرات کو دریا جانے شروع ہو جاتے ہیں۔ پھر بھادوں کی نوچندی جمعرات سے پہلے جو منگل آتا ہے اس دن ایک میلہ ہوتا ہے اسے سہجا کا پیالہ کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ سہجا تیراکی کے کسی استاد کی لڑکی تھی اور قوم کی ساقن تھی۔ نوچندی کے میلے میں سہجا حقّہ لے کر تیرتی اور پیراکوں کو حقّہ پلاتی جاتی۔ سہجا کا انتقال نوچندی جمعرات سے پہلے منگل کو ہوا اس لیے تیراکوں نے اس کی یادگار میں یہ میلہ قایم کیا۔ یہ میلہ نوچندی سے دو دن پہلے منگل کو ہوتا ہے۔ جس جگہ پہلے پہل تیراکوں نے سہجا کی فاتحہ دلائی تھی وہ مقام اب سہجا مائی کا پیالہ کہلاتا ہے۔ اب بھی پیراک وہاں فاتحہ کراتے ہیں[۲]۔

اصل میلہ نوچندی جمعرات کو ہوتا ہے۔ پہلے سب پیراک سیّد کے باغ جاتے ہیں وہاں ایک مزار ہے جہاں چڑھاوا چڑھاتے ہیں۔ کوئی چادر اور کوئی پنکھا۔ سب لنگوٹ باندھے نہائے ہوئے جاتے ہیں۔ ہندو ہو یا مسلمان کوئی کپڑے پہن کر نہیں جاتا۔ عام اعتقاد یہ ہے کہ وہاں چڑھاوا چڑھانے کے بعد کوئی پیراک ڈوبتا نہیں ہے۔

دریا جانے سے پہلے پیراکوں کے غول اپنے اپنے نشان لیے اپنے استاد کا نام لے کر "..... استاد کے کھیڑے کا بھلا" کے نعرے لگاتے، ڈھول تاشے باجے کے ساتھ ہندو ڈنڈے بھی کھیلتے ہوئے خاص خاص بازاروں کا گشت کرتے ہوئے دریا جاتے ہیں۔ کسی کے ساتھ کاغذ کے شیر، مینڈھے اور دوسرے جانور ہوتے ہیں۔ کوئی اپنا بیڑا سجائے اس پر پورے ساز و سامان کے ساتھ گاتے ناچتے جاتے ہیں اور اسی طرح دریا میں اتر جاتے ہیں۔ تیرنے میں پتنگیں بھی اڑتی ہیں اور کبوتر بھی، ناچ رنگ بھی ہوتے ہیں اور دوسرے کھیل تماشے بھی۔

پیرنے کی بھی بہت سی صورتیں ہیں۔ کوئی چت پیٹھ کے بل تیرتا ہے کوئی پیٹ کے بل کھڑے ہو کر، جسے کھڑی لگانا کہتے ہیں۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ سینے تک بدن پانی سے باہر رہتا ہے۔ بہت سے پیراک جمنا کے پل سے پانی میں کودتے ہیں، بہت سے اعتمادالدولہ کی سب سے اوپر کی منزل سے۔ دریا کے کنارے جدھر جدھر سے پیراک گزرتے ہیں ہزاروں تماشائیوں کا مجمع ہوتا ہے۔ اسی طرح آرام باغ چینی کا روضہ اعتمادالدولہ تماشائیوں سے بھرا ہوتا ہے۔ کسی زمانے میں طوائفیں اپنے اپنے طائفے لے کر آرام باغ پہنچ جاتی تھیں۔ گانے بجانے ہوتے اور میلے کی رونق دونی ہو جاتی۔ اب تقریباً ہر نشان کے ساتھ زنانے تھرکتے جاتے ہیں۔ شیر چیتے بھی بننے ختم ہو گئے ہیں اور باجے تاشے بھی۔

آگرے میں پیراکی کے بڑے بڑے استاد گزرے ہیں۔ اب یہ فن بھی روبہ زوال

ہے۔ میں نے ایک آخری استاد ہسّو خاں کو دیکھا تھا۔ گداز بدن، لمبا قد، سر پر پٹے، منہ پر ڈاڑھی، دوپلی ٹوپی، انگرکھا پہنے۔ اب بڈّھے ہو گئے تھے۔ مگر جب کوئی بڑا آدمی آتا تو فتحپور سیکری کی باوَڑی میں اپنے پٹھوں کو لے کر جاتے اور پیراکی کے کرتب دکھاتے۔ ان کے لیے پانی اور زمین میں کوئی فرق نہ تھا۔ پالتی مارے بیٹھے ہیں، کروٹ لے کر لیٹ گئے، چت ہو گئے۔ غرض بیسیوں کمال دکھاتے اور واہ واہ میں خوش ہو جاتے۔ بند پانی اور بہتے ہوئے پانی کی پیراکی میں فرق ہے۔ مگران کے لیے بند اور بہتے ہوئے پانی میں بھی کوئی فرق نہ تھا۔ ایک پیراک نے مجھے بتایا کہ مجھے میرے استاد نے مشق کرائی تھی کہ گھر سے چلتے وقت میں سانس روکتا تھا اور دریا پر پہنچ کر سانس ٹوٹتی تھی۔ لیکن خشکی میں اتنی دیر سانس روکنے کی مشق کے باوجود دریا میں اتنی دیر سانس نہیں روکی جا سکتی۔ پہلے زمانے میں فن بھی مخصوص حلقوں میں ہی رکھے جاتے تھے لیکن آگرے کے ایک استاد، جن کا نام بلاّ تھا انھوں نے مہتروں کو بھی یہ فن سکھا دیا۔ مہتروں نے جب ان کی خوشامد کی تو وہ چاندنی رات میں انھیں دریا لے جاتے اور تیرنا سکھاتے۔ آخر میں انھوں نے مہتروں کو نشان بھی دے دیا تھا۔ مہتر بھی اپنا نشان لے کر تیرنے جاتے ہیں۔

پروفیسر شہباز نے 'زندگانیِ بے نظیر' کے فٹ نوٹ میں لکھا ہے کہ خواجہ امیر جو نواب ذوالفقار الدولہ نجف خاں کے عہد میں اپنے والد کے ساتھ آگرے گئے تھے۔ اس تیرائی (تیراکی) کی نسبت اپنی کتاب 'معدن الجواہر' میں یوں تحریر فرماتے ہیں:

''ہمارا گھر[۳] جمنا سے قریب تھا۔ جب ہم دریا کی سیر کو جاتے تو اکثر اوقات پیراکوں کو دیکھتے کہ وہ بے شمار صنعتیں اس فن میں دکھاتے تھے۔ چنانچہ ایک شخص موتی مشر نام کا تھا جس کے سیکڑوں شاگرد تھے۔ وہ اتنا ماہر تھا کہ اپنے ہاتھوں کی دسوں انگلیاں دس آدمیوں کو پکڑا دیتا اور پھر انھیں تیرتا ہوا دریا کے اس پار لے جاتا اور پھر واپس لے آتا۔ ایک دوسرا شخص بھونا مشر تھا۔ اس کے ہاتھ پانو باندھ کر دریا میں ڈال دیتے اور وہ اسی ہیئت میں غوطے لگاتا، برسات کے دریا کو، جو دونوں کناروں سے ٹکراتا تھا، پار کر لیتا اور پھر واپس آ جاتا''[۴]

شہباز نے تیراکی کے میلے کے متعلّق نظیر کی ایک فارسی نثر نقل کی ہے جس میں تیراکوں کے کمال کا ذکر کیا ہے کہ وہ سطحِ دریا کو چاندنی کا فرش اور موجوں کو سیتل پاٹی سمجھتے تھے۔

اب یہ کمالات خواب وخیال ہو گئے ہیں۔ جاننے والے اگر ہوں گے بھی تو روشناس خلق نہیں ہیں۔ البتہ فتح پور سیکری میں ایسے لوگ ضرور ہیں کہ آپ اگر پیسہ جھالرے میں پھینک دیں تو وہ غوطہ مار کر نکال لاتے ہیں۔

میاں نظیر کا میلہ :

شہباز نے لکھا ہے:

''جب نظیر کا انتقال ہوا کئی ہزار آدمی ہندو مسلمان جمع تھے۔ چوں کہ ان کا مذہب اثنا عشری تھا، بڑی دھوم سے نماز جنازہ حسبِ مذہب اثنا عشری پڑھائی گئی مگر دو نمازیں ہوئیں جس قدر ان کے شاگرد اہلِ سنّت تھے انھوں نے الگ اپنا گروہ کر کے نماز پڑھی اور اوپر کی چادر ان کی پارچہ پارچہ کر کے اہلِ ہنود لے گئے۔ نہیں معلوم ہندو شاگردوں نے پارچے رکھے، جلائے، کیا کیے۔ شاگردوں نے ان کی قبر سنگین بنوائی۔ ہندو شاگردوں نے سوم کے دن مزار پر میلا کیا۔ ناچ، رنگ اور شعر خوانی ہوئی اور (شاہ) غلام رسول کی مسجد میں ان کے پھول ہوئے۔

میلہ سال کے سال اب بھی ہوتا ہے۔[۵]''

''مرقع اکبر آباد'' کے مصنف مولوی سعید احمد مارہروی نے لکھا ہے:

''نظیر کے انتقال کے بعد برسوں تک ہولی دوالی دسہرہ عید بقرعید کے تہواروں پر ہندو مسلمان جمع ہو کر مشاعروں کے جلسے کیا کرتے تھے۔''

مگر یہ میلہ جس کا میں ذکر کر رہا ہوں ۱۹۳۱ء سے شروع ہوا ہے۔ اس زمانے میں آگرے میں آرتی اور نماز کے سلسلے میں ہندو مسلم فساد ہوا۔ بات کچھ اور تھی بنادی گئی کچھ اور، اس طرح شہر کی فضا مکدّر ہو گئی۔ دس پانچ آدمیوں کے سر پھوٹ گئے، دس پانچ آدمی رستہ چلتے چوٹ کھا گئے۔ اس زمانے کی لڑائی میں سر ہی پھوٹتے تھے۔ گرے ہوئے آدمی پر کوئی ہاتھ نہیں چھوڑتا تھا نہ کوئی چاقو چھری کا نام جانتا تھا۔ اس وقت شہر کے صلح پسند ہندو مسلمانوں نے مل کر طے کیا کہ میاں نظیر کا میلہ پھر جاری کیا جائے تاکہ آپس میں میل ملاپ بڑھے اور غلط فہمیاں دُور ہوں۔ اتفاق کی بات کہ بسنت قریب تھی اس لیے تجویز ہوا کہ میلہ بسنت کے دن ہو اور شہر سے ہندو مسلمانوں کا ایک جلوس بسنتی کپڑے پہن کر نظیر کے مزار پر چلے اور وہاں جلسہ ہو۔ کپڑے بسنتی تو کسی نے پہننے منظور نہ کیے مگر رومال سب نے بسنتی گلے میں باندھ لیے۔ اس کے لیے ایک کمیٹی بزمِ نظیر کے نام سے قائم ہو گئی، جس کے اراکین میں رائے صاحب پنڈت برج ناتھ گوسوامی، بابو متھرا پرشاد کلکٹر، ڈاکٹر گورکھ رام ٹنڈن، بابو درگا پرشاد مہرا، حمید صاحب تاج محلی، مفتی انتظام اللہ صدیقی، مخمور اکبر آبادی اور راقم الحروف اور کتنے ہی دوسرے اصحاب مقرر ہوئے۔ شروع میں یہ میلہ اس طرح ہوتا تھا کہ تجویز و تحریک صدارت کے بعد سکریٹری اپنی رپورٹ پڑھتا تھا، صدر صاحب اپنا خطبہ پڑھتے تھے۔ پھر مشاعرہ ہوتا تھا اس کے بعد میاں نظیر کے شاگردوں کے سلسلے کے لوگ میاں نظیر کا کلام پڑھتے تھے۔ ایک مرتبہ اس میلے میں جوش ملیح آبادی نے اپنی نظم: کیا کیا ٹھسک دکھائے ہے لونڈا فقیر کا۔ پڑھی تھی۔ لیکن کمیٹی نے یہ محسوس کیا کہ عوام و خواص سب ہی

یہاں میاں نظیر کی نظمیں سننے آتے ہیں نہ کہ دوسرے شاعروں کو، اس لیے مشاعرہ موقوف کر دیا گیا۔ اب تقریر صدارت سکریٹری کی رپورٹ اور ایک آدھ مقالہ نظیر پر پڑھا جاتا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ ہزاروں آدمی یہ انتظار کرتے ہیں کہ نظیر کی نظمیں کب شروع ہوں۔ اس میلے میں ہندو مسلم اہلِ علم یونیورسیٹوں کے فاضل، حکومت کے ارباب حل وعقد شاعر سب ہی شریک ہوتے ہیں اور ان کے دوش بدوش ہزاروں عوام دل چسپی کے ساتھ گھنٹوں خاموش بیٹھے نظیر کی نظمیں سنتے رہتے ہیں۔ نظیر کی نظمیں جن لوگوں کو یاد ہیں وہ تقریباً سب ہی بے پڑھے لکھے ہیں۔ یہ لوگ ایک خاص انداز سے یہ نظمیں پڑھتے ہیں اور اپنے کو میاں نظیر کے شاگردوں کے سلسلے سے وابستہ بتاتے ہیں۔ ان میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ پارسال خلیفہ ممّد (محمد) کا انتقال ہو گیا۔ وہ اس گروہ کے بہترین پڑھنے والے تھے۔ بزم نظیر کی کوشش سے نگر مہا پالیکا (میونسپل کارپوریشن) آگرہ نے اس سال یہ تجویز منظور کر لی ہے کہ میاں نظیر کی قبر پر ایک پارک بنوا دیا جائے۔

ہولی

ہولی، دیوالی، دسہرہ، رام لیلا اور عید بقرید محرم ہندوستان میں کہاں نہیں ہوتے۔ پھر بھی ان کی تفصیل سے قطع نظر چند خصوصیات کا ذکر کرنا کافی ہوگا جس سے آگرے کی گزشتہ معاشرت کا ندازہ ہو سکے۔

ہولی سے چند روز پہلے بازاروں میں چہل پہل شروع ہو جاتی ہے۔ پہلے عموماً دیہاتی مذاق کا نشانہ بنائے جاتے تھے۔ کبھی کوئی مزدور آ پھنسا تو اس سے مٹکا اٹھوا کر لے چلے اور جب بیچ بازار میں آئے تو مٹکا توڑ دیا اور مزدور رنگ میں شرابور ہو گیا۔ ہندو ہو یا مسلمان جو بھی مذاق کا نشانہ بنتا ہنستا ہوا چلا جاتا۔ عام طور پر سفید پوش اور شائستہ آدمیوں کا لحاظ رکھا جاتا۔ دھولینڈی کے دن تو گلال اور عبیر کا مینہ برس جاتا تھا۔ ہوا کے ساتھ گلال اڑ کے مکانوں کے اندر تک پہنچ جاتا۔ بازاروں میں رنگ کی کثرت کا پوچھنا ہی کیا ہے بہت سی ٹولیاں ڈھول یا ڈھپلی (دف) پر ہولی گاتی نکلتی تھیں۔ ایک ٹولی بیس پچیس آدمیوں کی تاج گنج سے شہر آتی تھی۔ یہ بے نواؤں کا سوانگ بھرے، زرد کپڑے پہنے، گلے میں سیلیاں ڈالے، منھ پر بھبھوت ملے، سر پر حلقے کی صورت کی پگڑیاں باندھے، دف ستار اور دوسرے سازوں پر ہولیاں گاتے آتے تھے۔ یہ سب مسلمان تھے اور اپنے کو میاں نظیر کا شاگرد کہتے تھے۔ ان پر کوئی رنگ نہیں ڈالتا تھا نہ یہ کسی پر رنگ ڈالتے تھے۔ ہولی کے دن شام سے ہی جلوس نکلنے شروع ہو جاتے۔ ہر محلے کا جلوس علیحدہ علیحدہ دنوں میں نکلتا۔ یہ جلوس اب بھی نکلتے ہیں لیکن پھول ڈول کے علاوہ ہر بازار میں رات کو تخت ڈال دیے جاتے تھے اور طوائفوں کا مجرا ہوتا تھا اسے بھی پھول ڈول ہی کہتے تھے۔ آج اس محلے کا پھول ڈول ہے کل اس

محلے کا۔اب برسوں سے بے نواؤں کا سوانگ نہیں آتا نہ طوائفوں کا مجرا ہوتا ہے۔طوائفوں کی جگہ نوٹنکی والے لڑکوں اور خیال بازوں نے لے لی ہے۔

شب برات، ہولی اور عید کے بعد تاج گنج میں ٹر کا میلہ ہوتا تھا۔اور شہر کے عوام و خواص سب شریک ہوتے تھے۔ل۔احمد صاحب اکبر آبادی اپنے ماموں سے سنا ہوا بیان کرتے ہیں کہ ایک وکیل صاحب جو آگرے کے کایستھ خاندان سے تھے،تاج کے ہر میلے میں پابندی سے شرکت کرتے تھے۔نوکر قالین گاؤ تکیہ اور حقہ لے کر پہنچ جاتا اور تاج کے درمیانی سنگ مرمر کے حوض کے شمال مشرقی کونے پر قالین تکیہ لگا دیتا۔وکیل صاحب اس پر حقہ لے کر بیٹھ جاتے۔ دوست ملاقاتی جاتے آتے رہتے تھے۔جب میلہ ختم ہوتا تو مع سامان گھر لوٹ آتے۔یہ ان کا معمول تھا۔ایک سال کچھ لوگوں کو شرارت سوجھی اور انھوں وکیل صاحب کا سامان پہنچنے سے پہلے اسی جگہ فرش کر کے ایک طوائف اور اس کے ساتھیوں کو بٹھا دیا۔وکیل صاحب اپنے وقت پر آئے۔ دیکھا کہ ان کی جگہ خالی نہیں ہے۔نوکر نے سامان ایک طرف رکھ دیا۔خود دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے رکھے ٹہلتے رہے۔یہاں تک کہ میلہ ختم ہو گیا اور طوائف اُٹھ گئی تو نوکر کو حکم دیا کہ قالین تکیہ رکھو۔اس نے وہیں قالین بچھایا۔وکیل صاحب بیٹھے،حقہ پیا اور تب وہاں سے واپس ہوئے۔

ہولی کے دن شام کو اب کئی شائستہ محفلیں بھی ہوتی ہیں ان میں شری دیو کی نندن وبھو سابق ممبر اسمبلی کی کوٹھی پر جو محفل ہوتی ہے وہ مخصوص ہے۔شہر کے تمام قوم پرست ہندو مسلمان ان کے یہاں جمع ہوتے ہیں۔پان،شربت اور چندن سے سب کی تواضع ہوتی ہے۔کچھ مزاحیہ کو یتائیں،کچھ نظمیں اور تقریروں پر یہ جلسہ ختم ہو جاتا ہے۔

دوسرے دن شام کو ہیوٹ پارک میں (جس کا نام اب پالیوال پارک ہو گیا ہے) ایک بہت ہی شستہ میلا ہوتا ہے جس میں ہزاروں آدمی ہوتے ہیں۔مگر سب پر سکون۔مختلف نیتاؤں کے کیمپ ہوتے ہیں جہاں سپاری الائچی سے تواضع ہوتی ہے۔یہ میلا مہا پالیکا کی طرف سے ہوتا ہے۔اس دن اور اس میلے کا سب سے دل چسپ منظر وہ تقریب ہوتی ہے جو ۱۹۶۲ء سے ''وِردّھ جن سمّان سمیتی'' کی طرف سے کی جاتی ہے اس کے بانی اور صدر شری ہری کشن گپتا ہیں۔یہ بیلن گنج کے پرانے رئیس اور سابق زمیندار ہیں۔اس جماعت کا مقصد یہ ہے کہ بوڑھے آدمیوں کی عزت کی جائے اور سوسائٹی میں انھیں کم نگاہی کا شکار نہ ہونا پڑے۔گپتا جی اس تحریک کو عالمگیر تحریک بنانا چاہتے ہیں،اس سلسلے میں ۱۹۶۲ء میں انھوں نے جاپان کا سفر بھی کیا تھا اور ایک تاج محل کا ماڈل اپنے ساتھ لے گئے تھے جو ٹوکیو کے معمر ترین شخص کو پیش کیا تھا۔ ۱۹۶۲ء میں ٹوکیو کا معمر ترین انسان اٹھانوے سال کا تھا۔آگرے میں ہر سال وہ معمر ترین آدمی کی تلاش کرتے ہیں

اور ہولی کے دوسرے دن کے میلے میں ایک ٹینٹ لگتا ہے اس میں اسٹیج پر اس آدمی کو بٹھایا جاتا ہے اور نہایت شوخ سرخ رنگ کے مخمل کا زردوزی سے کڑھا ہوا تاج اور ایک چغہ اسے پہنایا جاتا ہے اور اس کی عمر کے اعتبار سے فی سال ایک روپیہ کے حساب سے ایک تھیلی اسے پیش کی جاتی ہے۔ جلسہ حسب دستور صدر کے انتخاب اور تقریر سے شروع ہوتا ہے۔ نظمیں ہوتی ہیں۔ گانا اور قوالی ہوتی ہے اور پھر یہ جلسہ ختم ہو جاتا ہے۔ ۱۹۶۲ء ۱۹۶۳ء میں یہ انعام ایک رفیوجی شری بوٹا رام نے حاصل کیا۔ ان کی عمر ایک سو چھ سال تھی۔ ۱۹۶۲ء میں انھیں ایک سو چھ اور ۱۹۶۳ء میں ایک سو سات روپے پیش کیے گئے۔ اس سال شری بوٹا رام کا انتقال ہو چکا تھا لہٰذا ۱۹۶۴ء کا انعام تاج گنج کے رہنے والے شری کریم الدین اور مسماۃ بتشیا شورے کو دیا گیا۔ شیخ کریم الدین کو ان کی عمر کے حساب سے ایک سو چار روپیہ اور مسماۃ بتشیا شورے کو ایک سو دو روپیہ پیش کیے گئے۔ شریمتی بتشیا کو تاج کے ساتھ بجائے چغے کے سرخ مخمل کی چادر اڑھائی گئی۔ شیخ کریم الدین اپنی صحت کے اعتبار سے چاق چوبند نظر آ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں بھی چشمے سے بے نیاز تھیں اور حواس بھی درست تھے۔ البتہ شریمتی بتشیا آنکھوں اور کانوں سے بالکل معذور تھیں۔ ان کے پوتے انھیں گود میں لے کر آئے تھے۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ کہیں اسٹیج پر ہی یہ دم نہ توڑ دیں۔

شری گپتا اس سلسلے میں اب تک صرف آگرے ہی میں ایک ہزار روپیہ کے قریب خرچ کر چکے ہیں۔ پوشاک ہی میں فی آدمی سو روپیہ سے زیادہ صرف ہو جاتے ہیں خیمہ وغیرہ میونسپلٹی کی طرف سے ہوتا ہے اس سال اس جلسے کی صدارت کا کا کالیلکر نے کی۔

کیلاش کا میلہ

شوراتری کو کیلاش کا میلہ ہوتا ہے۔ کیلاش ایک مقام ہے جو سکندرے کے مغرب میں جمنا کے کنارے ہے۔ یہاں مہادیو جی کا مندر ہے جہاں پوجا کرتے، چڑھاوا چڑھاتے اور پرکرما کرتے ہیں لیکن اصل میلہ سکندرے میں ہوتا ہے۔ اس میلے کی خصوصیت یہ تھی کہ مسلمانوں کی تعداد کسی طرح ہندوؤں سے کم نہیں ہوتی تھی۔ اس زمانے میں کوئی میلہ بغیر طوائفوں کے میلہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ طوائفوں کے ڈیرے اور بستر سکندرے میں ہوتے تھے اس لیے سارا میلہ سکندرے میں ٹوٹ پڑتا تھا۔ تماش بینوں اور شوقینوں کو پہلے سے فرمائشیں پوری کرنا پڑتی تھیں۔ کبھی رقابت میں اور کبھی فرمائش پوری نہ کرنے میں خون خرابے اور خودکشی تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔

سیتلا کا میلہ

کیلاش کے علاوہ سیتلا کا میلہ بھی مشہور ہے۔ اس میں دیوی کی پوجا ہوتی ہے۔ یہ میلہ

پیر کے پیر ہوتا ہے۔ آخری یعنی چوتھے پیر کو بڑا میلہ ہوتا ہے۔ یہ میلہ ایک دن عورتوں کا ہوتا ہے ایک دن مردوں کا۔ سیتلا کا مندر قندھاری سے آگے ہے۔

کمال خاں کا میلہ

آگرے کے جنوب میں آگرہ کینٹ اسٹیشن سے میل ڈیڑھ میل چل کر کمال خاں کی قبر ہے۔ قبر اتنی مشہور نہیں ہے جتنا کمال خاں کا کنواں مشہور ہے۔ اتنا بڑا کنواں شاید کہیں اور ہو۔ اس کنویں کے پاس ہی کمال خاں کی قبر ہے۔ کہتے ہیں کہ اکبر نے ایک باغ لگوایا تھا جس میں نولاکھ درخت تھے اس لیے اس جگہ کو نولکھا کہتے ہیں۔ اس باغ کو پانی دینے کے لیے یہ کنواں بنوایا تھا۔ عوام میں کمال خاں کی کرامتیں بہت مشہور ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ ہاتھی کے مہاوت تھے اور ہاتھی سمیت اس کنوئیں میں کود گئے تھے۔ سال کے سال اس کنوئیں پر میلہ لگتا ہے۔ گانو گانو اور قصبے قصبے سے لاکھوں آدمی آتے ہیں۔ اٹاوے اور مین پوری تک کی خلقت یہاں جمع ہوتی ہے۔ یہ میلہ چار روز رہتا ہے۔ کھیل تماشے۔ چرخ، ہنڈولے بازار سب ہی کچھ ہوتا ہے۔ کنوئیں کے اندر ایک بڑا لوہے کا توا لگا ہوا ہے جو زنجیروں سے اوپر سے لٹکا دیا گیا ہے۔ مزار پر بکرے ذبح ہوتے ہیں۔ تیل ارد، چنے کی دال، دہی، بورا، آٹے کے بنے ہوئے چراغ چڑھتے ہیں۔ کچھ گوشت چڑھادیا جاتا ہے۔ باقی لوگ کھانے کے کام میں لے آتے ہیں۔ بچوں کے منڈن ہوتے ہیں، پوجا ہوتی ہے، گیت گائے جاتے ہیں۔ مجاور سوکھی چیزیں رکھ لیتے ہیں۔ تیل اور پیسے کنوئیں میں ڈال دیتے ہیں۔ میلے کے بعد توا زنجیروں کی مدد سے اوپر کھینچ لیتے ہیں اور پیسے نکال کر بانٹ لیتے ہیں۔ کمال خاں کے معتقدین میں ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہ میلہ بھی ہندو مسلمانوں کا ملا جلا میلہ ہے۔

دیوچھٹ کا میلہ

یہ میلہ اس لیے عوام وخواص کی دل چسپی کا مرکز اور مشہور ہے کہ اس میلے میں عرصۂ دراز سے اکّوں کی اور اکّے (یکے) ختم ہونے کی وجہ سے اب تانگوں کی دوڑ ہوتی ہے۔ یہ دوڑ سکندرے سے شروع ہوکر فرح (پھرے) تک ہوتی ہے۔ فرح ایک گانو ہے جو آگرہ متھرا کے درمیان واقع ہے۔ اس دوڑ کے لیے سال سال بھر گھوڑوں کو تیّار کیا جاتا ہے۔ ایک ایک گھوڑے پر سیکڑوں کی بازی لگتی ہے اور گھنٹوں میں ہزاروں روپیہ کی ہار جیت ہوتی ہے۔

قلقلیں

دیوچھٹ سے زیادہ دل چسپ اور مشہور قلقلوں کا میلہ ہے۔ یہ قلقلیں مختلف میدانوں

میں لڑائی جاتی تھیں۔ یہ میدان سکندرے کے باہر ہوتا تھا پھر تاج کے باہر ہونے لگا۔ معلوم ہوا ہے کہ اس سال پولیس نے بند کر دیا ہے کیونکہ کبوتروں کے ساتھ آدمی بھی لڑ جاتے تھے۔ اب کبوتروں پر بھی ٹیکس لگ گیا ہے اس لیے شاید یہ ہمیشہ کے لیے ہی ختم ہو جائے۔

بانس کی پھچیوں کا ایک بڑا سا ڈربا سا بناتے ہیں۔ اس میں چار پہیے ہوتے ہیں۔ ایک ایک گاڑی میں سیکڑوں کبوتر بند ہوتے ہیں۔ یہ گاڑیاں لے کر مختلف ٹولیاں میدان میں جمع ہو جاتی ہیں اور اپنے اپنے کبوتر اڑاتی ہیں۔ ہزاروں کبوتروں سے آسمان چھپ جاتا ہے۔ کبوتروں کا ایک غول دوسرے غول میں گھس جاتا ہے گھمسان کا رن پڑتا ہے۔ ادھر کبوتر بازوں کی آوازوں اور زفیلوں سے ایک محشر زمین پر بپا ہو جاتا ہے۔ پھر جب کبوتروں کی ٹولیاں حریفوں کو گھیرے ہوئے اپنی ٹھٹھری پر اترتی ہیں تو کبوتر بازوں میں قیامت برپا ہو جاتی ہے۔ جس کے کبوتر دوسرے کبوتر باز نے پکڑ لیے اس کی ناک کٹ گئی۔ کسی نہ کسی طرح وہ اپنے کبوتر اس سے واپس لے گا، خوشامد سے، پیسے سے اور جیسے بھی بنے۔ ایک ایک کبوتر دس سے لے کر سو روپے تک دے کر واپس لیا جاتا ہے۔ صرف آبرو ہی کا سوال نہیں ہے بلکہ نسل کا بھی سوال آ پڑتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہمارے کبوتروں کی نسل دوسرے کے یہاں چلی جائے۔ کبوتروں کو مختلف قسم کی غذائیں اور مقویات دے کر تیار کیا جاتا ہے۔ سیکڑوں نسخے سینہ بہ سینہ چلے آتے ہیں۔ بڑے بڑے سیٹھ ساہوکار اور نواب اس مرض میں مبتلا ہیں۔ آگرے میں کبوتر بازی کے بڑے بڑے استاد تھے۔ آخری استادوں میں نائی کی منڈی والے حکیم اسحاق تھے۔ شاعری میں سیماب اکبرآبادی کے شاگرد تھے۔ سانپ پالنے کا بھی شوق تھا غرض آگرے کے ایک مخصوص دور کے پورے نمائندے تھے۔ ان کے علاوہ معلوم ہوا ہے کہ نئی بستی امیر الدین عرف دین بادشاہ بڑے معروف استاد اور ماہر کبوتر باز ہیں۔

گن گوروں کا میلہ

گن گوروں کا میلہ راجستھان اور خصوصاً جے پور میں دھوم دھام سے ہوتا ہے مگر یو۔ پی میں شاید صرف آگرے ہی میں یہ میلہ ہوتا ہے اور آگرے میں بھی ایک مخصوص محلّے موتی کٹڑے کو یہ خصوصیت حاصل ہے۔ ہر سواری میں دو مورتیاں ہوتی ہیں۔ ایک شو جی کی اور ایک پاربتی جی کی، انھیں گنگور کہتے ہیں۔

یہ گنگوریں مختلف برادریوں کی ہوتی ہیں۔ ان کا جلوس آگے پیچھے ہوتا ہے۔ اگروالوں کی، اوسوالوں کی، برہمنوں کی، ٹھاکروں کی، مالیوں کی، اہیروں کی۔ ایک ایک گنگور ایک ایک لاکھ کا زیور پہنے ہوتی ہے۔ اس موقع پر ہر برادری اپنے زیوروں اور مالیت کی نمائش کرتی ہے اور

ایک کا دوسرے سے مقابلہ ہوتا ہے۔ عام ہندوؤں کے جلوسوں کی طرح اس میں ڈنڈے نہیں کھیلے جاتے ہیں۔ صرف اہیروں کے جلوس میں ڈنڈے کھیلے جاتے ہیں۔ ویسے باجا گاجا پورا لوازمہ ہوتا ہے۔ یہ میلہ ہولی کے کچھ دن بعد ہوتا ہے۔ جب سے گولڈ کنٹرول ہوا ہے زیوروں کی نوعیت بھی بدل گئی ہے۔ اب سونا کم اور اور جواہرات زیادہ ہوتے ہیں۔ گنگوروں کے گیت بھی مخصوص ہیں۔ راجستھانی گیتوں میں کچھ ترمیم کرلی گئی ہے۔

رام لیلا اور دسہرہ

میں نے بچپن میں گوالیار کے مہاراجہ کی دسہرے کی سواری دیکھی ہے جسے دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور صبح سے شام ہوگئی تھی پھر جے پور میں ہولی اور دسہرے کی سواری دیکھی۔ جن لوگوں نے یہ جلوس نہیں دیکھے وہ اس کی شان شوکت، زیب وزینت، غلغلے اور ہمہمے کا تصور بھی نہ کرسکیں گے۔ جے پور کے جلوس میں کئی چیزیں ایسی دیکھیں جن کا نام ہی سنا تھا۔ مثلاً ماہی مراتب، لین ڈوری، سانڈنی سوار وغیرہ۔ اس ریاست نے مغلوں کے دیے ہوئے اعزاز اور روایات کو آخر دم تک بڑی احتیاط کے ساتھ قائم رکھا۔ اب ریاست کے ساتھ وہ روایات بھی زیب داستاں ہوگئیں۔

آگرے میں دسہرے کے دن خاص شہر میں کچھ نہیں ہوتا۔ البتہ رام لیلا کے میدان میں لاکھوں آدمی راون کو جلتا ہوا دیکھ کر رام چندر جی کی جے بولتے اور اس طرح ذات پات کے بندھنوں سے بلند ہوکر حق اور انصاف کی فتح پر خوشی مناتے ہیں لیکن رام لیلا کی برات کا جلوس اور اس سے پہلے اور بعد کے تمام جلوس جیسے گینش جی کی سواری، بن باس، دھنش یگ، سیتا ہرن اور راون کی دہائی، بھرت ملاپ سب شہر میں نکلتے ہیں۔ رام چندر جی کی برات کے دن بازاروں میں سب سے زیادہ ہجوم ہوتا ہے۔ مٹی کے کھلونے بیچنے والے جس طرح رنگ برنگ کے کھلونے اوراوپر نیچے قطار در قطار چن دیتے ہیں بالکل اسی طرح رنگ برنگ کے لباس پہنے عورتیں اور بچے مکانوں کی چھتوں، چھجوں، برآمدوں، گوکوں اور دوکانوں پر لدے ہوئے ہوتے ہیں۔ جدھر جدھر سے یہ برات گزرتی ہے ہجوم ادھر ادھر ہی منتقل ہوتا رہتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ بوجھ سے کوئی چھجہ ٹوٹ پڑا ہے اور کئی جانیں ضائع ہوگئی ہیں۔ برات کا جلوس منکامیشور کے مندر سے شروع ہوتا ہے اور شہر کے خاص خاص بازاروں کا گشت کرکے پھر وہیں ختم ہوجاتا ہے یا اس شخص کے یہاں ختم ہوتا ہے جو اس برات کو ٹھہراتا ہے۔ یہ گشت تقریباً ۱۲ گھنٹے کا ہوتا ہے، یعنی شام کے چار بجے سے صبح کے تین چار بجے تک۔ منکامیشور کا مندر آگرے کا قدیم ترین اور مقدس ترین مندر سمجھا جاتا ہے۔ برات میں تاشے، باجے سب ہی کچھ ہوتے ہیں۔ لیکن اس جلوس میں آگرے کے تجارتی

حلقوں کی پوری نمایندگی ہوتی ہے۔ایک ایک ٹھیل ایک چلتی پھرتی دوکان ہوتی ہے اور زینت کے علاوہ اس طرح دوکان کا اشتہار بھی خوب ہو جاتا ہے۔بیل گاڑیوں میں گانے والوں کی ٹولیاں ہوتی ہیں جو تھالی مٹکا بجاتے گاتے جاتے ہیں۔کوئی ان میں سانپ گلے میں ڈالے ہوتے ہیں کوئی چھریاں اور تکلے گردن پیٹ اور زبان کے آر پار چبھوتے اور کوئی منہ سے شعلے نکالتے چلے جاتے ہیں۔دسرتھ جی وشِشٹ جی اور دوسرے رشیوں کی سواریاں ہوتی ہیں آخر میں بینڈ کے ساتھ آٹھ دس ہاتھیوں کا جلوس ہوتا ہے جس میں رام چندر جی کے بھائی اور آخر میں رام چندر جی دولھا بنے ہاتھی پر بیٹھے ہوتے ہیں۔رام لیلا کا بھی ایک فنڈ ہے جس میں کاروباری اور لین دین کرنے والے سب حصہ لیتے ہیں یہاں تک کہ قرض لینے والوں کو مہاجن جو روپیہ دیتے ہیں اس میں سے پہلے رام لیلا کے لیے روپیہ مجرا کر لیتے ہیں۔اس برات کا ایک واقعہ مجھے ہمیشہ یاد آتا ہے۔بہت دن کی بات ہے ریاض خیر آبادی کے چھوٹے بھائی سید نیاز احمد آگرے میں کوتوال تھے۔کسی زمانے میں ان کے والد سید طفیل احمد صاحب بھی آگرے میں کسی عہدے پر تھے اور ریاض احمد صاحب خیر آبادی اور سید نیاز احمد صاحب میرے والد محترم کے ساتھ پڑھتے تھے۔اس تعلق سے سید نیاز احمد صاحب ہمارے یہاں آتے جاتے تھے۔ایک دن جب رام لیلا کی برات نکل رہی تھی اور ہم لوگ گوک میں بیٹھے دیکھ رہے تھے کوتوال صاحب وردی پہنے ہوئے کانسٹیبلوں کو ساتھ لیے ہمارے یہاں گھبرائے ہوئے آئے۔کرسیاں کہاں ہیں؟انھوں نے گھبرا کر پوچھا۔ ہمارے یہاں پرانے زمانے کی چار پانچ کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔دوسرے کمرے میں سے وہ خود اور کانسٹیبل کرسیاں اٹھا کر لائے اور گوک میں ڈال دیں۔اتنے میں تین چار انگریز آگئے اور کرسیوں پر بیٹھ گئے۔یہ فرگسن کلکٹر تھے۔ان کے ساتھ جنٹ مجسٹریٹ،اور سپرنٹنڈنٹ پولیس وغیرہ تھے۔اس زمانے میں ان عہدوں پر عموماً انگریز ہی ہوتے تھے۔ہم گوک خالی کر کے باہر آگئے۔مسٹر فرگسن نے ہم سے معذرت کی اور پوچھا اب آپ لوگ کہاں سے دیکھیں گے۔میں نے کہا سب سے اوپر کی منزل سے دیکھ لیں گے ہمیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔اس زمانے میں میری گیارہ بارہ سال کی عمر تھی۔کوئی اور مرد ہمارا سرپرست نہ تھا جو تواضع کرتا۔یہ فرض بھی کوتوال صاحب ہی کو انجام دینا پڑا۔اتنے میں ایک کھٹیک نے اپنی بیل گاڑی میں سے ایک سیب پھینکا وہ جنٹ صاحب کے گال پر پڑا۔وہ غصّے کے مارے کھڑے ہو گئے۔کلکٹر کو ناگوار گزرا مگر کوتوال نے سمجھایا کہ یہ لوگ تواضع اور تعظیم کے اظہار کے لیے ایسا کرتے ہیں تب وہ پھر بیٹھ گئے۔

کرشن لیلا

رام لیلا کی طرح کرشن لیلا بھی ہوتی ہے۔یہ رام لیلا کے بعد ہوتی ہے۔جعفر خاں کے

روضے میں ایک گئوشالہ ہے وہاں سے اس کا جلوس نکلتا ہے۔ ہر ٹھیلے پر ایک جھانکی ہوتی ہے جن میں سری کرشن کی زندگی کے مختلف مناظر دکھائے جاتے ہیں۔ رام لیلا کی طرح اس کا فنڈ بھی جمع ہوتا رہتا ہے۔ اب بھی سنا ہے ڈھائی تین لاکھ روپیہ اس مد میں جمع ہے۔ رام لیلا کے منتظم شری کو کامل اور کرشن لیلا کے منتظم شری کالی چرن ہیں جو گئوشالہ کے سکریٹری بھی ہیں۔ ویسے جنم اشٹمی پر بڑی دھوم دھام رہتی ہے۔ جگہ جگہ ہنڈولے سجائے جاتے ہیں اور محرّم کی سبیلوں کی طرح ان میں مختلف قسم کے مناظر بنائے جاتے اور سجاوٹ کی جاتی ہے۔ آگرے میں بوہرے رام گوپال کار پریٹر کا ہنڈولہ مشہور ہے۔ جنم اشٹمی پر جاٹو برادری کا جلوس بھی بڑے دھوم دھام سے نکلتا ہے۔

ان میلوں کے علاوہ اور بھی کئی میلے ہوتے ہیں جن میں بالکیشر کا میلہ بھی مشہور ہے اور جب سے پنجابی آ گئے ہیں تو جمنا کے کنارے صبح کے وقت بیساکھی کا میلہ بھی ہونے لگا ہے۔

آگرے کے محرّم

ہماری طرف آگرہ، جے پور اور گوالیار کے محرم مشہور تھے۔ گوالیار کے مہاراجہ مادھوسنگھ تو خود تعزیہ داری کرتے، فقیری پہنتے، مجلسیں کراتے اور دسویں کو ننگے پاؤں ننگے سر تعزیے کے ساتھ جاتے۔ وہاں کے محرم کا کہنا ہی کیا۔ مگر آگرے والوں کو آگرے کے محرم سے زیادہ کہیں کے محرم نہ بھاتے۔ مشہور بات تھی کہ آگرے کے آدمی کہیں ہوں محرم پر آگرے آ جاتے ہیں۔

محرم کے دنوں میں آگرہ بالکل بدل جاتا تھا۔ بازاروں اور گلی کوچوں میں تعزیوں سبیلوں کی آرائش و زیبائش اور چہل پہل کا یہ عالم ہوتا کہ دیکھے ہوئے گلی کوچے پہچانے نہ پڑتے۔ مسلمان تو مسلمان بہت سے ہندو تعزیہ داری کرتے۔ فقیری پہنتے اور فاتحہ دُرود کرتے تھے۔ ہندو عورتیں اپنے بچوں کو لے کر تعزیوں کے نیچے سے نکلتیں، چڑھاوا چڑھاتیں، عرضیاں باندھتیں اور ہاتھ جوڑے کھڑی رہتیں۔ قدم قدم پر سبیلیں لگی ہیں محلے محلے بازار بازار تعزیے رکھے ہیں۔ سیکڑوں آدمی سبز کپڑے پہنے ادھر سے ادھر گھومتے رہتے۔ سال بھر جو لوگ کسرت نہ کرتے وہ بھی محرم سے ایک مہینہ پہلے کسرت شروع کر دیتے اور پھر اپنے ڈنٹر بلّے خود دیکھتے اور دوسروں کو دکھاتے بانکے بنے سارے شہر کا گشت لگاتے پھرتے اور پھر جب محرم ختم ہو جاتے تو سارے شہر پر ایک سناٹا چھا جاتا۔ دل بجھ جاتے اور آنکھیں پرنم ہو جاتیں۔ ہندو دوکان دار ایک ایک سے پوچھتے رہتے محرم میں کتنے دن ہیں۔ جتنی بکری ان کی ان بارہ دنوں میں ہوتی سال بھر میں نہ ہوتی۔ فقیروں کے گروہ کے گروہ اور غول کے غول حسینؑ کی خیرات لیتے ادھر سے ادھر گھومتے رہتے۔ سارا شہر یا حسینؑ یا حسینؑ اور نعرہ حیدری یا حسین اور ڈھول تاشوں کی آوازوں اور مرثیوں کی صداؤں سے گونجتا رہتا، پندرہ بیس دن چاندرات سے پہلے ایک فقیر سر پر سبز کسادہ کسے، سبز

کرتا پہنے ایک ہاتھ میں علم ایک میں مورچھل لیے گشت شروع کر دیتا۔ اس کے بعد اس کے ساتھ ایک تاشہ اور ایک ڈھول ہوتا۔ تھوڑی تھوڑی دور پر ڈھول تاشہ بند ہو جاتا اور وہ صدا لگاتا "ماموں بھانجے کی کھاٹی پر ہندو مسلمان کی کمائی سے تعزیہ بنے گا۔" اور ہندو مسلمان سب اسے پیسے دیتے، عورتیں بچوں کے ہاتھ سے پیسہ دلواتیں اور وہ بچے کے سر پر مورچھل پھیر کر آگے بڑھ جاتا۔ سب جان لیتے محرم آ گئے۔

چاند اگر انتیس کا ہو گیا تو مغرب کے بعد نہیں تو تیس تاریخ کو مغرب سے پہلے گھگّا کے علم اٹھتے تھے۔ محرم کا چاند صرف تعزیہ دار ہی دیکھنے کوٹھوں پر چڑھتے تھے اور کوئی نہیں دیکھتا تھا۔ گھگّا آگرہ گائیکی گھرانے کے نامی گویّے تھے اور نئی بستی میں میراثیوں کی گلی میں رہتے تھے وہیں ان کے علم رکھے جاتے تھے۔ ان کے علموں کا جلوس نئی بستی سے کشمیری بازار، کٹاری بازار سیو کے بازار ہوتا ہوا چڑی مار ٹولے کے راستے سے پھر نئی بستی پہنچ جاتا تھا۔ جلوس میں شیعہ سنی کے عوام و خواص سب ہی ہوتے تھے۔ آگے تاشے ہوتے اس کے پیچھے مجمع ہوتا۔ علم ٹھہر جاتے تو تاشے بند ہو جاتے اور سوز خوانی شروع ہو جاتی۔ آگرہ گھرانے کے نامی فن کار سب ہی سوز خوانی کرتے۔ آفتابِ موسیقی فیاض حسین خاں، استاد تصدق حسین خاں، استاد ولایت حسین خاں، استاد اسد علی خاں اور ان کا سارا خاندان ہی سوز خوانی کرتا جاتا۔ علم ان کے گھر کے ہی تو تھے۔ یہ علم اب گشت کو نہیں اٹھتے مگر اپنے مقام پر بدستور رکھے جاتے ہیں اور مجلسیں ہوتی ہیں۔ آفتاب موسیقی کے زمانے میں بڑے بڑے نامی گرامی لوگ انھیں سننے کے لیے اس مجلس میں آتے تھے۔ پہلی دوسری تاریخ میں بہت سے تعزیے براقیں اٹھتی تھیں۔ کسی زمانے میں تیسری تاریخ بالکل خالی تھی۔ پھر کفو نامی کمبوٹولے کے ایک شخص نے تیسری کو بھی ایک تعزیہ نکالنا شروع کر دیا۔ یہ تعزیہ مسالے کا کہلاتا تھا۔ تمام قسم کے اناج اور مسالوں سے اس میں پھول بیلی بنائے جاتے تھے۔ چوتھی تاریخ کو کمبل کٹرے کا ہالوں کا تعزیہ اور ہالوں کی براق اٹھتی تھی اور بھی بہت سے تعزیے اٹھتے تھے۔ مگر یہ تعزیہ اس لیے مشہور تھا کہ اس پر شروع سے آخر تک سبز گھاس بوئی جاتی تھی اور چوتھی تاریخ تک وہ گھاس چار چھ انگل بڑھ کر لہلہانے لگتی تھی۔ اسی طرح براق بھی تھی اور پھر بعد میں ایک سبیل بھی ایسی ہی گھاس کی اٹھنے لگی تھی۔ سبیل ایک تو اسے کہتے ہیں جو کسی مقام پر تخت بچھا کر آرائش کرتے ہیں اور پانی یا شربت وہاں پلایا جاتا ہے۔ اور ایک سبیل تعزیے کی قسم ہے۔ ان سبیلوں میں بڑی صنعت دکھائی جاتی تھی۔ ابرک اور پنّی سے چوکٹوں میں مختلف مقامات کے خوب صورت نقشے بنے ہوتے جو ڈوری کھینچنے سے ایک کے اندر سے ایک نکل کر بلند ہو جاتے تھے اور پھر انھیں نیچا کر دیا جاتا تھا۔ تعزیہ داری میں تعزیے کے علاوہ علم، شدّے، براق، سبیل، ذوالفقار، تابوت اور

ضریح رکھے جاتے تھے۔ ضریح شیعوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ سنیوں میں کم اور شیعوں میں مجلس کا رواج زیادہ تھا۔ شاہ گنج کی مجلسوں کے علاوہ شہر میں شیخ بزرگ عالی کے یہاں پانچویں کی مجلس اور گلاب خانے کے امام باڑے کی آٹھویں کی مجلس بہت مشہور تھی۔ ان مجلسوں میں ہندو مسلم شیعہ عمائدین شہر اور اہل علم سب ہی شریک ہوتے تھے۔ آٹھویں کی مجلس میں شیر مال تقسیم ہوتی تھی۔ امام باڑے کی وسیع عمارت میں کہیں تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی اور جو لوگ دیر سے آتے انھیں اندر جانا مشکل ہو جاتا۔ گھنٹہ گھنٹہ بھر مجلس ختم ہونے کے بعد بھی باہر آنا مشکل تھا۔ پانچویں کو پیک منائے جاتے تھے۔ ایک خاص قسم کی مروڑی دی ہوئی سفید اور نیلی شیوا جی قسم کی پگڑی سر پر، روپہلی بادلے کی بدھی گلے میں، کمر میں گھنٹیاں بندھی ہوئی بیس بیس چالیس چالیس کے غول ادھر سے ادھر بھاگتے پھرتے۔ جدھر سے گزر جاتے۔ کیسا ہی مجمع ہو کائی کی طرح پھٹ جاتا۔ نو تاریخ کو یہ ساری رات تعزیوں پر شہیدی پڑھتے پھرتے۔ ایک آدمی مصرع پڑھتا: ''آیا ہوں کربلا سے خبر لے حسین کی''

اور سب کہتے ''ہے ہے'' اس طرح پوری نظم ایک خاص لہجے میں پڑھی جاتی۔

ہر تعزیے کے دو گشت ہوتے تھے۔ ایک جس روز وہ رکھا جاتا اور ایک نو تاریخ کو۔ ان تعزیوں کی وجہ سے تعزیہ داروں کا نام زندہ تھا۔ ورنہ بتائیے شہدی بنّو کا نام کون جانتا۔ مگر وہ تو مشال (مشعل) لیے اپنے تعزیے کے ساتھ ہوتی تھیں اور کسی نہ کسی سے جھگڑا کر ڈالتیں۔ اس وجہ سے لوگ انھیں شہدی بنو کہتے تھے۔ اسی طرح بی پیاری کا تعزیہ، کالے چودھری کا تعزیہ، حکیم شفیع اللہ اور صفدر خاں کے تعزیے، جوالا کے علم عیدا کی براق اور اس طرح کے بہت سے تعزیے تھے جو رکھنے والوں کے نام سے مشہور تھے۔ بہت سے محلوں کے نام سے مشہور تھے۔ ان کی وجہ سے ایسے ایسے محلوں کے نام سننے میں آجاتے تھے جنھیں عام طور سے لوگ نہیں جانتے اور بہت سے تعزیے اپنی صنعت کاری کی وجہ سے مشہور تھے۔ یہ واقعہ ہے کہ آگرے والوں نے اپنے فن اور صنعت کا کمال ان تعزیوں میں صرف کر دیا تھا۔ ایسا حسین اور باریک کام اب شاید دیکھنے میں نہ آئے۔ عیدا کی براق پر سنا ہے چھ مہینے پہلے سے کام شروع ہو جاتا تھا۔ کوئی چیز شاید ہی ایسی باقی رہی ہو جس کا تعزیہ بن سکتا ہو اور لوگوں نے نہ بنایا ہو۔ مثلاً روئی کا تعزیہ، ابرک کا تعزیہ، چوڑی کا تعزیہ، کاٹ کا تعزیہ، سرکی کا تعزیہ، موم کا تعزیہ، رانگ کا تعزیہ، کاغذ کے پھولوں کا تعزیہ، سچے پھولوں کا تعزیہ، مٹی کا تعزیہ، گھاس کا تعزیہ، ناج کا تعزیہ، مٹھائی کا تعزیہ، قالین کا تعزیہ، کپڑے کا تعزیہ یہاں تک کہ سونے چاندی کا تعزیہ بھی تھا۔ یہ تعزیہ گشت نہیں کرتا تھا۔ ہر تعزیے میں صنعت کار اپنی صنعت اور فن کی ہر ممکن نمائش کرتا تھا۔ پھر گشت کے وقت بکی چھڑا کے ان کی نمائش ہوتی۔ تعزیوں کا تعزیوں

سے اور براقوں کا براقوں سے مقابلہ ہوتا۔ اس طرح تاشے والے تاشے والوں سے مقابلہ کرتے۔ ان کا مقابلہ یہ تھا کہ دونوں گروہ آمنے سامنے ڈٹ جاتے۔ باری باری تاشے نوازی کا کمال دکھاتے اس طرح گھنٹے گزر جاتے۔ جو ہٹ جائے وہی ہار جائے۔ اس لیے لوگ درمیان میں پڑ کر صلح کرا دیتے اور دونوں چوکیاں ایک ساتھ تاشے کی ایک مخصوص گت تال سجاتی ہوئی اپنا اپنا راستہ لیتیں۔

آگرے میں چار تعزیے اپنی بلندی کے اعتبار سے مشہور تھے۔ مٹھائی کا تعزیہ۔ قلعہ کا تعزیہ، بالوگنج کا تعزیہ اور صاحب علی کا تعزیہ۔ مٹھائی کا تعزیہ نوری دروازے میں رکھا جاتا تھا۔ یہ مٹھائی والے اور بتاسے والے رکھتے تھے۔ قلعے کا تعزیہ قلعے میں رکھا جاتا تھا۔ یہ قلعے کے سپاہی رکھتے تھے۔ ایک ایک تعزیے میں کتنے ہی کھن ہوتے تھے جو علیحدہ علیحدہ بنائے جاتے اور پھر اوپر نیچے رکھ کر کس دیے جاتے تھے۔ کھنوں میں چاروں طرف رسّیاں باندھ دی جاتی تھیں جنھیں لوگ چاروں طرف سے کھینچے رہتے تھے تاکہ چلنے میں توازن قائم رہے اور تعزیہ کسی طرف جھوک نہ کھا جائے۔ قلعے کے تعزیے کی برجی پر کاغذ کے مور ناچتے رہتے تھے اور بالوگنج کے تعزیے پر کاغذ کی پھرکنیاں۔ مٹھائی کے تعزیے کی دو برجیاں ہوتیں جن کے کلس شکر سے بنائے جاتے تھے۔ سارے تعزیے پر بتاسوں سے پھول بیل بنائے جاتے۔ سہرے میں بتاسے اور دوسری مٹھائیاں ہوتی تھیں۔ شہر میں اونچی سے اونچی عمارت سے یہ تعزیے اونچے ہوتے اور بازار کے قریب رہے والوں کو اپنے صحن میں سے نظر آجاتے تھے۔ مٹھائی کا تعزیہ بلاّ استاد رکھتے تھے، مذہب سے ہندو اور پیشہ کے اعتبار سے بتاسے والے تھے۔ یہ پیرا کی کے بھی استاد تھے۔ تعزیے کی محبت اور اعتقاد سے آخر عمر میں مسلمان ہو گئے تھے۔ وصیّت کے مطابق کربلا میں، جہاں ان کا تعزہ دفن کیا جاتا تھا، اسی کے برابر دفن ہوئے۔ ان کا تعزیہ آٹھویں کی رات کو اٹھتا تھا اور لے جا کر راوت پاڑے میں سڑک پر رکھ دیا جاتا تھا پھر صبح سات بجے وہاں سے اٹھا کر دوسرے تعزیوں کے ساتھ گشت میں شریک ہو جاتا۔ ایک سال تعزیہ سڑک پر رکھا تھا کہ مہتروں نے جھاڑو دینا شروع کر دی اور تعزیے پر خاک پڑنے لگی۔ راوت پاڑہ ہمیشہ سے خالص اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور تجارت پیشہ لوگوں کا محلّہ ہے۔ ان لوگوں نے بھنگیوں کو روکا۔ بھنگی نہ مانے اور نوبت مار پیٹ تک پہنچ گئی۔ آخر خود بلاّ استاد نے صلح کرا کے معاملہ رفع دفع کیا۔ آگرے میں کالے محل کے قریب چوراہے پر گجرا والوں کی حویلی ہے۔ یہ وہاں کے سب مکانوں سے بلند ہے اور مٹھائی کا تعزیہ اس سے بھی بلند ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ کسی نے حویلی کی بالائی منزل پر کھنگر رکھوا کرا سے اور اونچا کر دیا۔ مٹھائی کے تعزیے والوں کو خبر ہو گئی۔ انھوں نے راتوں رات ایک کھن بنا کر اور لگا دی اور جب تعزیہ حویلی کے مقابل پہنچا تو تعزیہ اونچا رہا۔

سات تاریخ کو آگرے کا مقبول ترین تعزیہ رکھا جاتا ہے۔ یہ سچّے گلاب کے پھولوں سے بنتا ہے اور دیگیوں کے کڑے میں رکھا جاتا ہے اور تعزیوں کی طرح اس کا بھی گشت موقوف ہے اس میں کئی من پھول صرف ہوتے ہیں اور گلاب، جو اس پر عقیدت سے لوگ چھڑکتے ہیں اس کا تو کوئی حساب نہیں۔ جب یہ گشت کرتا تھا تو جن جن راستوں سے گزرتا تھا بلا مبالغہ گلاب کی کیچڑ ہو جاتی تھی۔ سات تاریخ کو جب یہ تعزیہ بازار میں آتا تو بازار دوسرے تعزیوں سے بھرا ہوتا تھا مگر احتراماً تمام ڈھول تاشے بند ہو جاتے تھے۔ یہ تعزیہ مرثیوں سے گشت کرتا تھا۔ یہ تعزیہ اب بھی رکھا جاتا ہے اور ہر مذہب اور ہر فرقے کے زائرین اس کی زیارت کرتے ہیں۔

تعزیوں کے علاوہ محرم میں بڑی تعداد اکھاڑوں کی تھی جن میں فنونِ سپہ گری کی نمائش ہوتی تھی۔ ان میں ایک مشہور اکھاڑہ ننّے استاد منیر خلیفہ کا تھا۔ یہ دونوں بھائی تھے ان کے باپ بھیکن خاں کہیں باہر سے وارد ہوئے تھے۔ انھیں ایک ہت گٹی کا داؤں ایسا رواں تھا کہ اچھے اچھے استادوں کے گتکے پٹے رکھوا لیتے تھے۔ دونوں بھائی اکنگ، گتکا، ظفر پیکر، بانا، بنیٹی، بچھوا، پٹہ سب ہی کچھ جانتے تھے اور بقول خود بانک بنوٹ کے بھی ماہر تھے۔ محرم کی آٹھ تاریخ کو ان کا اکھاڑا کناری بازار میں چوار ہے سے ہٹ کر لگتا تھا۔ بلّی کا ایک کنارا بازار کی ایک طرف کی گوک پر رکھ دیتے۔ ان میں رسوں کے چھوٹے بڑے کئی کئی جھولے پڑے ہوتے۔ سب پر لال ٹول لپٹی ہوتی۔ بیچ بازار میں تخت بچھ جاتے۔ جوانوں اور لڑکوں کی ٹولیاں کسرتی ہمرنگ لباس پہنے ہوئے ان جھولوں پر اور تختوں پر طرح طرح کی کسرتیں قلابازیاں اور جمناسٹک کر کے کرتب دکھاتے۔ اسی کے ساتھ لکڑی پٹے کے کمالات کی نمائش کرتے، خلیفہ شاگردوں کے ماتھے پر کوڑی رکھ کر تلوار سے کاٹ دیتے اور پیٹ پر پان رکھ کر ایسا پٹا لگاتے کہ پان کے برابر سے دو ٹکڑے ہو جاتے۔ کیا مجال جو ماتھے یا پیٹ پر ذرا بھی آنچ آ جائے۔ ساتویں کو بلوچپورے سے شدے اور تاج گنج سے ذوالفقار اور شدے آتے تھے۔ تاج گنج کی چھٹی کی مہندیاں مشہور تھیں۔ نویں کے دن شام تک سارے باجے تاشے سے گشت کرنے والے تعزیے گشت ختم کر دیتے اور دسویں شب میں جتنے تعزیے کہ مرثیے سے اٹھتے تھے وہ گشت کرتے۔ صبح ہر تعزیے پر شہیدی پڑھی جاتی۔ پھولوں کے تعزیے کی شہیدی بڑی مشہور اور پر اثر تھی جسے سننے کے لیے دور دور سے لوگ آتے تھے۔ پھر دس تاریخ کو تمام تعزیے شہر کا گشت کرتے ہوئے کربلا لے جائے جاتے اور دفن کر دیے جاتے۔ سب سے آخر میں جوالا کے علم آتے۔ اسے دیکھتے ہی لوگ سمجھ لیتے کہ اب شہر میں کوئی تعزیہ کربلا جانے کو باقی نہیں رہا۔ یہ علم بھی ایک ہندو کے تھے۔ محرم کے ڈھول تاشے باجے سب ایک ہی مخصوص لے تال سے بجائے جاتے۔ اسے ماتم کہتے تھے۔ سن کر معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ محرم کا ماتمی باجا ہے۔

۱۹۴۶ء سے آگرے کے محرم ختم ہو گئے اور باجے تاشے والے بھی اپنا فن بھول گئے۔ اپنے اپنے مقام پر تعزیے اب بھی رکھے جاتے ہیں مگر مشکل سے سو میں دس۔ فاتحہ، خیرات اور مجلسیں اب بھی ہوتی ہیں مگر بہت کم۔ دس تاریخ کو اب کئی سال سے دس بیس تعزیے کربلا جانے لگے ہیں مگر خاموشی کے ساتھ بقول آسی غازی پوری:

تاسحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

حواشی

۱۔ ساقی یہاں حقہ پلانے کو کہتے تھے۔ جس زمانے میں حقے کا رواج عام تھا تو شارعِ عام اور خصوصاً چوراہوں پر کچھ لوگ کمر کسے گلے میں چمڑے کا تھیلا، تھیلے میں کوئلے تمبا کو لیے اور ہاتھ میں حقہ اُٹھائے کھڑے رہتے تھے۔ جاتے آتے لوگ دور چار دم لگاتے دو چار باتیں کرتے اور کوئی نہ کوئی دو ایک پیسے اُن کے ہاتھ پر رکھ کر چلے جاتے۔ ان میں بعض بوڑھی عورتیں بھی یہ کام کرتی تھیں۔ اُنھیں ساقن کہتے تھے۔ بچپن میں ان لوگوں کو میں نے دیکھا ہے۔

۲۔ ماخوذ از روحِ نظیر۔ مخمور اکبر آبادی۔ ص ۵۶۳
۳۔ گھر سے مراد غالباً قیام گاہ ہے
۴۔ فارسی سے ترجمہ
۵۔ زندگانیِ بے نظیر۔ ص ۱۴۸

آگرے کی ادبی شخصیتیں

یہ ضرور ہے کہ آگرے کے اہلِ ہنر ضرورت سے زیادہ اپنے حال میں مست رہے۔ شاہ جہاں کے آگرے سے جانے کے بعد آگرہ ایک گوشہ ہو کر رہ گیا۔ اور آگرے والے گوشہ نشین۔ میاں نظیر کو نواب واجد علی شاہ نے بلایا تو انھوں نے کہلا بھیجا کہ میں تو وہاں تک جاتا ہوں جہاں تک تاج محل کے مینارے نظر آتے رہتے ہیں۔ ساری عمر لڑکے پڑھا کر گزار دی مگر آگرہ نہ چھوڑا۔ میر اور غالب اگر آگرے سے باہر نہ چلے گئے ہوتے تو شاید یہ مقام حاصل نہ کرتے جو آج انھیں حاصل ہے۔ میاں نظیر کے لڑکے خلیفہ گلزار علی اسیر کئی دیوانوں اور کتابوں کے مصنف تھے، مگر آج خود آگرے کے لوگوں کو اُن کا کوئی شعر یاد نہیں۔ کاشی والے راجہ بلوان سنگھ کا خدا بھلا کرے کہ وہ شاعری میں اسیر کے شاگرد تھے اور زندگی بھر ساٹھ روپے ماہوار انھیں دیتے تھے۔ ایک طرحی مشاعرہ میں 'مہر' اور 'ماہ' جیسے اردو کے نامی شاعر بھی موجود تھے۔ مگر اسیر کی غزل سب سے اچھی رہی اسیر غزل پڑھ چکے تو ایک رئیس نے محفل ہی میں ہتھیلی پر ایک اشرفی رکھ کر اسیر کو پیش کی۔ اسیر نے کہا، ابھی ایک شعر اور باقی ہے، وہ اور سن لیجئے۔

سفلے نے زر ہتھیلی پہ رکھ کر دیا تو کیا
چلتی ہے مٹھی اہلِ کرم کی بندھی ہوئی

میں نے ان اساتذہ کے دیکھنے والوں کو بھی اچھی طرح نہیں دیکھا لیکن سنتا آیا ہوں کہ اسیر اور مہر ماہ کے بعد آگرے میں شاعری کے چار ستون سمجھے جاتے تھے۔ رئیس، واصف، نثار،

اور عالی۔ اب ہمارے ہاتھ میں نہ لوگوں کا کلام ہے نہ ان کی مفصل تاریخ، اعجاز صدیقی نے رسالہ 'شاعر' اور رعنا وہ صبا اکبرآبادی نے ''مشورے کا'' آگرہ نمبر' شائع کر کے یہ احسان کیا کہ آگرے کے اہل قلم کے مختصر حالات یکجا کر دیے۔

آگرے کی ادبی شخصیتوں کا حال مولانا سیماب، خادم علی خاں اخضر یا دلگیر شاہ کو لکھنا چاہیے تھا، کیوں کہ ان لوگوں نے رئیس واصف وغیرہ کو نہ صرف یہ کہ دیکھا ہے بلکہ ان کے سامنے مشاعرے بھی پڑھے ہیں ان کی صحبت میں بیٹھے ہیں۔ مگر اب تو وہ سب لوگ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ خادم علی خاں اخضر کا انتقال تو ابھی سنہ ۶۰ میں پاکستان جا کر ہوا ہے۔ خاں صاحب عجیب آدمی تھے وہ شاعری بھی کرتے تھے تجارت بھی اور لیڈری بھی۔ الیکشن بھی لڑتے تھے اور مشاعرے بھی۔ خود تو میونسپلٹی کی ممبری سے آگے نہ بڑھے مگر کونسل اور اسمبلی کے الیکشن انھوں نے خوب لڑائے۔ ہر طبقے اور ہر طرح کے لوگ ان سے مشورہ لینا ضروری سمجھتے تھے۔ ان کی تجارتی سوجھ بوجھ کا کارنامہ آگرے کی شو مارکیٹ کی تعمیر اور اس کی انجمن کی تنظیم ہے جسے آگرے والے کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ ان کا ادبی کارنامہ تو صرف چند تصنیفوں تک محدود ہے۔ یہ تصنیفیں ان کے کام کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ ایک ایک نشست میں سیکڑوں شعر کہہ ڈالتے تھے۔ آپ جب ان کے مکان پر جائیں گے، اُنھیں شعر لکھتا ہوا پائیں گے مگر خط وہ جناتی کہ خود بھی مشکل سے پڑھتے تھے۔ ہمیشہ ایک ایسے کاتب کی تلاش میں رہے جو اُن کے سامنے بیٹھ کر ان کی غزلیں صاف کر دے۔ دوسروں کو بنانے اور دھجّ اڑانے میں خاں صاحب کا جواب ہی نہ تھا اس کے لیے نہ وقت اور موقع کی قید تھی نہ خلوت وجلوت کی۔ ہنسنا ہنسانا کا محبوب مشغلہ تھا۔ ایک مرتبہ مرزا یاس یگانہ لکھنوی آگرے آئے اور مرزا انجم آفندی کے مہمان ہوئے۔ انجم صاحب نے ان کے اعزاز میں ایک مختصر صحبت منعقد کی۔ فانی، اخضر، دلگیر، مانی، مخمور صاحبان سب ہی جمع تھے۔ باتیں ہو رہی تھیں یگانہ صاحب لکھنو کے شعرا کا ذکر خیر فرما رہے تھے۔ وہ ان سبھی سے خفا تھے۔ فرمانے لگے کہ ایک مشاعرے میں عزیز لکھنوی نے شعر پڑھا:

دل سمجھتا تھا کہ خلوت میں وہ تنہا ہوں گے
میں نے پردے کو جو الٹا تو قیامت دیکھی

میں نے اس طرح داد دی کہ عزیز کہنے لگے آپ نے تو میرا شعر ضائع کر دیا۔ باتیں ختم ہوئیں اور غزل خوانی شروع ہوئی۔ جب یگانہ صاحب کی باری آئی تو انھوں نے مطلع پڑھا۔

پیامِ زیرِ لب ایسا کہ کچھ سنا نہ گیا
اشارہ پاتے ہی انگڑائی لی، رہا نہ گیا

دلگیر شاہ نے ایک چبھتے ہوئے فقرے سے اس شعر کا استقبال کیا۔ان سے یگانہ صاحب سے پہلے سے تعارف بھی تھا اور بے تکلفی بھی۔مگر اخضر صاحب سے آج ہی ملاقات ہوئی تھی۔اخضر صاحب کہنے لگے: واہ! مرزا صاحب۔سبحان اللہ! آپ نے پورا کوک شاستر ایک شعر میں جمع کر دیا ہے۔خدا کی شان کہ اب وہی اخضر صاحب ایسے ہو گئے تھے کہ غیر تو غیر ان کے بعض ناخلف شاگرد محفل میں ان پر فقرے کستے تھے۔خاں صاحب کے دفتر نے گھورے کی شکل اختیار کر لی تھی، ان کے کمرے میں جھاڑو کے نام پر پھونک مار کر بھی کوئی چیز صاف نہ کی جاتی۔میز سے زیادہ کرسیوں پر ضروری اور غیر ضروری کاغذوں کے ڈھیر لگے رہتے۔ان کے کوٹ اور شیروانیاں سال بھر ٹنگے رہتے۔ان میں مکڑیاں جالے تن لیتیں اور چھپکلیاں انڈے دیتی رہتیں، اور ان کو جب ضرورت ہوتی وہ یوں ہی اتا کر زیب تن فرما لیتے۔مخمور صاحب فرمایا کرتے ہیں کہ اخضر آگرے کے مرزا سودا ہیں۔ذرا کسی سے ناخوش ہوئے اور ایک نظم سے اُس کی تواضع کر دی۔وہ نظم ایسی لاجواب ہوتی کہ گھنٹوں میں آم لوگوں کی زبان پر چڑھ جاتی ایک سے ایک اس کی نقلیں مانگتا پھرتا۔اور لوگ انھیں یاد کر لیتے۔سنا ہے اب حیدر آباد سندھ میں اسی ساز و سامان کے ساتھ تشریف فرما ہیں لیکن سب سے زیادہ موزوں شخصیت جس پر لکھا جانا چاہیے وہ ل۔احمد ہیں وہ آگرے کے سب سے بڑے اور اہم نثر نگار ہیں۔ہیں تو وہ ہندوستانی اکبر آبادی اور قریشی برادری کے ایک فرد۔لیکن اپنے مزاج، دماغ اور دوسری خوبیوں کے اعتبار سے ان سب نسبتوں سے بلند اور برتر ہیں۔جس کے اعتبار سے مختصر مگر دل اور دماغ کے اعتبار سے بہت وسیع۔میں نے انھیں شدید سے شدید پریشانیوں میں اتنا مستقل متحمل مزاج پایا ہے کہ اس کا تصور کرنا مشکل ہے۔ان کے چہرے سے ان کی گہرائی اور ان کے دل کی حالت کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ل۔احمد صاحب نے افسانے لکھے ہیں، تجارت کی ہے، دوستوں کی تواضع کی ہے اور سیاست میں حصہ لیا ہے۔افسانے میں ان کی حیثیت ملک میں اور تواضع میں دوستوں میں مسلم ہے۔تجارت میں کبھی کامیاب رہے اور کبھی ناکامیاب، لیکن سیاست میں وہ ہمیشہ ناکام رہے۔سیاست میں میرا مطلب صرف الیکشن بازی سے ہے۔اور یہی ان کے اچھے ہونے کی دلیل ہے، کیوں کہ وہ سب کو اچھا سمجھ لیتے اور سب پر بھروسہ کر لیتے ہیں۔آگرہ جن شخصیتوں پر ہمیشہ ناز کرے گا اُن میں ل۔

احمد کی شخصیت بہت نمایاں رہے گی۔ بقول حضرت سیمابؔ اکبر آبادی: نازش ہے ارضِ تاج کو ذاتِ لطیف پر ان کی تصانیف اور ترجمے بہت ہیں اور ان کے پڑھے بغیر کوئی ان کی قابلیت اور شخصیت کا اندازہ نہیں کرسکتا ملک انھیں صفِ اوّل کے افسانہ نگار کی حیثیت سے جانتا ہے۔ ل۔احمد صاحب کے ذکر کے ساتھ ہی شاہ دلگیر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، کیوں کہ ل۔احمد صاحب، دلگیر شاہ مخمورؔ اور امام اکبر آبادی سب ہم نشین اور ہم مذاق اصحاب میں تھے۔

شاہ دلگیر ایڈیٹر 'نقاد' مرحوم میرے بہت قریب کے رشتہ دار اور ہمسایہ تھے۔ وہ مجھ سے عمر میں بہت بڑے تھے اس لیے مجھے ان کی عمر کا لحاظ کرنا پڑتا تھا۔ مگر وہ اتنے بے تکلف اور خوش باش تھے کہ ان باتوں کی طرف توجہ بھی نہ کرتے۔ تنہائی کی طرح محفلوں میں بھی فقرے کستے اور قہقہے لگاتے۔ ان کے پاس بیٹھ کر وقت بڑا اچھا کٹتا تھا۔ وہ خوش ہونا اور خوش کرنا جانتے تھے۔ شعر اتنا اچھا سمجھتے تھے کہ کوئی کم سمجھے گا۔ اچھے شعر انھیں بہت یاد تھے وہ کسی سے خوش ہوں یا ناخوش مگر اُس کے اچھے شعروں کی داد بڑی فراخ دلی سے دیتے تھے، خفا بھی جلدی ہو جاتے اور معذرت بھی جلدی قبول کر لیتے۔ البتہ اس کے لیے معذرت چاہنے والے کو کبھی کبھی ان کی اور ان کے دوستوں کی دعوت بھی کرنی پڑتی تھی۔ پھر ان کا دل صاف ہو جاتا تھا ایک مرتبہ ہم لوگ متھرا سے ایک شادی میں شریک ہو کر واپس ہو رہے تھے، شہر کے ایک اور بزرگ بھی ساتھ تھے، جنھوں نے متھرا سے پیڑے خریدے تھے۔ شاہ دلگیر نے مجھ سے کہا ان کے پیڑے کھانا چاہئیں، تم ان سے مانگو، یہ تم سے انکار نہیں کریں گے۔ میرے لیے یہ جرأت کسی طرح ممکن نہ تھی میں چپ ہو گیا تو انھوں نے خود ہی بات شروع کی۔ متھرا کے پیڑوں کی تعریف کی پھر ان بزرگ کی تعریف کی اور پھر ایک پیڑا چکھنے کو مانگا، پھر دوسرا اور تیسرا اس طرح کئی پیڑے کھا گئے۔ اس کے لیے انھوں نے خوشامد بھی کی، خدا رسول کا واسطہ بھی دیا۔ ہاتھ اور دامن پھیلا کر کھڑے بھی ہوئے اور زبردستی بھی کی۔ قہقہے لگاتے جاتے اور پیڑے کھاتے جاتے۔ ان کے واقعات اور لطیفے بہت ہیں جو اُن کے خاص دوستوں جیسے نیازؔ فتح پوری، ل۔احمد، مخمورؔ اور مانی صاحبان کو یاد ہیں اور ان کے بیان کرنے کا حق بھی مجھ سے زیادہ انھیں کو ہے۔ دلگیر کہا کرتے تھے شاعر صرف حسن دیکھتا ہے۔ وہ اپنے ہم عصروں کی طرح شاعرانہ قواعد وضوابط کے سختی سے پابند تھے۔ ایک دفعہ میں اپنی ایک غزل پڑھ رہا تھا، جب میں نے یہ شعر پڑھا:

میرے رونے پہ رو دیے وہ بھی
بد گمانی نکل گئی دل کی

تو انھوں نے مجھے ٹوکا۔ کہنے لگے معشوق کا رونا مسلّماتِ شاعری کے خلاف ہے۔ ایسا ہوتا نہیں ہے میں نے کہا۔ مگر میرے ساتھ ایسا ہوا اس لیے مجھے لکھنے کا حق ہے ہنسنے لگے۔ مگر انھوں نے تسلیم نہیں کیا۔ محض اس لیے کہ اب تک کسی شاعر نے نہیں لکھا تھا اردو کی تاریخ میں ان کا نام ایڈیٹر 'نقاد' کی حیثیت سے زندہ رہے گا۔

مولانا سیماب اکبر آبادی ہمارے دور کے وہ تنہا اکبر آبادی شاعر تھے جنھیں آگرے کے باہر سب سے زیادہ لوگ ایک شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ آگرے والوں نے ان کی قدر نہ کی مگر انھوں نے آگرے کا نام زندہ بھی کیا اور روشن بھی۔ مولانا خواہ مخواہ کسی سے نہ الجھتے تھے وہ بہت مہذب اور رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے، مگر جو اُن سے الجھے یا ان کے کمال کے دعوے کو چیلنج کرے تو وہ اسے معاف بھی نہ کرتے تھے۔ وہ سب سے علیحدہ اپنا ایک مرکز بنائے ہوئے ادب کی خدمت میں اس طرح مصروف رہتے، جیسے کوئی عبادت کرتا ہے۔ وہ بڑی پابندی سے مشاعروں میں شریک ہوتے اور ہمیشہ 'طرح' پر غزل کہتے۔ وہ کہا کرتے تھے، میں کسی ایسے طرحی مشاعرے میں شریک نہیں ہوا جہاں میں نے طرح میں غزل نہ پڑھی ہو۔ اس بارے میں وہ ہمیشہ مجھ سے میری شکایت فرمایا کرتے تھے کیونکہ میں ہمیشہ سے مشاعروں نے مجبوری سے ہی شریک ہوتا ہوں۔

سیمابؔ صاحب کے ہنسنے بولنے اور مزاج میں ایک توازن اور رکھ رکھاؤ تھا۔ وہ چھوٹوں سے مہربانی بڑے اور برابر والوں سے تہذیب سے پیش آتے تھے۔ انھوں نے کبھی اپنے سے چھوٹوں کو آگے بڑھانے اور ان کے کام کو سراہنے میں بخیلی اور تنگ دلی سے کام نہیں لیا۔ اور نہ ہم عصروں کے ساتھ ایسا کیا۔ مولانا عمر میں مجھ سے بہت متفاوت تھے مگر انھوں نے کبھی اپنی بزرگی مجھ پر عاید نہ فرمائی ایک روز مجھے انھوں نے کہا آپ اپنا کلام رسالوں میں کیوں نہیں شائع کراتے ،کیا یہ شاعری عاقبت میں کام آئے گی۔ مجھ پر ان کی اس نصیحت کا بہت اثر ہوا اور اس کے بعد سے جب بھی رسالوں کے ایڈیٹر مجھ سے کچھ مانگتے ہیں تو میں انکار نہیں کرتا۔

کسی زمانے میں آگرے میں عید ڈنر کے نام سے عید کی شام کو ایک اجتماع (سمّیلن) ہوتا تھا۔ جس میں شہر کے ہندو مسلم شرفاء کو ایک جگہ جمع ہونے اور مل بیٹھنے کا موقع مل جاتا تھا۔ ایک بار میں دیر سے پہنچا پنڈال بھر چکا تھا اور یہ ناممکن تھا کہ میں سب لوگوں سے مل سکوں اس لیے میں پاس پاس کے دس بیس لوگوں سے مل کر بیٹھ گیا۔ مولانا سیماب ذرا فاصلے پر تھے وہ خود میرے پاس آئے اور یہ شعر پڑھتے ہوئے گلے ملے۔

وہ نہ آئے تو تو ہی چل اے داغؔ
اس میں کیا تیری شان جاتی ہے

مولانا سیمابؔ اس حیثیت سے بھی خوش قسمت تھے کہ انھوں نے بہت سی تصانیف، بے شمار شاگرد اور اعجاز صدیقی ایڈیٹر شاعر بمبئی اور منظر صدیقی ایڈیٹر پرچم کراچی جیسے لائق فرزند اور جاں نشین چھوڑے، جن کی وجہ سے ان کا نام اور کام زندہ ہے۔

فانیؔ بدایونی کا آگرے آنا میرے لیے بہت بابرکت ہوا، وہ میرے پاس اکثر آیا کرتے تھے اور کبھی کبھی میں بھی ان کے یہاں حاضر ہوتا اور ان کی مخصوص ادبی صحبتوں میں شریک ہوتا تھا۔ فانیؔ صاحب کے دوستوں کا حلقہ بہت مخصوص اور محدود تھا ان میں سے ایک مخمورؔ صاحب اکبر آبادی بھی تھے، وہ شاعر بھی ہیں، ادیب بھی، ناقد اور افسانہ نگار بھی اور فانی صاحب کے ہم پیشہ یعنی وکیل بھی چنانچہ ان صحبتوں میں شریک ہونے سے مجھے مخمور صاحب، ل۔ احمد صاحب، مانی صاحب کی مجالست بھی میسّر آ گئی۔ نیاز مندی تو پہلے سے بھی حاصل تھی۔ مخمور صاحب بڑے ذہین اور ذی علم انسان ہیں۔ ان کی بے تکلفی میں بھی ایک خوش نما شائستگی اور مزاح میں بھی متانت ہے۔ ایک روز جوشؔ ملیح آبادی اور مخمورؔ صاحب میرے یہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ صحبت پر لطف بھی تھی اور بے تکلف بھی مخمور صاحب نے جوش صاحب سے کہا۔ آج اپنے دوستوں پر تبصرہ کیجیے۔ میں نے کہا — یہ کیا تبصرہ کریں گے، ان کا حال تو یہ ہے کہ ایک رشتہ دار سے خفا ہو گئے اور نظم لکھ ڈالی سب آگرے والوں پر —

اے رفیقانِ اکبرآبادی
دل وفا کا ہے تم سے فریادی

مخمورؔ صاحب نے پھر اصرار کیا اور جوش صاحب بلبل ہزار داستان کی طرح چہکنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے فانیؔ صاحب کی شامت آئی۔ پھر مانی صاحب اور دوسرے دوستوں پر مہربانی ہوئی اور آخر میں ل۔ احمد پر تان ٹوٹی۔ مخمور صاحب کہنے لگے مجھے اور میکش صاحب کو کیوں چھوڑ دیا۔ جوش صاحب نے ہم دونوں پر بھی نوازش شروع کر دی، مگر بہت نرم اور پر لطف، ایسے لطیفے اکثر مخمور صاحب برپا رکھتے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ ان کی تصنیفوں سے ایک چھوٹی الماری بھری ہوئی دیکھی تھی روحِ نظیر ان کا ایک نہ مٹنے والا کارنامہ ہے۔

ان حضرات کے دور سے پہلے بزرگوں کے میں نے تذکرے ہی سنے ہیں اور ان

میں سے چند کو دیکھا بھی ہے تو بچپن ہی میں دیکھا ہے۔ ان میں مرزا خادم حسین رئیس یہاں کی بڑی اہم شخصیت تھی۔ میں نے ان کا جنازہ ہی دیکھا۔ جنازے پر شامیانہ تنا ہوا تھا اور اسے شہدے اٹھائے ہوئے تھے۔ یہ طریقہ پرانے شیعہ رئیسوں کے یہاں رائج تھا۔ خوش وضع رنگین طبع اور نازک مزاج تھے۔ مرزا صاحب میں جذبۂ اعتراف کم تھا اور وہ دوسرے شعرا کو شاعر بہت کم مانتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں —

اغلاط ہیں کہیں کہیں اغلاق اے رئیس
دیکھے کلام داغ و امیرو جلال کے

جب مشاعرے میں پاؤ پر پاؤ رکھ کر اور تن کر بیٹھ جاتے تھے تو کسی کو آنکھ ملانے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اپنا حقہ کسی کو نہیں پلاتے تھے۔ مشاعروں میں مٹی کا حقہ پیتے تھے۔ دراز قد سفید رنگ، داڑھی صاف، مونچھے بڑی بڑی انگرکھا اور دوپلڑی ٹوپی پہننے کا شوق تھا، پاجامہ اکثر بڑے پانچوں کا پہنتے تھے ظرافت مزاج میں حد سے زیادہ تھی بات بات پر منہ سے گالی نکل جاتی تھی۔ مگر غیر دل شکن ۔ بے حد ملنسار، زندہ دل اور نیک طبیعت انسان تھے۔ عمر بھر شعر کہے اور چھپوانے کے لیے جب کسی نے کہا تو انکار کر دیا۔ ۲۵/ جنوری ۱۹۱۴ء بعارضۂ سل انتقال کیا۔''
(اقتباس از شاعر آگرہ نمبر جون ۳۶ء)

سُنا ہے کہ کسی زمانے میں آگرے میں ایک بڑا مشاعرہ ہوا تھا اس میں داغ دہلوی بھی آئے تھے داغ نے یہ شعر پڑھا:

بڑا مزہ ہو جو محشر میں میں کروں شکوہ
وہ منّتوں سے کہیں چپ رہو خدا کے لیے

مرزا رئیس نے محفل ہی میں انھیں ٹوکا، کہ حضرت محشر میں شکوہ شکایت کا کیا موقع ہوگا، یوں کہنا چاہیے:

بڑا مزہ ہو جو محشر میں میں کروں فریاد

کچھ روز اس سلسلہ میں بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ آخر مرزا داغ نے رئیس صاحب کو لکھا: ''چپ رہو خدا کے لیے'' اور یہ معرکہ ختم ہُوا۔

اسی طرح ایک مرتبہ مشاعرہ ہوا 'طرح' تھی :

پھر رہے ہیں آئینے میں سانپ لہراتے ہوئے۔

دہلی کے آغا شاعر نے ایک شعر پڑھا جس کا دوسرا مصرعہ تھا۔

کاسۂ فغفور دیکھے ٹھوکریں کھاتے ہوئے۔

تو مرزا رئیس نے سرِ مشاعرہ ٹوکا، کاسۂ فغفور کیا۔

یوں کہیے۔

کاسۂ سران کے دیکھے ٹھوکریں کھاتے ہوئے۔

یہ قصے میں نے پرانے لوگوں سے سنے ہیں اک واقعہ خود اپنا بابو پر بھودیال صاحب شاؔم اکبر آبادی سناتے تھے کہ ایک مشاعرے میں میں نے یہ شعر پڑھا:

ہر بنِ مُو شکر کرنے کو بنا گویا زبان

تیری نعمت کا ادا پھر بھی نہ شکرانہ ہوا

مرزا صاحب نے فرمایا کہ کیا مولانا (نثار) کو غزل نہیں دکھائی تھی۔ مولانا نثار بھی موجود تھے۔ اُنھوں نے کہا مجھ سے فروگزاشت ہوگئی ہوگی آپ درست فرمادیں، رئیس صاحب نے کہا اس طرح کہو:

ہر بن مو شکر کرنے کو بنا گویا دہاں

اور اگر زبان ہی کہنا چاہتے ہو تو پھر یوں کہو:

ہر سرِ مو شکر کرنے کو بنا گویا زباں

اسی زمانے میں ایک اور بزرگ تھے ماسٹر سید تصوف حسین 'واصف'۔ یہ بات مشہور ہے کہ وہ آگرے کے سب سے زیادہ نازک خیال شاعر تھے اور وہ خود بھی بہت نازک قسم کے آدمی تھے۔ دبلے پتلے، لمبا قد، اودی مخمل کی ٹوپی خشخشی داڑھی، گورا رنگ، چشمہ لگائے رہتے، زکام کے سدا مریض باتیں بہت جلدی جلدی کرتے، آداب سلام کے بجائے سب سے بندگی کرتے تھے وہ مجھے اس لیے یاد ہیں وہ روزانہ شام کو ہمارے یہاں آتے تھے کوئی اور ہو یہ نہ ہو ہم تو بھائی بچے تھے۔ اکثر کوئی ان سے بات کرنے والا بھی نہ ہوتا مگر اُنھیں اپنا معمول پورا کرنا تھا۔ ان کا آنا میرے والد کے زمانے سے تھا پھر والد صاحب کا انتقال ہوگیا تو چاچا صاحب کے پاس آتے رہے، ان کا بھی انتقال ہوگیا، مگر وہ برابر اپنے وقت پر آتے رہے، ہمارے یہاں ان کے بیٹھنے کی بھی ایک جگہ مقرر تھی۔ اگر کوئی غلطی سے ان کی جگہ بیٹھ جاتا تو وہ واپس ہو جاتے ان کی وضع داری کا ایک قصہ ان کے دوستوں سے سنا ہے، کہ ایک مرتبہ کچھ آزاد منش دھوکے سے انھیں ایک طوائف

کے مکان پر لے گئے ماسٹر صاحب کو معلوم نہ تھا کہ یہ مکان کس کا ہے۔اس زمانے میں ڈیرہ دار طوائفیں شریفوں کی طرح 'اندر پردے کے مکانوں میں رہتی تھیں اور ہما شما ان کے یہاں جا بھی نہیں سکتے تھے۔ ماسٹر صاحب پہنچنے کو تو پہنچ گئے مگر وہاں کسی قسم کی ناگواری ظاہر نہ کی۔وہ وہاں بیٹھے اور پانوں کی تھالی میں دوایک روپیہ ڈال آئے۔اس واقعہ کے بعد سال میں ایک بار وہاں جاتے اور روپیہ اسی طرح دے کر چلے آتے۔ان کا کلام بھی آگرے کے اور شعروں کی طرح ضائع ہوگیا۔ان کی ایک نظم المراج اور ایک تضمین ''تربتِ شاہدِ ناز'' ان کے سامنے ہی شایع ہوئی تھی جواب نایاب ہیں: تضمین کا ایک ابتدائی بند مجھے اب بھی یاد ہے:

اک دن جو سوئے گورِ غریباں ہُوا گزر　　کچھ ڈھیر ٹوٹی قبروں کے آئے مجھے نظر
چادر چڑھائی اشکوں کی میں نے بہ چشمِ تر　　آئی ندا کسی کی کہ اے میرے نوحہ گر
آہستہ برگِ گل بہ فشاں بر مزارِ ما　　بس نازک است شیشۂ دل در کنارِ ما

مولانا نثار علی صاحب نثار کو میں نے اچھی طرح دیکھا ہے، چوگوشیا کڑھی ہوئی ٹوپی، چشمہ لگائے ہوئے نیچا کرتا اور اس پر صدری، گندمی رنگ، شرعی داڑھی آنکھوں میں آشوب کی قسم کا کوئی مرض یہ ان کی وضع قطع تھی۔میرے رشتے کے بھائیوں نے ایک انجمن بنائی تھی جس میں ماہانہ مشاعرہ ہوتا تھا۔چار پانچ ہم چچازاد، پھوپھی زاد بھائی، چار پانچ ہمارے کلاس فیلو بیٹھ جاتے اور الٹی سیدھی غزلیں پڑھتے اور خوش ہولیتے۔اس انجمن میں ایک لڑکا نثار صاحب کا شاگرد ہوگیا۔ وہ کبھی کبھی مولانا نثار صاحب کو بھی ان مشاعروں میں لے آتا، مولانا بڑے خلوص اور قاعدہ سے شریک ہوتے۔اچھے شعروں کی داد دیتے اور آخر میں اپنی غزل سناتے۔کبھی کسی کے شعر پر اعتراض نہ کرتے، نہ اصلاح دیتے، نہ شاگرد بنانے کی کوشش کرتے۔بڑے درویش صفت آدمی تھے۔یہ پہلے مرزا حاتم علی بیگ 'مہر' کے شاگرد تھے۔پھر جب شاہ محمد اکبر داناپوری کے مرید ہوئے تو غزل بھی شاہ صاحب ہی کو دکھانے لگے۔حالانکہ بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ مولانا نثار کا مرتبہ شاعری میں شاہ اکبر سے اونچا ہے۔آگرے اور آگرے سے باہر مولانا کے شاگرد بہت تھے جن میں بے دم شاہ 'وارثی' 'مظہر اکبرآبادی' اور بابو پربھودیال شام نے مولانا کا نام خوب روشن کیا۔ ان میں سے خدا کا شکر ہے کہ شام صاحب زندہ ہیں۔ان کے دم سے مولانا کے نام کے ساتھ اگلی شرافت اور تہذیب بھی زندہ ہے شعر بھی خوب کہتے ہیں اور تحت اللفظ پڑھنے میں دور دور اپنا جواب نہیں رکھتے۔ان کے والد ماسٹر شنکر دیال صاحب آگرے کے نامی وکیل تھے۔عاشق تخلص کرتے تھے اور سنا ہے کہ مرزا غالب کے شاگرد تھے۔شام صاحب کے چھوٹے بھائی بابو کشن دیال آگرے کے بڑے نامی وکیل تھے۔

میرے بچپن میں مشاعرے مولانا نثار صاحب کی سرپرستی میں ہوا کرتے تھے۔ مولانا سیماب، شاہ دلگیر، شام، مظہر، اور فلک صاحب کا طوطی بولتا تھا۔ دلگیر صاحب کے سوا ان سب شاعروں کے شاگردوں کے غول کے غول تھے۔ جو مشاعروں کو سر پر اٹھا لیتے تھے۔ خصوصاً فلک صاحب مرحوم کے شاگرد بہت تھے۔ وہ خود کہا کرتے تھے کہ میرے سو شاگرد ہیں، فلک صاحب مشاعروں میں جاتے تو دولھا بنے ہوئے شاعروں کی برات ساتھ لیے جاتے۔ ان کی زبان سے مصرع نکلا اور جیسے کہرام مچ گیا۔ فلک صاحب کا گشت روزانہ شام کو سیو کے بازار سے کشمیری بازار، مال کے بازار تک لگتا تھا دن کو تو اپنے معمولی لباس میں رہتے لیکن شام کو ہاتھ کی پہاڑی لکڑی کے سوا سارا بانا بدل جاتا۔ کبھی گلابی کبھی نیلی کبھی زرد ریشم کی شیروانی کلابتو کی زرّین گول ٹوپی، گلے میں ہار منہ میں پان پانو میں دلی کی سلیم شاہی ایک ہاتھ میں پہاڑی موٹا ٹھنڈا اور دوسرے ہاتھ کو مومن خاں کی طرح جنبش دیتے ہوئے شعر گنگناتے ہوئے، بازار کے اس سرے سے اس سرے تک بل لگایا کرتے۔ پیچھے پیچھے چار خاص شاگرد حکیم وصی حسن شباب، حکیم بال کشن باغ، شمس اور کاشف وغیرہ باآدب چلتے تھے اور پنی اپنی غزلوں پر اصلاح لیتے جاتے۔ فلک صاحب مرزا رئیس کے شاگرد تھے اور فلک صاحب کے خاص شاگرد میں باغ صاحب تھے۔ ان کا ابھی نومبر ۵۶ میں انتقال ہوا ہے۔ باغ صاحب آگرے کی شاعرانہ روایت کو بڑی خوبی سے سنبھالے ہوئے تھے اور غزل بہت اچھی لکھتے تھے۔

نثار اور واصف کے دور شاعروں میں سب سے زیادہ عمر مرزا عاشق حسین بزم آفندی نے پائی۔ ابھی چند سال ہوئے جب حیدرآباد دکن میں ان کا انتقال ہوا ہے۔ ان کا تعلق دربار رام پور سے تھا۔ مرزا صاحب منیر شکوہ آبادی کے شاگرد تھے۔ ان کی باتیں بے حد دلچسپ تھیں۔ وہ آگرے کے مشہور شاعروں میں سے تھے۔ ان کی زبان سند ہے ان کے صاحبزادے مرزا انجم آفندی ان کے سہی جانشین اور یادگار ہیں۔ شعر وادب میں اپنے والد کی طرح ان کا مقام بھی بہت بلند ہے۔ ایک عرصے سے وہ پرنس معظم جاہ کے ساتھ ان کے استاد کی حیثیت سے رہتے ہیں۔

آگرے کے ادیبوں شاعروں اور مصنفوں کا جب بھی کوئی تذکرہ لکھا جائے گا اس میں حافظ امام الدین اکبرآبادی مفتی انتظام اللہ شہابی، رعنا اکبرآبادی کا ذکر ضروری ہوگا اور ان حضرات کے علاوہ مرزا عظیم بیگ چغتائی مرحوم کی ذات ایسی نہیں ہے جس کا ذکر نہ کیا جائے۔ مرزا چغتائی تحریر میں جتنے شگفتہ اور زندہ دل معلوم ہوتے ہیں بظاہر ایسے نہ تھے، وہ کچھ خاموش اور مرجھائے

ہوئے سے رہتے تھے ایک بات یہ بھی ہے کہ ان کے تایا مرزا ابراہیم بیگ صاحب چغتائی مجھ پر اتنے مہربان تھے کہ جب بھی میں ان لوگوں سے ملنے جاتا وہ اپنے سوا کسی سے بات ہی نہ کرتے۔ ان کی باتیں ختم نہ ہوتیں تھیں، مرزا ابراہیم بیگ صاحب شاعر بھی تھے اور مختلف قسم کی کتابوں کے مصنف بھی ان کی جوانی کی خبر نہیں ہے مگر ان کا سا مقدّس بڑھاپا کم دیکھا۔ بارہ گھنٹے کی نمازیں اور بارہ مہینے کے روزے رکھتے انھیں کو دیکھا۔ ان کے واقعات لطیفوں سے کم نہیں مگر سب سے بڑا مجسّم لطیفہ ان کے خلفِ اکبر مرزا فہیم بیگ چغتائی تھے، وہ اکثر باہر رہتے تھے۔ دو چار دس پندرہ دن کے لیے آگرے آجاتے تھے۔ جتنی دیر بیٹھتے لطیفے سناتے رہتے اور خود نہ ہنستے۔ یہ حضرت آگرے کے تھے مگر بعض حضرات یہاں ایسے بھی تھے جو تھے تو باہر کے مگر ساری عمر ان کی آگرے میں گزری اور آگرے والوں کو انھوں نے بہت کچھ دیا۔ مفتی محمد سعادت اللہ صاحب اسرائیلی ساری عمر مدرسہ عالیہ آگرہ میں مدرس رہے۔ عربی ادب اور حدیث میں ان کا جواب ملنا مشکل ہے۔ فارسی اُردو میں سعدی تخلص فرماتے تھے اور ہم مخصوص طالبِ علموں کے سوا کسی کو شعر نہ سناتے نہ اشعار نقل کرنے دیتے، میں نے جو کچھ دینیات اور معقول پڑھا اس کا بیشتر حصّہ مفتی صاحب سے ہی پڑھا۔ ل۔ احمد صاحب اکبر آبادی نواب فیّاض صاحب امام اکبر آبادی، پنڈت راج ناتھ صاحب کنزور اور ان جیسے بہت سے اصحاب مفتی صاحب کے شاگرد رہے ہیں۔ مفتی صاحب کی خصوصیات لکھنے کے لیے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے اسی طرح مولانا حامد حسن صاحب قادری اور پروفیسر طاہر فاروقی صاحب کے دم سے آگرے کی علمی ادبی محفلیں روشن تھیں یہ دونوں حضرات بھی پاکستانی ہوگئے اور اب بھی آگرہ تو ہے مگر آگرہ معلوم نہیں ہوتا، مکین و مکان بدل گئے زمین و آسمان بدل گئے تہذیب و اخلاق بدل گئے۔ اور اب تو زبان بھی بدلتی معلوم ہو رہی ہے۔ ان چیزوں کا غم کرنے والے بھی کچھ روز میں نہ ہوں گے اور داغِ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی شمع خاموش کا بھی ذکر ہی رہ جائے گا۔

آگرے کے شاعر

دنیا میں آئے اتنی عمر گزر گئی مگر معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کل ہی سے ہوش سنبھالا ہے۔ ہاں جب گزرے ہوئے واقعے یاد آتے ہیں اور ان کی تعداد کا خیال آتا ہے تو اُس وقت ضرور اپنی عمر کا احساس ہوتا ہے اور واقعوں کا حال یہ ہے کہ یاد آتے ہیں تو آتے ہی جاتے ہیں ختم ہونے کا نام نہیں لیتے۔ مصیبتوں کا خیال آتا ہے تو دل کانپ جاتا ہے۔ پتھروں پہ یہ بپتا پڑتی تو پانی ہو جاتے۔ خوشی کے دنوں کی یاد کیجیے تو جو خوشیاں اب چھوٹی چھوٹی معلوم ہوتی ہیں اُس وقت حاصلِ زندگی معلوم ہوتی تھیں۔ جدھر جاؤ اُدھر محبت اور عزّت۔ حُسن کی پوری ایک دنیا، محبت کرنے والوں کے قافلے کے قافلے اہلِ علم و فن کے کارواں در کارواں۔

یہ آگرہ جہاں میں نے آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا، جہاں کے خاک کے ذرّے ذرّے میں مجھے اپنی جوانی اور بچپن مہکتے محسوس ہوتے ہیں۔ اِس آگرے کے لیے مشہور تھا کہ یہاں سات دن اور آٹھ میلے ہوتے ہیں۔ ہندو مسلم اتحاد اور بھائی چارہ ایسا تھا کہ شادی بیاہ میلے ٹھیلے جلسے جلوس سب ملے جُلے ہوتے تھے۔ محرم، رام لیلا تاج محل اور کیلاش کے میلوں میں جتنے ہندو اور اتنے مسلمان۔ پھر اُن میں کیسے کیسے بانکے ترچھے اور صاحبانِ کمال کیا کیا کہیے اور کسے کسے یاد کیجیے۔ آیئے اس وقت کچھ شاعروں کا حال آپ کو سناؤں۔

بچپن میں سب سے پہلے جس شاعر کو میں نے دیکھا وہ سیّد تصوّف حُسین واصف اکبر آبادی تھے۔ میرے والد کے زمانے سے وہ روزانہ شام کو ہمارے یہاں آتے تھے اور مغرب کی

نماز پڑھ کر چلے جاتے تھے۔ آندھی آئے یا مینہہ اُن کا معمول قضا نہ ہوتا۔ والد قبلہ کا وصال ہو گیا۔ کوئی اُن کو خوش آمدید کہنے والا نہ رہا، میں بہت چھوٹا تھا مگر واصف صاحب جب تک زندہ رہے برابر آتے رہے۔ واصف آگرے کے اُن چار شاعروں میں تھے جو آگرے کی شاعری کے ستون سمجھے جاتے تھے۔ اُن کے علاوہ مرزا خادم حسین رئیس تھے جو مجھے یاد نہیں۔ مرزا خادم حسین بڑے ذی علم، حاضر دماغ اور حاضر جواب تھے۔ بڑے بڑے شاعروں کو برسرِ محفل ٹوک دیتے تھے۔ سُنا ہے اُنھوں نے اپنا کلام اسی لیے نہیں چھپوایا کہ لوگ انتقام لیں گے اور اُن کے کلام پر اعتراض کریں گے۔ ان دو کے علاوہ مولانا سیّد نثار علی اور شیخ بزرگ علی عالی یہ دو اور بزرگ تھے۔ افسوس یہ ہے کہ ان میں سے کسی کا دیوان شائع نہ ہوا۔ ان کے شاگرد بہت تھے مگر اب وہ بھی سب ختم ہو چکے۔ اُن کی صف کے ایک اور مشہور شاعر مرزا بزم آفندی تھے جو اِن شاعروں کے بہت دن بعد تک زندہ رہے اور ان کے کئی دیوان شائع ہوئے مگر وہ چوں کہ نواب صاحب رام پور کے مصاحبین میں تھے اور رام پور میں رہتے تھے اس لیے آگرے کی شاعرانہ محفلیں ان کے دم قدم سے محروم رہیں۔ بزم صاحب آخر عمر میں آگرے تشریف لے آئے تھے اور شاعرانہ ہنگاموں سے دور رہتے تھے۔ اُن کے صاحبزادے نجم آفندی حیدر آباد میں مستقل مقیم تھے وہاں سے کراچی چلے گئے اور وہیں اُن کا انتقال ہو گیا۔ اُنھوں نے بھی بڑا نام پیدا کیا۔ ان بزرگوں کے بعد آگرے کی شاعرانہ اور غیر شاعرانہ زندگی میں اہمیت رکھنے والے منشی خادم علی خاں اخضر تھے۔ اُنھوں نے ہزاروں غزلیں کہیں اور ساری عمر ایسے کاتب کی تلاش میں رہے جو اُن کا کلام صاف کر دے اور وہ اُسے شائع کرا لیں۔ خاں صاحب خوب آدمی تھے وہ شاعری بھی کرتے تھے، تجارت اور لیڈری بھی۔ الیکشن بھی لڑاتے تھے اور شاعروں کو بھی۔ خود میونسپلٹی کی ممبری سے آگے نہ بڑھے مگر دوسروں کے کونسل اور اسمبلی کے الیکشن اُنھوں نے خوب لڑائے ہر طبقے اور ہر قسم کے لوگ اُن سے مشورہ کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ اُن کی تجارتی سوجھ بوجھ کا کارنامہ آگرے کی شو مارکیٹ کی تعمیر اور اس کی انجمن کی تنظیم ہے جسے آگرے والے کبھی بھول نہیں سکتے۔ اُن کے شاعرانہ کارنامے ہمارے ہاتھ میں نہیں ہیں مگر وہ ایک نشست میں سیکڑوں شعر کہہ ڈالتے۔ آپ جب اُن کے مکان پر جائیں گے اُنھیں شعر کہتا ہوا یا باتیں کرتا ہوا دیکھیں گے۔ دوسروں پر فقرے کسنے اور بیوقوف بنانے میں اُنھیں لُطف آتا تھا۔ اس کے لیے نہ وقت اور موقع کی قید تھی نہ محفل اور تنہائی کی۔ ہنسنا ہنسانا اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ خدا کی شان وہی خاں صاحب اب ایسے ہو گئے تھے کہ غیر تو غیر اُن کے بعض نالائق شاگرد اُن پر ہنستے تھے۔ خاں صاحب کے دفتر نے گھورے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اُن کے کمرے میں کوئی جھاڑو نہیں دے سکتا تھا کیوں کہ اُن کی میز پر اور میز سے زیادہ کرسیوں پر ضروری اور غیر ضروری کاغذ جمع رہتے۔ اُن کے کوٹ اور شیروانیاں سال بھر تک دفتر میں ٹنگی رہتیں۔ اُن میں مکڑیاں جالے بُن لیتیں، چھپکلیاں انڈے دے دیتیں اور خاں صاحب کو جب ضرورت ہوتی

بغیر جھاڑے اُنھیں پہن لیتے۔ مخمور صاحب کہا کرتے کہ اخضر آگرے کے مرزا سودا ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ ہجو کہنے میں اُن کا جواب نہ تھا۔ ذرا کسی سے ناخوش ہوئے اور ایک نظم سے اُس کی خاطر کردی اور وہ نظم ایسی کہ گھنٹوں میں لوگوں کی زبانوں پر چڑھ جاتی۔ ایک سے ایک اُس کی نقلیں مانگتا پھرتا اور دوسروں کو سُناتا پھرتا۔ آخری عمر میں خاں صاحب پاکستان چلے گئے اور وہیں کی خاک کے پیوند ہوگئے۔ اُن کی غزلیں اُن کی نظمیں اُن کے فقرے اور اُن کی محفلیں سب خواب وخیال ہوگئے۔ اسی صف کے ایک بزرگ سیّد نظام الدین شاہ دلگیر ایڈیٹر نقاد تھے۔ نقاد اپنے زمانے کا چوٹی کا ماہنامہ تھا۔ سچ پوچھیے تو نیاز فتح پوری، ل۔ احمد، مانی جائسی، مخمور اکبرآبادی، ضیاء عباس ہاشمی اور بہت سے اہلِ قلم حضرات کو نقاد ہی نے رُوشناس کرایا۔ دلگیر ایک صوفی منش شاعر اور صوفی خاندان کے فرد تھے مگر وہ طبعاً بے تکلف سادہ مزاج اور خوش باش انسان تھے۔ تنہائی اور محفل اُن کے لیے یکساں تھی۔ وہ اخضر سیماب وغیرہ کی صف کے شاعر اور ان کے بے تکلّف دوستوں میں تھے۔ شعر اس طرح پڑھتے کہ محفل پر چھا جاتے۔ جو شعر اُن کو پسند آتا وہ موافق کا ہو یا مخالف کا بے ساختہ داد دیتے تھے۔ شعر اتنا اچھا سمجھتے تھے کہ کم کوئی سمجھے گا۔ اچھے شعر اُنھیں بے شمار یاد تھے۔ وہ خفا بھی جلدی ہو جاتے اور خوش بھی جلدی ہو جاتے لیکن معذرت کرنے والوں کو اُن کی اور اُن کے دوستوں کی دعورت کرنا پڑتی تھی۔ اِن ہی حضرات کے ساتھیوں میں علاّمہ سیماب اکبرآبادی تھے۔ جنھوں نے آگرے کے شاعروں میں سب سے زیادہ نام پیدا کیا، سب سے زیادہ کام کیا اور اپنی بہترین یادگاریں اور وارث چھوڑے۔ میرا مطلب اعجاز صدّیقی ایڈیٹر شاعر سے ہے جو علاّمہ کے صحیح جانشین ہیں۔ ان کے علاوہ ہندوستان پاکستان میں علاّمہ سیماب کے ہزاروں شاگرد ہیں جن میں بہت سے خود استاد کا درجہ حاصل کیے ہوئے ہیں۔ آگرے والوں نے ان کی قدر نہ کی مگر اُنھوں نے آگرے کا نام ایسا روشن کیا جو ہمیشہ روشن رہے گا۔ وہ سب سے علاحدہ اپنا ایک مرکز بنائے ہوئے رات دن ادب کی خدمت میں اس طرح مصروف رہتے جیسے کوئی عبادت کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ مشاعروں میں شرکت کرتے اور طرح پر غزل کہتے اور دوسروں کو بھی طرح پر غزل کہنے کی تاکید کرتے۔ سیماب صاحب کے ہنسنے بولنے اور ظرافت میں ایک بھاری بھرکم پن اور شائستگی تھی۔ وہ چھوٹے بڑے سب سے حسبِ مراتب سے پیش آتے تھے اُنھوں نے کبھی چھوٹوں کو آگے بڑھانے میں تنگ دلی سے کام نہیں لیا۔ آخر عمر میں وہ مجبوراً پاکستان چلے گئے اور وہیں اُن کا انتقال ہوگیا۔ ان شاعروں میں ایک فلک اکبرآبادی بھی تھے۔ یہ مرزا خادم حسین رئیس کے شاگرد تھے مگر خود ان کے سو کے قریب شاگرد ہوئے۔ جس مشاعرے میں جاتے ایک محفل جم جاتی اور جہاں سے اُٹھتے محفل خالی ہو جاتی۔ اِن کی زبان سے مصرعہ نکلا اور ایک شور مچ گیا۔ میرا مکان آگرے کے ایسے بازار میں ہے جہاں سے ہر ہنگامہ گزرتا رہتا ہے۔ قومی لیڈروں کا جلوس ہو یا شادی بیاہ کے ہنگامے، پولیس کا لاٹھی چارج ہو یا آپس کا میدانِ کارزار سب کے لیے یہی بازار موزوں

سمجھا جاتا ہے۔ایک زمانہ تھا کہ شام ہوئی اور شوقین بن سنور کے گشت لگانے نکلے۔ چنانچہ فلک صاحب کی آماجگاہ یہی بازار تھا۔ وہ میونسپلٹی کی کسی چوکی پر ملازم تھے، دن کو ان کی پوشاک ایک فیلٹ کیپ، ایک خاکی کوٹ، فل بوٹ جوتا اور ایک پہاڑی ڈنڈا ہوتی تھی مگر شام کو وہ جب اس بازار میں آتے تو کلابتو کی ایک گول ٹوپی۔ ریشم کی گلابی یا زرد شیروانی ہاتھ میں کنٹھا پہنے ہوئے۔ سر سے پاؤں تک ساری پوشاک بدل جاتی تھی سوائے پہاڑی ڈنڈے کے۔ ڈنڈا بھی اگر بدل جاتا تو پھر اُن کا پہچاننا مشکل ہو جاتا۔ چار پانچ شاگرد ان کے پیچھے پیچھے حضور سرکار کہتے ہوئے ساتھ ہوتے۔ فلک صاحب اُن کے شعر سُنتے جاتے اصلاح دیتے جاتے اور چلتے جاتے ان کے ایک شاگرد حکیم بالکشن باغ تھے وہ فخر یہ یہ کہا کرتے کہ کاشمیری پنڈتوں اور کایستھوں میں تو اُردو شاعر ہوئے ہیں مگر بنیوں میں میرے سوا کوئی شاعر نہیں ہوا۔ جب کہیں مشاعرہ ہوتا تو ہفتوں پہلے ہر گروہ میں ہلچل مچ جاتی، غزلیں تیار ہو رہی ہیں، اصلاحیں دی جارہی ہیں۔ ہر جگہ یہی ذکر ہو رہا ہے اور مشاعرے کے دن ایسے بن سنور کے اور تیاری سے جاتے جیسے کوئی بڑا معرکہ سر کرنے جا رہے ہیں۔

ان سب میں ایک ناقابلِ فراموش شخصیت مخمور اکبر آبادی کی ہے۔ وہ عالم اور دانشور بھی ہیں۔ ناقد اور افسانہ نگار بھی اور شاعر بھی۔ مخمور صاحب ایک عالم اور ذہین انسان ہیں۔ آگرے کی نفاست، شرافت اور اعلیٰ تہذیب کا نمونہ اُن کی ذات ہے۔ جب ہمارے ساتھ فانی ماَئی ل۔ احمد جوش اور مخمور صاحب بیٹھا کرتے تھے۔ اُس وقت اُن کی ذہانت اور علم کے جوہر کھلتے تھے۔ ''روحِ نظیر'' اُن کا ایک غیر فانی کارنامہ ہے۔ ان کی تصانیف بہت ہیں اب وہ پاکستان میں ہیں اور وہاں ایک سے بہتر ایک ان کی کتاب منظرِ عام پر آرہی ہے۔ آگرے کی ان پُرانی صحبتوں کی یادگار ایک آخری شمع ل۔ احمد صاحب رہ گئے ہیں جو مشہور اور صاحبِ طرز افسانہ نویس ہیں۔ وہ خود شاعر تو نہیں ہیں مگر شاعروں کی پوری ایک انجمن اُن کے گرد رہا کرتی تھی جس میں جوش ملیح آبادی کی ایک نمایاں شخصیت ہے۔ نیاز فتح پوری اور اُن کے رسالے ''نگار'' کو منظرِ عام پر لانے میں ل۔ احمد کا بہت ہاتھ رہا ہے۔ ان کی تصنیفیں بہت ہیں اور اپنی بیماری اور پیرانہ سری کے باوجود وہ اب تک لکھتے رہتے ہیں۔

آگرے کے دو نامی شاعر رعنا اور صبا ہیں جو میرے ہم عمر بھی ہیں اور شاعری کے ساتھی بھی۔ یہ دونوں پاکستان میں آگرے کا نام روشن کیے ہوئے ہیں۔ وہاں شاعرانہ اعتبار سے اُن کی بڑی عزت ہے۔ ان کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان دونوں کے جانے سے آگرے کی ادبی زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی۔ مولانا سیماب کے بعد ان ہی کے دم سے یہاں کی محفلوں میں رونق تھی شعر شاعری کا چرچا تھا۔ اب پاکستان میں مخمور صاحب ہیں صبا ہیں، رعنا ہیں محفلیں ہیں مشاعرے ہیں آگرے کا نام بھی ہے مگر وہاں آگرہ نہیں ہے۔

تاج محل اور اس کے معمار

تعمیر میں کتنا عرصہ لگا

اس عمارت کی تعمیر میں جو زمانہ صرف ہوا اس میں مورخین کا اختلاف ہے لیکن کتبوں وغیرہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بیس سال سے کم مدت میں یہ عمارت تکمیل کو نہیں پہنچی۔ کیوں کہ ممتاز الزمانی کا ذیقعدہ ۱۰۴۰ھ میں انتقال ہوا اور اس عمارت کی تعمیر جمادی الاوّل ۱۰۴۱ھ (۱۶۳۱ء) میں شروع ہوگئی۔ کتبوں کی مختلف تاریخوں سے، جو روضہ تاج محل میں مختلف مقامات پر درج ہیں، پتہ چلتا ہے کہ سب سے اخیر کتبہ صدر دروازے کا ہے جس پر ۱۰۵۷ھ (۱۶۴۷ء) درج ہے اس حساب سے کل زمانہ تعمیر ۱۷ سال ہوا۔ لیکن صدر دروازے کے اختتام کے بعد بھی یہ عمارت دو تین سال تک برابر بنتی رہی۔ اس خیال سے یہ عمارت بیس سال سے کم میں تعمیر نہیں ہوئی[1]۔

ٹیور ینیر صاحب تحریر کرتے ہیں کہ یہ عمارت ۲۲ سال میں تیار ہوئی۔ ممتاز محل کی رحلت کے بائیسویں سال ۱۶۵۳ء ٹیور ینیر ہندستان میں موجود تھا اور جنوری ۱۶۵۴ء کو ہند سے ولایت کو روانہ ہوا۔ بدیں وجہ ٹیور ینیر کا مقولہ صحیح معلوم ہوتا ہے[2]۔ لیکن بادشاہ نامہ مؤلفہ عبدالحمید لاہوری میں مدتِ تعمیر صرف دوازدہ سال درج ہے۔ اس سے قیاس کیا جاتا ہے کہ غالباً صاحبِ بادشاہ نامہ کی مراد صرف اصلی روضہ کی تعمیر سے ہے جو سنگِ مرمر کا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بارہ سال تک بمصداق بادشاہ نامہ میر عبدالکریم و مکرمت خان کے اہتمام سے مسلسل تعمیر رہی ہو بعدہٗ کچھ عملہ تخفیف ہوگیا ہو اور دیگر حصص دس سال آئندہ تک بنتے رہے ہوں۔ بہر حال روضہ ممتاز محل، جلوخانہ

، مقابر ستی النساء خانم وسرہندی بیگم وممتاز آباد ومسجد فتحپوری ومقبرہ سہیلیاں کی تعمیر کسی طرح بیس سال سے کم میں نہیں ہوئی[۴۳]

صاحبِ معین الآثار نے بادشاہ نامے کے حوالے سے لکھا ہے کہ ۱۰۴۲ھ (۱۶۳۲ء) میں سونے کا ایک کٹہرا بنوایا گیا تھا جس میں گراں بہا جواہرات جڑے ہوئے تھے اور جو ممتاز محل کی قبر کے گرد لگا ہوا تھا۔ یہ کٹہرا بے بدل خاں مہتمم خاصہ شریف کے اہتمام سے بنا تھا۔ اس میں چالیس تولہ سونا صرف ہوا تھا اور پورے کٹہرے کی لاگت چھ لاکھ روپیہ کی تھی۔ مقبرے کے اندر ہمیشہ اعلیٰ درجے کے ایرانی اور قسطنطنیہ کے قالین بچھے رہتے تھے اور خوب صورت اور بیش قیمت جھاڑ فانوس قندیلیں اور شمع دان روشن ہوتے تھے ۱۰۵۲ھ (۱۶۴۲ء) میں یہ زرّیں کٹہرا اٹھالیا گیا اور اس کے بجائے سنگِ مرمر کا مجر لگایا گیا جواب تک موجود ہے۔ مصنّف بادشاہ نامے کے بقول یہ مجر دس سال میں تیار ہوا تھا اور پچاس ہزار روپیہ اس میں صرف ہوا تھا۔ اس مجر میں ایک دروازہ سنگ یشب کا تھا جس میں دس ہزار روپیہ صرف ہوا تھا۔

تاج کے مصارف کے لیے اوقاف

روضہ تاج محل کے مصارف کے لیے شاہ جہان نے تیس مواضعات وقف کیے تھے جن کی سالانہ آمدنی ایک لاکھ روپیہ تھی۔ مگر زوالِ سلطنت کے ساتھ ان مواضعات پر بھی دوسروں کا قبضہ ہوگیا اور گورنمنٹ برطانیہ نے بھی اس طرف توجہ نہ کی۔ شاہجہاں کے مورخ ملا عبدالحمید لاہوری نے شاہجہاں کے حکم سے اس کی تفصیل بادشاہ نامے میں بیان کی ہے جو درج کی جاتی ہے۔ یہ مواضعات پرگنہ حویلی دارالخلافہ اکبرآباد اور نگر چند کے مضافات میں تھے۔

نمبر شمار	نام موضع	سالانہ جمع
۱۔	دھنوئی بزرگ (دھنوئی)	آٹھ ہزار روپیہ
۲۔	ادہالی	سات ہزار پانسو روپیہ
۳۔	رمائی	سات ہزار پانسو روپیہ
۴۔	ککہتلا (گوتلا)	چھ ہزار دو سو پچاس روپیہ
۵۔	دہمسری	چھ ہزار روپیہ
۶۔	وکہروتا (وگروتہ)	پانچ ہزار روپیہ
۷۔	ساموِن (سیامون)	پانچ ہزار روپیہ
۸۔	بودھانا (بوڑھانہ)	چار ہزار دو سو پچاس روپیہ
۹۔	پتھولی	چار ہزار روپیہ
۱۰۔	تہیری (ٹھیری)	چار ہزار روپیہ

نمبر شمار	نام موضع	سالانہ جمع
۱۱۔	اتورہ (اٹورہ)	تین ہزار سات سو پچاس روپیہ
۱۲۔	لمہہ پورہ (لمپورہ)	تین ہزار پانچسو روپیہ
۱۳۔	لراونڈہ	تین ہزار روپیہ
۱۴۔	جوینی	تین ہزار روپیہ
۱۵۔	چاروا خورد	دو ہزار پانسو روپیہ
۱۶۔	اونچا	دو ہزار پانسو روپیہ
۱۷۔	کرمنا	دو ہزار پانسو روپیہ
۱۸۔	ویتھورا	دو ہزار پانسو روپیہ
۱۹۔	اتوس	دو ہزار پانسو روپیہ
۲۰۔	اوسرا	دو ہزار روپیہ
۲۱۔	سدہربن	دو ہزار روپیہ
۲۲۔	بچپری (بچپوری)	ایک ہزار پانسو روپیہ
۲۳۔	بسئی بزرگ	ایک ہزار پانسو روپیہ
۲۴۔	مدینہ	ایک ہزار پانسو روپیہ
۲۵۔	دھاندوپورہ	ایک ہزار پانسو روپیہ
۲۶۔	شیخ پور	ایک ہزار دو سو پچاس روپیہ
۲۷۔	ستھندی	ایک ہزار روپیہ
۲۸۔	رائے پور	ایک ہزار روپیہ
۲۹۔	نور پورا	سات سو پچاس روپیہ
۳۰۔	نگر چند	تین ہزار روپیہ

اس ایک لاکھ روپیہ سالانہ کے علاوہ ایک لاکھ روپیہ سالانہ بابت محصول بازاروں اور دوکانوں اور سراؤں کے محاصل سے مقرر تھا۔ اوقاف کی مذکورہ بالا تفصیل لکھنے کے بعد بادشاہ نامہ میں لکھا ہے:

"اگر کبھی اتفاقاً ضرورت پڑ جائے تو اس اوقاف کی آمدنی سے بقدرِ حاجت اس روضے کی مرمّت میں صرف کیا جائے اور باقی مصارف مقررہ میں، جن کو سالانہ و ماہانہ ملتا ہے، اور جو طعام پختہ و نان اس روضے کے قرآن خوان اور خدمت گزاروں اور دوسرے محتاجوں اور تنگ

دستوں کے لیے مقرر ہے، صرف ہوتا ہے اور جو زیادہ حاصل ہو تو اس میں بادشاہِ وقت جس کے ذمے اس مکان والاشان کی تولیت ہے جس طرح مناسب سمجھے عمل میں لائے''۔

تاج اور قطب مینار

اس موقع پر یہ بے محل بات شاید تعجب سے سنی جائے کہ تاج کی بلندی قطب مینار سے زیادہ ہے۔ معین الآثار کے مصنف نے لکھا ہے کہ قطب مینار کے پانچوں حصوں کی بلندی ۲۳۸ فٹ ہے اور تاج کے درمیانی گنبد کی بلندی صحنِ باغ سے کلس کی چوٹی تک ½ ۲۴۵ فٹ ہے۔ سنگِ مرمر کے فرش سے اس در کی پیشانی کے کنگورے جس کے اندر مقبرے میں داخل ہوتے ہیں ¼ ۲۹ بلند ہے

تاج کی تعمیر میں کتنا خرچ ہوا

کل عمارات روضہ ممتاز محل و دیگر حصص متعلقہ کا تذکرہ قلم بند کرنے کے بعد ملا عبدالحمید لاہوری تحریر فرماتے ہیں:

''خرچ تمامی عماراتے کہ بہ تفصیل نگارش یافت و در مدت دوازدہ سال بہ سرکاری مکرمت خان و میر عبدالکریم صورت تمامیت گرفتہ پنجاہ لک روپیہ است''[5]

یہ عبارت لکھ کر صاحبِ معین الآثار لکھتے ہیں کہ یہ بات قیاس سے صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ اس کی تعمیر میں پچاس لاکھ روپیہ خرچ ہوا ہو بلکہ حقیقتِ حال یہ ہے کہ ان عمارات کے جو اخراجات بیان کیے گئے ہیں وہ صرف معماروں، مزدوروں اور معمولی مسالوں کی بابت ہیں۔ لکڑی پتھر اور جواہرات خزانۂ عامرہ سے دیے گئے یا تحفے میں آئے۔ پچاس لاکھ تو محض مزدوروں کی اجرت قیاس کرنا چاہیے۔ ہمیں ایک قلمی کتاب نہایت کوشش اور تلاش سے دستیاب ہوئی ہے جس میں رودرداس خزانچی نے آنہ پائی کا حساب درج کیا ہے اور ہر جزو کی لاگت و مصارف تحریر کر کے میزان کل ۴۱۸۴۸۸۲۶ روپیہ ۷۔ آنہ ۶ پائی رقم کی ہے لیکن اس صرفہ میں دیگر عماراتِ متعلقہ روضہ کو بھی شامل کر لیا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے ہیں کہ تخمینہ مصارف کہاں تک صحیح ہے۔ بہر حال ہم ناظرین کی معلومات و دلچسپی کی غرض سے بعض حصّوں کی لاگت ذیل میں درج کرتے ہیں:

دفتر خانہ بادشاہی سے صرف ہوا۔	۹۷۵۵۹۲۶ روپیہ ۔۰۳
باقی جو خزانہ عامرہ سائر صوبہ اکبر آباد سے دیا گیا۔	۵۳۶۱۱۱۶ روپیہ ۷
مسجد معہ حوض و صحن و کلسی ہائے۔	۸۲۵۸۳۱ روپیہ ۷
روضۂ ممتاز محل معہ ہر چہار مینار و کرسی روضہ منورہ وغیرہ۔	۵۱۷۷۶۷۴ روپیہ ۷
تعویذ ہائے سنگ رخام مع پچکاری۔	۵۵۸۱۱ روپیہ ۲

روضۂ ممتاز محل مقدسہ وغیرہ۔ ۱۳۵۹۶۱ روپیہ ۱۰/

تعویذ قبر حضرت شاہجہان بادشاہ غازی فردوس آشیانی صاحب قران ثانی ۱۹۷۹۴ روپیہ ۴/

تعویذ قبر ممتاز محل اکبر ثانی ارجمند بانو بیگم۔ ۴۵۶۲۲ روپیہ ۴/

تعویذ ہائے بالا اندرون گنبد کلاں درمیان مجر۔ ۵۶۱۵۲ روپیہ ۱۰/

سردابہ (تہہ خانہ) ۲۲۹۹۰ روپیہ ۱۰/

اندرون تہ خانہ مرقد معہ تعویذ بادشاہ عالی جاہ شاہجہاں۔ ۱۹۶۹۱ روپیہ ۹/

یک جفت کواڑ سنگ یشب معہ جواہرات وپچہ کاری برائے دروازہ ۲۱۴۸۲ روپیہ ۱۰/

مجر حجرہ جالی یک جفت نقرہ و یک جفت طلائی برائے تہہ خانہ۔ ۴۵۶۸۷ روپیہ ۴/

جھجری سنگ مرمر یعنی جالی مجر معہ پچہ کاری۔ ۴۶۸۸۵۵ روپیہ ۲/

کواڑ چوب صندل در آئینہ محل۔ ۴۵۲۴۵ روپیہ ۶/

کواڑ چوب صندل در آئینہ محل۔ ۴۵۲۴۵ روپیہ ۶/

کواڑ برنجی برائے مینار ہائے روضہ ممتاز محل در یک مینار سہ جفت و یک جفت
درزینہ آمد و رفت بالائے چھتری محراب۔ ۲۵۹۳۷ روپیہ ۳/

کواڑ ہائے چوب آبنوس یک جفت در آئینہ محل۔ ۴۵۴۱۸ روپیہ ۱۰/

زنجیر ہائے برنجی۔ ۷۵۲۱۵ روپیہ ۴/

جماعت خانہ معہ حوض و صحن وکلسہائے۔ ۸۴۵۶۱۵ روپیہ ۶/

بروج مشرق رویہ کنارۂ دریائے جمن معہ ایوان ہائے طرف حویلی آگاہ خاں ۱۴۵۵۰۵ روپیہ ۶/

بروج مغرب رویہ کنارہ دریائے جمن معہ ایوان ہائے طرف گھاٹ بسئی ۱۶۵۵۴۲۷ روپیہ ۶/

بروج مغرب رویہ باؤلی مع ایوان ہائے سنگ سُرخ ۱۴۲۵۱۰ روپیہ ۲/

برج میانہ یعنی میانہ محل شاہ نشین معہ مکان ایوان ہائے۔ ۱۱۳۹۱۸ روپیہ ۱۴/

برج جانب مشرق معہ لعل دروازہ۔ ۱۴۵۵۴۵ روپیہ ۱۲/

برج جانب غرب وجنوب مع لعل دروازہ ۱۸۲۶۳۹ روپیہ ۱۱/

دیوار باغ روضہ ممتاز محل جانبِ مشرق ۵۲۶۷۵ روپیہ ۱۳/

دیوار باغ روضہ جانبِ مغرب ۵۸۷۷۷ روپیہ ۱۳/

دیوار باغ روضہ جانبِ جنوب ۸۷۸۸۵ روپیہ ۱۲/

دیوار باغ روضہ ممتاز محل جانبِ شمال طرف دریائے جمن۔ ۱۲۲۲۱۲ روپیہ ۲/

ایوان کلاں لعل دروازہ جانبِ مشرق وجنوب۔ ۱۹۶۳۵ روپیہ ۸/

ایوان کلاں لعل دروازہ جانب مغرب وجنوب۔ ۱۳۶۷۳ روپیہ ۱۰/

خیابان باغ روضہ معہ حوض کلاں سنگِ مرمر۔۳	۵۳۶۵روپیہ۱۴/
جلوخانہ وغیرہ	۵۵۴۲۴روپیہ۱۵/
کٹرہ ہائے بیرونی	۴۲۱۱۴روپیہ۱۱/
گاؤخانہ وغیرہ	۲۱۹۱۵روپیہ۱۰/
فیل خانہ وغیرہ	۱۴۹۱۵اوپیہ۱۱/
مسافرخانہ	۱۵۲۲۴روپیہ۱۰/
شترخانہ	۱۱۱۲۲روپیہ۱/
پالکی خانہ بادشاہ	۷۷۶۱۸روپیہ۲/
کٹرہ پالکی خانہ ممتاز محل	۲۵۴۵۵روپیہ۱/
تعویذ چوب صندل معہ صندوق	۴۱۵۲روپیہ۳/
بازار مشرق رویہ	۱۱۲۳۷روپیہ۲/
بازار مغرب رویہ	۱۲۲۱۲روپیہ۶/
دروازہ مشرق رویہ	۵۴۲۸۰روپیہ۲/
دروازہ مغرب رویہ	۷۴۶۰۵روپیہ۱۳/
دروازہ جنوب رویہ	۱۱۲۸۱روپیہ۲/
کلید خانہ	۱۸۹۱۵روپیہ۲/
خواص پورہ بیرون مشرق رویہ	۱۳۹۱۷روپیہ۲/
خواص پورہ جانب جنوب	۱۶۱۰۵روپیہ۵/
خواص پورہ بیرون جانب شمال	۴۵۱۰۵روپیہ۱۰/
ماہانہ داران وغیرہ	۵۶۵۱۳روپیہ۶/
عملہ پچیکاری	۱۳۶۲۷۷روپیہ۹/
عملہ سنگ تراشان	۱۲۹۷۳۶روپیہ۹/
عملہ سنگ برآئینہ ہا	۱۲۹۸۶۶روپیہ۱۰/
گنبد برنجی کلس یعنی گنبد کلاں یک عدد وزن ۲۲ من	۱۳۶۸۸روپیہ ۶ ے/

تاج کے معمار

تاج کی تعمیر ابتدا سے انتہا تک خالص ایشیائی صنعت کا شہکار ہے لیکن کلکتہ اسکول آف آرٹ کے پرنسپل مسٹر ہیول کی رائے میں تاج کا کاریگر وینس کا باشندہ جیرونیمو ویرونیو ہے جو کسی پرتگالی جہاز کے ذریعے ہندستان آگیا تھا۔ مسٹر ہیول کے علاوہ بھی کسی یورپی مورّخ نے ویرونیو کا ذکر کیا

ہے اور پچی کاری کے بارے میں بھی ایک فرانسیسی کاریگر اوسٹنڈی بورڈ و سے مشورہ طلب کرنا بتایا ہے لیکن یہ قیاسات تاج کی تاریخ اور عقل وقیاس سے غلط ثابت ہوتے ہیں اور خود یورپین محققین نے ان قیاسات کو دلائل کے ساتھ غلط ثابت کیا ہے۔ے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تاج کے صناع زیادہ تر ہندستان ہی کے باشندے ہیں جن میں ہندو مسلمان سب شامل ہیں اور تاج کا ڈیزائن بھی ایسا نہیں ہے جو تاج سے پہلے کی ہندستانی عمارتوں کا نہ ہو جس کی زندہ شہادت دہلی میں ہمایوں کا مقبرہ ہے۔ اسی طرح یورپین محققین نے اس دعوے کو بھی لغو سمجھا ہے کہ پچی کاری میں کسی فرانسیسی سے مشورہ کیا گیا تھا۔ فرانسیسی محقق ڈاکٹر لی بان نے لکھا ہے کہ پچی کاری عربوں کی ایجاد ہے اس کے علاوہ مسجد عمر جامع دمشق قصر الحمرا اور مسجد قرطبہ وغیرہ میں پچی کاری کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں اور خود اکبر اور اعتماد الدولہ کے مقبروں میں پچی کاری اور منبت کاری، مرصع کاری اور مینا کاری کے اعلیٰ نمونے دیکھنے میں آتے ہیں۔ جارج برڈ ووڈ ''دی جرنل آف انڈین آرٹ'' میں تحریر کرتے ہیں کہ پچی کاری مشرقی ایجاد ہے اور بجز اسلامی سلطنت کے کبھی مغرب میں اشاعت پذیر نہیں ہوئی'' اب تاج کے سامانِ تعمیر اور معماروں کی فہرست درج کی جاتی ہے:

پارہائے سنگ قیمتی معہ مقام برآمد

نام	مقام	تعداد
عقیق	بغداد	۵۴۰
فیروزہ	تبت کلاں	۶۷۰
مونگا	دریائے شور	۱۴۲
لاجورد	لنکا	۲۴۲
سلیمانی	جنوب	۵۵۹
پتونیہ	نامعلوم	۴۵۹
طلائی	نامعلوم	بے شمار
موسی	جہاڑی	۱۰۷۵
عجوبہ	سورت	بے شمار
ریگ	چنبل	۲۷
رخام	مکرانہ	بے شمار
نخود	سبلگڑھ	۸۲
مقناطیس	گوالیار	۷۷
بانسی	نامعلوم	۳۷

گلابی	نامعلوم	۷۶
جدوار	نامعلوم	۹۵
یشب	کھماج	۵۴
نیلم	نامعلوم	۷۴
زمرّد	نامعلوم	۴۲
ابری	گوالیار	۴۲۷
لاجورد	نامعلوم	۳۱۴
دہانِ فرنگ	نامعلوم	۶۱۴
غوری	کھماج	بے شمار
تانبڑہ	دریائے گنگ	۵۲
یمنی	یمن	۲۳۰
پائے زہر	کوہ کماؤں	۶۱۶
لہسینہ	دریائے نیل	بے شمار
خارا	دریائے جمن	۶۷۷
بلّور	نامعلوم	۷۴
پنکھی	بلخ	۸۷
گوڈر	گوالیار	۱۶۰۰
مرمر	جے پور	۹۲
سماق	نامعلوم	۵۷۵
کھٹو	جیسلمیر	۳۴۰
یاقوت	نامعلوم	۱۴۲
ہیرا	نامعلوم	۶۳۵
سنگہ	دریائے کلاں	۴۴
مروارید	نامعلوم	۵۰
سیپ	نامعلوم	ایک لاکھ
بلّور	حیدرآباد	۶۵
سرخ	گوالیار	۶۴۹
غار	نامعلوم	بے شمار

بادل	نامعلوم	٦۵
پکھراج	نامعلوم	۹۷

چوبینہ لکڑی (جو عمارت میں کام آئی)

نام چوب	طول	عرض	ارتفاع	تعداد
سال	۱۵درعہ	۴درعہ	۷درعہ	۵۰۳۴
شیشم	۷درعہ	۲/۱۔۱درعہ	۲/۱۔٦ درعہ	۱۰۰۷۷
آبنوس	۱۴درعہ	۵ درعہ	۲/۱۔۳	
اگر	۷درعہ	۲درعہ	۱درعہ	۷۷
صندل	۱درعہ	۱درعہ	۱درعہ	۷۰۳۰
مختلف	۳۰درعہ	۱۹درعہ	۹ درعہ	۵۹۵۷۰۰۰

فہرست معماران فن کاران تاج محل

نام کاریگر	کار خدمت	سکونت	تنخواہ ماہانہ
محمد عیسیٰ آفندی	نقشہ نویس	(ترکی) روم	ایک ہزار روپیہ
ستار خاں	خوش نویس	ترکی (روم)	ایک ہزار روپیہ
محمد شریف	نقشہ نویس	سمرقند	ایک ہزار روپیہ
محمد حنیف	کارفرمائے معماراں	اکبرآباد (آگرہ)	ایک ہزار روپیہ
امانت خاں	طغرانویس	شیراز	ایک ہزار روپیہ
قادر زماں خاں	جملہ فنون کا ماہر	عرب	آٹھ سو روپیہ
چرنجی لال	پچی کار	دہلی	آٹھ سو روپیہ
بلدیو داس	گل تراش	ملتان	چھ سو نوے روپیہ
جمنا داس	پچی کار	دہلی	چھ سو اسّی روپیہ
منو لال	پچی کار	لاہور	چھ سو اسّی روپیہ
عبداللہ	معمار	دہلی	چھ سو پچھتر روپیہ
بشارت علی	پچی کار	دہلی	چھ سو بتیس روپیہ
بھگوان داس	پچی کار	دہلی	چھ سو تیس روپیہ
محمد یوسف خاں	پچی کار	دہلی	چھ سو روپیہ
چھوٹے لال	پچی کار	ملتان	چھ سو روپیہ
جھومر لال	پچی کار	ملتان	چھ سو روپیہ

عبدالغفار	خوش نویس	ملتان	چھ سو روپیہ
وہاب خاں	خوش نویس	ایران	چھ سو روپیہ
امیر علی	گل تراش	ملتان	چھ سو روپیہ
محمد سجّاد	معمار	بلخ	پانچ سو نوّے روپیہ
اسمٰعیل خاں	گنبد ساز	روم (ترکی)	پانچ سو روپیہ
محمد خاں	خوشنویس	بغداد	پانچ سو روپیہ
محمد صدّیق	معمار	دہلی	پانچ سو روپیہ
عطا محمد	سنگ تراش	بخارا	پانچ سو روپیہ
ابو یوسف	پچّی کار	دہلی	پانچ سو روپیہ
ابوتراب خاں	معمار	ملتان	پانچ سو روپیہ
شکراللہ	گل تراش	ملتان	چار سو پچھتر روپیہ
شاکر محمد	گل تراش	بخارا	چار سو روپیہ
روشن خاں	خوش نویس	شام	چار سو روپیہ
شولال	پچّی کار	ملتان	تین سو بیالیس روپیہ
منوہر داس	پچّی کار	ملتان	دو سو بیانوے روپیہ
کاظم خاں	کلس ساز	لاہور	دو سو بیانوے روپیہ
مادھورام	پچّی کار	لاہور	دو سو بہتر روپیہ
چنتامن	پچّی کار	ملتان	دو سو باون روپیہ
بنسی دھر	پچّی کار	ملتان	دو سو چوالیس روپیہ
ہیرامن	پچّی کار	ملتان	دو سو چونتیس روپیہ
منوہر سنگھ	پچّی کار	لاہور	دو سو روپیہ
موہن لال	پچّی کار	قنوج	دو سو روپیہ

خلاصہ:۔ اس روضے کی نقشہ نویسی کی خدمت استاد محمد عیسیٰ آفندی کے ذمّے تھی جو ایک ہزار روپیہ تنخواہ پاتا تھا۔ اسی تنخواہ پر چار اور غیر ملکی اور ملکی مختلف خدمات پر مامور تھے۔ ۱۳۸ اعلیٰ کاریگر ان میں دو نقشہ نویس، پانچ خوش نویس، ایک طغرا نویس، ایک کارفرمائے معماراں، ایک گنبد ساز، اٹھارہ پچّی کار، ایک کلس ساز، ایک سنگ تراش، ایک گل تراش اور ایک عرب جو جملہ فنون میں ماہر تھا اور چار معمار کام انجام دیتے تھے۔ ان کاریگران تعمیر کی تنخواہ دو سو سے ایک ہزار تک تھی۔ ان کے علاوہ بے شمار مزدور اور کاریگر جن کی تعداد بیس ہزار کے قریب تھی اس کی تعمیر میں مصروف تھے

جن کی محنت سے یہ روضہ تقریباً بیس سال میں تیار ہوا مکرمت خاں و میر عبدالکریم اس محکمہ تعمیر کے افسر تھے اور سب معماروں پر افسرِ اعلیٰ آگرے کے محمد حنیف تھے۔ تاج کے مخصوص کاتب امانت خاں شیرازی تھے۔ ان کا اصلی نام عبدالحق ہے۔ سکندرے کے دروازے کا کتبہ بھی عبدالحق نے تحریر کیا ہے اس وقت ان کو کوئی خطاب عطا نہ ہوا تھا۔ اسی وجہ سے خاتمہ پر عبدالحق الشیرازی کندہ ہے بعدۂ امانت خاں خطاب عطا ہوا اور مقبرہ ممتاز محل کے کتبوں کے بعد امانت خاں شیرازی تحریر کیا۔ اکثر صاحبوں کا خیال ہے کہ عبدالحق اور امانت خاں دو شخص ہیں اور شروع میں ہمارا بھی یہی گمان تھا (یعنی صاحبِ معین الآثار کا) لیکن مدرسہ ۸ محلّہ کی قدیم مسجد کے کتبے کو دیکھنے کے بعد ہم کو یقین ہو گیا کہ عبدالحق اور امانت خاں ایک ہی شخص ہے کیوں کہ اس میں صاف طور سے ''عبدالحق الشیرازی المخاطب بہ امانت خاں (۱۶۳۵ء)'' تحریر ہے (حاشیہ معین الآثار)

یہ مضمون معین الآثار مصنّف محمد معین الدین اکبر آبادی جنرل سپرنٹنڈنٹ کلکٹری متھرا کے مختلف مقامات سے اخذ کیا گیا ہے۔ معین الآثار کا صفحہ اول ندارد ہے۔ دیباچے میں تاریخ یکم اپریل ۱۹۰۴ء درج ہے۔ مصنّف نے جن کتابوں کی فہرست دی ہے اور ان سے استفادہ کیا ہے ان کی فہرست یہ ہے:

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	زبان
۱۔	تزک جہانگیری	شہنشاہ جہانگیر	فارسی
۲۔	بادشاہ نامہ	ملّا عبدالحمید لاہوری	//
۳۔	بادشاہ نامہ	محمد صالح	//
۴۔	مآثر الامرا	نواب صمصام الدولہ شہنواز خاں	//
۵۔	منتخب اللباب	خانی خاں	//
۶۔	تاریخ آگرہ قلمی	منشی سیل چند	فارسی
۷۔	مفتاح التواریخ	ٹامس ولیم بیل	//
۸۔	تمدّنِ عرب	مترجمہ سیّد علی بلگرامی	اردو
۹۔	سیر و سیاحت ابرنیر صاحب	مترجمہ خلیفہ محمد حسین وزیر پٹیالہ	اردو
۱۰۔	منتخباتِ حسن	مولوی عبدالحق بی اے	//
۱۱۔	تاریخ تاج گنج	قلمی	//
۱۲۔	تاریخ عمارت	جیمنس فرگسن صاحب	انگریزی
۱۳۔	گائڈ آگرہ	ایچ۔ جی کین صاحب۔ سی۔ آئی۔ ای	//
۱۴۔	سفرنامہ	ڈبلیو ایک کین ممبر پارلیمنٹ	//

۱۵۔ تاریخ آگرہ — نواب محمد عبدالطیف سی۔ایس۔آئی — //

۱۶۔ رپورٹ عمارات قدیم جلد چہارم — الیگزینڈر کنگھم صاحب — //

۱۷۔ امپریل گزٹیر آف انڈیا — ڈبلوڈبلو ہنٹر صاحب — //

۱۸۔ جرنیل آف انڈیا آرٹ — مضمون محرر جاج برڈوڈ صاحب

۱۹۔ مونیو منٹل — اے فوہرر صاحب — //

۲۰ اورنیٹل بیار گرفیکل ڈکشنری — ٹامس ولیم بیل — //

۲۱۔ تاریخ ہندستان — ٹالبوے ویلر — //

۲۲۔ سفرنامہ — ڈبلو ایچ سیوارڈ — //

۲۳۔ سفرنامہ — برنیر صاحب — //

۲۴۔ سفرنامہ — ٹیوربیز صاحب — //

۲۵۔ مائی لائف ورک — سموئیل اسمتھ صاحب — //

۲۶۔ پرووینشنل گزٹیرج — کانبیر صاحب — //

۲۷۔ ریمبلس اینڈ ری کلکشنز — میجر جرنل سر ڈبلو ایچ — //

۲۸۔ آف انڈین آفیشنل — اسلی مین — //

۲۹۔ تاریخِ ہند — انفنس صاحب — //

حواشی:

۱۔ معین الآثار ص ۸۰

۲۔ ٹیورنیر مؤلفہ بال صاحب جلد ا صفحہ ۱۱۰ (معین الآثار ص۔۸۰)

۳۔ معین الآثار ص ۸۰

۴۔ بادشاہ نامہ ص ۳۲۵۔۳۲۶

۵۔ بادشاہ نامہ مؤلفہ ملّا عبدالحمید لاہوری ص ۳۰ جلد ۲ (معین الآثار) ص ۷۵

۶۔ معین الآثار ص ۷۶ تا ص ۷۹

۷۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو معین الآثار ص ۲۰ تا ص ۲۹

۸۔ یہ کتبے مدرسہ کی مسجد میں لگے ہوئے ضرور ہیں مگر اس کا واقعہ یہ ہے کہ دریا کے کنارے کوئی مسجد منہدم ہوگئی تھی اور سنگِ مرمر کی یہ محرابیں اور کتبے باقی رہ گئے تھے۔ میرے خاندان کے ایک بزرگ سیّد امیر علی شاہ صاحبؒ نے وہاں سے اُٹھا کر اپنی مسجد میں لگوا دیے تھے۔ یہ مسجد ہمارے خاندان کے قبرستان میں ہے اور تعمیر کے اعتبار سے اتنی قدیم نہیں ہے کہ امانت خاں اس کے لیے لکھتا۔ (میکش)

واقعات وشخصیات جنھوں نے مجھے متاثّر کیا

سیرت کے بنانے بگاڑنے میں روایات کو بھی دخل ہوتا ہے وہ روایات چاہے مذہبی ہوں یا نسلی اور خاندانی میں نے بھی دانستہ اور نادانستہ خوشی سے اور مجبوری سے یہ اثرات قبول کیے اپنے خاندان اور آباواجداد کے حالات اس وقت بیان کرنے کا محل نہیں ہے۔ میں نے اپنی والدہ کے سوا ان میں سے کسی کو دیکھا بھی نہیں کسی کو دیکھا بھی ہو تو یاد نہیں لیکن میرے کنبے کے بہی خواہ بزرگوں کے معتقدین اور اہلِ شہر مجھے جیسا دیکھنا چاہتے تھے اس کا مختصر خاکہ یہ ہے۔

میں اپنے والد کا بڑا بیٹا تھا اس لیے اُن کے وصال کے بعد مجھے ان کی جگہ بٹھا دیا گیا۔ صوفیوں کی اصطلاح میں اسے سجادہ نشین کہتے ہیں۔ اس وقت میری عمر پونے دو سال کی تھی۔ یہ محض ایک رسم تھی کیوں کہ میں نے نہ اپنے والد سے علم حاصل کیا تھا اور نہ انھوں نے مجھے اپنی جگہ بٹھایا تھا لیکن شہر کے بڑے بڑے سجّادوں نے اسے جائز اور مناسب سمجھا اور ''کردیم رشد'' کے مطابق میں سجادہ ہوگیا اگر میں آئندہ عمر میں ان علوم سے آشنا ہوا ہوتا تو میں بھی ہندوستان کے نوّے فی صدی موروثی سجّادوں کی طرح ہوتا، خیر تو عرض کرنا یہ تھا کہ توقعات اور میرے سرپرستوں کی خواہشات کے مطابق سب سے پہلے تو مجھے عربی فارسی معقولات منقولات کا مستند عالم ہونا چاہیے تھا، علمِ باطن حاصل کرنے کے علاوہ ریاضت ومجاہدہ اور تقویٰ وطہارت کی زندگی گزارنا چاہیے تھی، خاندانی رسوم وروایات کا سختی سے پابند ہونا چاہیے تھا، شہر میں ایسا اثر اور ہردل عزیزی

حاصل کرنا چاہیے تھی کہ عوام میرے اشارے پر چلیں، حکام میرے سلام کے لیے حاضر ہوں اور ہزاروں آدمی میرے مریدوں میں شامل ہو جائیں کیوں کہ یہ سب چیزیں میرا حق اور میری میراث تھیں اور اسے مجھے حاصل کرنا ہی تھا۔

لیکن میں ایسا نہ ہو سکا سوائے اس کے کہ جتنا علم مجھے حاصل کرایا گیا اور جتنا میں حاصل کر سکا وہ کر لیا اور وہ میرے بہی خواہوں اور سرپرستوں کی توقعات سے زیادہ تھا درحقیقت وہ کتنا تھا اس سے بحث نہیں اس طرح علم باطن بھی بحیثیتِ علم کچھ نہ کچھ حاصل کیا۔ لیکن اس پر عمل کے لحاظ سے کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ اس کے علاوہ میں نے رسوم وروایات کی پابندی بھی نہیں کی، میں سنے ہوئے تھا کہ میرے والدِ بزرگوار اور جدِّ محترم نے بہت سی رسموں اور رواجوں میں اصلاح کی تھی یہاں تک کہ لباس اور وضع میں بھی اصلاحیں کی تھی مثلاً اس زمانے میں شرفا کی عورتیں کُرتی پہنتی تھیں جس میں تقریباً پیٹ ناف تک کھلا رہتا تھا، ڈھیلے پائنچوں کا فرشی پاجامہ عورتوں کا معزز لباس سمجھا جاتا تھا جسے اٹھا کر چلنے میں پنڈلیاں تو ضرور ہی کھل جاتی تھیں۔ اسی طرح مرد گول پردے کا انگرکھا پہنتے تھے اس کے نیچے اور کوئی کپڑا نہیں پہنا جاتا تھا اس لیے سینے کا تقریباً پورا نصف حصہ ننگا رہتا تھا۔ میرے جدِّ محترم نے اپنے یہاں اور اپنے مریدین ومعتقدین کے خاندانوں میں عورتوں کو کرتے پہنائے اور پاجامے کے پائنچوں کا طول وعرض اتنا کم کرادیا کہ اٹھا کر چلنے کی ضرورت ہی نہ ہو۔ بالکل جیسے آج کل کے فینسی پاجامے ہوتے ہیں اور انگرکھا ایسا ایجاد کیا جو سامنے سے بالکل بند ہوتا تھا۔ میرے والدِ بزرگوار ریاکاری اور نمائش سے سخت نفرت کرتے تھے انھوں نے مرید کرنا بھی چھوڑ دیا تھا اور اپنی وضع دنیاداروں کی سی کر لی تھی۔ اس بارے میں میں نے ان کی تقلید کی اور ہدفِ ملامت بننے سے گریز نہیں کیا۔

میں نے اہلِ شہر کی خدمت کرنا چاہی اور اپنے بزرگوں کی روش کو قائم رکھنا چاہا مگر زمانہ بدل گیا اور میں زمانے کے ساتھ نہ بدل سکا۔ میرے دادا صاحب تو گوشہ نشیں تھے مگر ان کے بھائی اور میرے والد وغیرہ کا طرزِ عمل یہ تھا کہ عوام سے محبت اور خلوص سے پیش آتے اور حکام سے بے توجہی اور تکبّر کے ساتھ، عوام ان کے ساتھ رہتے اور ان کے احکام کی تعمیل کرتے اور اس لیے حکام میرے بزرگوں کی خوشامد کرتے تھے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ عوام ان کے ہاتھ میں ہیں اس طرح وہ حکام سے عوام کی سفارشیں کرتے اور ان کی کار برآری کرتے رہتے میرے ابتدائی زمانے میں ایک حکام رس طبقہ ہندو مسلمانوں میں ایسا پیدا ہو گیا تھا جو عوام کو حکام کی مرضی پر چلانے لگا تھا گو

رنمنٹ ان لوگوں کی عزّت افزائی کرکے عوام کو مرعوب کرتی تھی۔ اور ان کی معرفت عوام کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتی تھی یہ عوام کو لڑاتے تھے، پھر سفارش کرکے ان کو بچاتے بھی تھے۔ ان حضرات کے بعد ایک اور طبقہ پیدا ہوا جو ارباب اختیار کی آب ورنگ سے تواضع کرکے ان سے کام نکالتا تھا مگر کچھ نہ کچھ وضع داری اور آبرو کو سنبھالے ہوئے کام کرتا تھا اور اپنی شان بھی قائم رکھنے کی کوشش کرتا تھا پھر یہ شان بھی ختم ہوگئی۔ اب معزز کوئی نہیں ہے جو ہیں وہ گھر بیٹھے ہوئے ہیں صرف دلال رہ گئے ہیں بعض دفعہ تو ''لذیذ بود حکایت'' کی وجہ سے ''دراز تر'' کہنا پڑتا ہے لیکن یہاں بے محل طول صرف اس لیے دیا گیا کہ کہنے سے جی کچھ ہلکا ہوجاتا ہے۔ ان سب باتوں کے علاوہ میں شاعر بھی ہوگیا اس لیے کہ میں فطرتاً اور طبعاً شاعر ہوں اس میں روایت کو دخل نہیں ہے کیوں کہ میں نے شعر کہنا شروع کیا تو مجھے اچھی طرح پڑھنا لکھنا نہیں آتا تھا۔ یہ تو مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ میرے بزرگ بھی شعر کہتے تھے اور میرے جدِ اعلیٰ میر اور نظیر کے عہد کے صاحبِ دیوان اردو فارسی شاعر تھے۔ میرے جدِ محترم تصوّف کی مشہور کتاب 'جواہر غیبی' کے مصنف فارسی شاعر تھے اور والد صاحب اردو فارسی میں شعر فرماتے تھے، یہ ضرور ہے کہ میں شاعروں کا سا کردار نہ بنا سکا نہ اپنے آپ کو پیش کرنے اور شاعری کو کسبِ معاش اور حصولِ شہرت کا ذریعہ بنا سکا۔ برسوں میرے گھر کے افراد اور احباب ہی کو اس کا علم نہ ہوسکا کہ میں شعر کہتا ہوں یہ کمی اور کمزوری میری روایات کی وجہ سے بھی ممکن ہے مگر غالباً اس کا سبب میری خوئے حجاب و کم آمیزی ہے اور شاید حریفوں اور ہم پیشہ حضرات کی حد سے بڑھی ہوئی ''انا'' اور طلبِ شہرت کا ردِ عمل بھی:

زنگ زاہد افتادم بہ کافر ماجرائی ہا

یہ چند سطریں مختصر طور پر اس پس منظر کے اظہار کے لیے عرض کی گئیں جس میں میری تعمیر ہوئی، اب ان شخصیات کے متعلق کچھ عرض کروں گا جن سے میں متاثر ہوا اور وہ چند واقعات بھی جو اس وقت یاد آتے جاتے ہیں۔ ان واقعات کے اس وقت یاد آنے کی وجہ سے سمجھتا ہوں کہ ان کا اثر دوسرے واقعات کی بہ نسبت ذہن پر کچھ گہرا ہے۔ گہرا اثر کرنے والے واقعات اور بھی ہوں گے مگر بیان کرنے کے قابل شاید یہی زیادہ ہوں۔

بال سے باریک اور تلوار سے تیز اس زندگی کی دھار پر چلتے ہوئے بلکہ بہتے ہوئے جب کبھی ماضی کی طرف نظر اٹھ جاتی ہے تو نگاہوں کے آگے کچھ صورتیں پھرنے لگتی ہیں۔ کچھ واقعات ابھرنے لگتے ہیں۔ کبھی ایک زنجیر کی طرح سلسلے وار اور کبھی ٹوٹے ہوئے تاروں کی طرح

بے ترتیب کبھی کسی تقریب سے اور کبھی آپ ہی آپ یہ واقعے جنھوں نے میرے دل کے تاروں کو چھیڑا بھی، جھنجھوڑا بھی اور پھر یہاں کی ہر چیز کی طرح گزر گئے اور اپنی یاد چھوڑ گئے یہی یاد سرمایۂ مسرت بھی ہے اور حاصل غم بھی۔

جن شخصیتوں نے مجھے متاثر ہی نہیں کیا بلکہ اپنی تربیت اخلاق و کردار سے میری تعمیر بھی کی ان میں سب سے پہلی میری مادر محترم کی ذات ہے۔ وہ اپنی زندگی بھر میرے دل و دماغ پر چھائی رہیں اور اپنی موت کے بعد دل پر ایک مستقل زخم اور دماغ و ذہن پر ایک غیر معمولی تقدس و حیرت کا احساس چھوڑ گئیں جس میں ان کی غیر معمولی قسم کی موت اور موت کے بعد عجیب و غریب انکشافات نے ان کی زندگی کی بہ نسبت کئی گنا اضافہ کر دیا۔ مجھے ان کا وہ افسردہ تبسّم یاد ہے جب میں ایک عزیز کی ماں کی موت کی خبر سن کر رو دیا تھا تو انھوں نے مسکرا کر کہا تھا: ''تمھیں میرے مرنے کا خیال آ گیا۔'' بات دراصل یہی تھی۔ میں ان کی زندگی میں بھی انھیں بہت رویا ہوں۔ میں سوچا کرتا تھا خدانہ کرے ان کا کچھ ہو گیا تو میں کہاں جاؤں گا، مستقبل پر جہاں تک نظر جاتی اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا۔ یہ سنے ہوئے تھا کہ والدِ بزرگوار کی آنکھیں بند ہوتے ہی ہم پر تباہی اور مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا اور اماں جب بیمار ہوتیں تو پھر ایسی ہی تباہی ہم پر سایہ ڈالتی معلوم ہونے لگتی۔ ہم دونوں بھائی جب شرارت کرتے اور وہ اکتا جاتیں تو وہ کہتیں اچھا نہیں مانو گے لو میں مرتی ہوں، پھر آنکھیں بند کر کے لیٹ جاتیں، ہم پکارتے اماں اماں وہ نہیں بولتیں ہم دونوں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے وہ آنکھیں کھول کر اٹھ بیٹھتیں، گلے سے چمٹا لیتیں۔ اب ایسا نہ کرنا نہیں تو میں مر ہی جاؤں گی۔ پھر ایک ایسے ہی موقع پر میں نے ان کے تلووں میں گدگدی کر کے انھیں زندہ کر لیا تھا۔ وہ ہنستی ہوئی پائنو سمیٹ کر اٹھ بیٹھی تھیں بڑا شریر ہے کہتے ہوئے انھوں نے میرے گال تھپتھپائے تھے۔ انھوں نے ہم دونوں بھائیوں کو کبھی نہیں مارا۔ وہ ایسی ہی کسی نہ کسی ترکیب سے تنبیہ کر دیا کرتی تھیں۔ اپنے بزرگوں کے ہمارے باپ دادا کے واقعات سنایا کرتیں اور ہم سوچتے بڑے ہو کر ہم بھی ایسے ہی ہوں گے۔

اماں کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انھوں نے کبھی ہم دونوں بھائیوں کو اپنی بے چارگی اور یتیمی کا احساس نہ ہونے دیا چچازاد بھائیوں کو دیکھ کر ہم میں یہ احساس پیدا ہونا یقینی تھا کہ جو کچھ یہ کر رہے ہیں ہم بھی کریں، جو کچھ ان کے پاس ہے ہمارے پاس بھی ہو وہ ہمارے ناز اٹھاتیں اور اکثر فرمائشیں بھی پوری کرتیں مگر ساتھ ہی ساتھ تربیت بھی کرتی جاتیں یہاں تک کہ ہم

بچپن ہی سے کسی کی دیکھا دیکھی کوئی کام کرنے کو برا سمجھنے لگے تھے کسی کے کھانے یا کھیلنے کی چیز کی طرف دیکھنا ہمیں بہت ہی شرمناک فعل معلوم ہوتا تھا۔ اس کی سی چیز حاصل کرنے کی کوشش کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہم ایسی جگہ کھڑے بھی نہ ہوتے جہاں کوئی ایسی چیزیں لیے بیٹھا کھا پی رہا ہو یا ہنس بول رہا ہو۔ ہماری دادی پھوپھی ایک گھر میں ہوتے ہوئے بھی جب تک ہمیں نہ بلاتیں ہم نہ جاتے۔ ہمارا جی بھی نہیں چاہتا اور ہم اسے اچھا بھی نہیں سمجھتے تھے۔ امّاں نے والد کے متروکہ سامان اور جائداد میں سے کوئی چیز نہیں بیچی انھوں نے موروثی قرض بھی ادا کیا اور جائداد میں بھی اضافہ کیا اور ایک دفعہ مجبوراً جائداد کا ایک حصّہ علیحدہ کرنا پڑا تو ان کو بہت روز تک رنج رہا۔

ہمارا خاندان بھی سودی قرض کا مارا ہوا ہے۔ یہ قرض کچھ تو دادا مرحوم کے بعد بہن کی شادی میں ہوا، کچھ مقدمہ بازی میں اور کچھ فی سبیل اللہ۔ وہ اس طرح کہ ہماری ایک بہت قریب کی عزیز جو ہماری زمینداری میں حصّہ دار بھی تھیں لالہ بینی پرشاد کی مقروض تھیں زمینداری رہن دخلی (بالقبض) تھی انھوں نے نہ سود ادا کیا نہ اصل، قرض کی رقم بڑھتی گئی یہاں تک کہ جائداد مرہونہ کی قیمت سے بھی بڑھ گئی۔ لالہ جی کے تقاضوں اور خاندانی آبرو کی حفاظت کے لیے یہ تدبیر سوچی گئی کہ ہم یتیموں کی جائداد شریک کردی جائے چنانچہ دستاویز تبدیل ہوئی اور ہماری زمینداری بھی رہن دخلی کردی گئی اور قرض خواہ اس پر قابض ہوگیا آخری شہری جائداد کا ایک بڑا حصّہ فروخت کر کے وہ زمینداری واگزاشت کرائی گئی اس کے کچھ سال ہی بعد قانوناً زمینداری ختم ہوگئی۔ اس قاتل دستاویز کو جس میں خواہ مخواہ ہماری زمینداری شامل کی گئی تھی، میں نے بہت سنبھال رکھا ہے۔

امّاں کو خرچ کے لیے جو کچھ گانو کے انتظام کرنے والے دے دیتے وہ قبول کرلیتیں، حالات ہی ایسے تھے۔ انھیں کسی طرح یہ معلوم نہ ہوسکا کہ ان کی واقعی آمدنی کیا ہے۔ یہ تو کہانیاں ہی تھیں کہ ہماری بڑی دادی کے ہار پھولوں کا خرچ ڈھائی سو روپیہ سال تھا اور پھوپھی کی شادی میں بیس ہزار روپیہ خرچ ہوئے تھے۔ ہمیں اتنا احساس ضرور تھا کہ ہم سے کم آمدنی والے حصّہ دار خوشحال تھے اور ہم لوگ باہر سفید پوش اور گھر میں تنگی ترشی سے گزر کرتے تھے اور امّاں کا زیور رہن رکھا جاتا اور پھر چھڑایا جاتا۔ ہمارے کارندے کے پاس کئی گائیں بھینسیں اور دو گھوڑے تھے اور ہمارے پاس سائیکل بھی نہیں۔ سارا خاندان اور شہر والے ہمیں مال دار سمجھتے اور غالباً کنجوس بھی۔

نونہائی والے لالہ بینی پرشاد میرے والدِ بزرگوار کے بڑے معتقد تھے۔ بیلن گنج (آگرے کا تجارتی مرکز) میں ان بڑا کاروبار تھا مگر اصل کاروبار سودی لین دین تھا۔ رات کو جب دوکان

بڑھاتے تو والد کی خدمت میں سلام کو حاضر ہوتے اور اس کے بعد اپنے گانو جاتے۔ نونہائی جمنا پار ایک آبادی ہے جو ہمارے گھر سے تین چار میل کے فاصلے پر ہے۔ لالہ جی ہمیشہ پیدل آتے جاتے۔ گھر سے صبح سے چل دیتے اور خربوزے شکر قند جیسی موسم کی سستی چیزوں سے پیٹ بھر لیتے پھر خوب ڈگڈگا کر پانی پیتے بھگوان کا شکر ادا کرتے اور کام میں مصروف ہو جاتے۔ ایک پگڑی ایک دھوتی اور ایک انگرکھا ان کے برسوں کے لیے کافی ہوتا۔ راستہ چلتے سو بھی جاتے۔ رات کو واپسی میں دیر ہو ہی جاتی تھی۔ سنا ہے کہ ایک دفعہ چلتے میں سو گئے بیل گاڑی والے بھی اکثر گاڑی میں سو جاتے ہیں۔ لالہ بیل گاڑی سے ٹکرا گئے۔ والد کے ملاقاتیوں اور خاندان والوں میں جب کسی کو قرضے کی ضرورت ہوتی وہ والد کے پاس اس غرض سے آتا اور لالہ اشارہ پاتے ہی اس کی جائداد رہن رکھ لیتے اور قرض دے دیتے۔ اور اس زمانے میں قرضہ عموماً سود در سود پر دیا جاتا تھا لالہ والد کے بہت ممنون بھی رہتے اور معتقد بھی ان کا منیم ہم سے کہا کرتا تھا کہ نونہائی میں کوئی عورت کنوئیں میں گر گئی مخالفوں نے لالہ بنی پرشاد کا نام لگا دیا اور پولیس نے لالہ کو گرفتار کر لیا مگر شاہ صاحب نے ڈپٹی فضل صاحب سے کہہ کر لالہ کی ہتھکڑیاں کھلوا دیں۔ یہی لالہ جی تھے جو والدِ مرحوم کے بعد ہمارے اور ہمارے خاندان کے کام آتے رہے اور جب بھی قرضہ لینے کی ضرورت پڑی انھوں نے جائداد رہن رکھ کر قرضہ دے دیا۔

میری پہلی والدہ نے دو لڑکیاں چھوڑی تھیں۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی میری والدہ کے ہو کر جاتے رہے تھے اس لیے والد والدہ کو اور ان کے تمام خیر خواہوں کو لڑکے کی بڑی تمنا تھی۔ میری کھلائی پٹھانی اس فکر میں سب سے زیادہ پیش پیش تھی وہ دن دن بھر فقیروں کی تلاش میں خاک اڑاتی پھرتی، ان کی خدمتیں کرتی اور اپنی قلیل تنخواہ میں سے ان پر خرچ کرتی مزاروں پر جا کر دعائیں اور نذر نیاز مانتی۔ جب میں پیدا ہوا تو بڑی دھوم دھام ہوئی نذر نیازیں پوری کی گئیں جو میری ماں کی کم اور دوسروں کی مانی ہوئی زیادہ تھیں، جو میری بیوہ ماں ایک عرصے تک پوری کرتی رہیں۔ ان میں سے ایک منّت یہ بھی تھی کہ ہم دونوں بھائیوں کو محرم کی ۶/ تاریخ کو حضرت امام حسین علیہ السّلام کی فقیری پہنائی جائے گی۔ فقیری کے لیے بھیک مانگنا بھی ضروری ہے۔ پٹھانی ہم دونوں بھائیوں کو فقیر بنا کر لے جاتی اور دو چار جان پہچان کی دوکانوں سے پیسے ہماری جھولیوں میں ڈلوا لاتی جب کچھ سمجھ آئی تو ہم نے دروازے سے باہر نکل کر بغاوت کر دی اور بازار میں جانے اور مانگنے سے انکار کر دیا، مجبوراً پٹھانی نے پاس پڑوس سے دو چار پیسے مانگ کر ہماری جھولیوں

میں ڈلوائے اور آخر خدا خدا کر کے بارھویں سال ہماری فقیری بڑھ گئی۔ مانگنے کا یہ صدمہ اور شرم ہمیشہ یاد رہے گی۔ اور اب ہمارے گھر میں فاتحہ درود بہت ہوتا ہے لیکن ایسی نذر نہیں مانی جاتی۔ اسی طرح عمر کے چوتھے سال ایک اور شدید صدمہ اٹھانا پڑا۔ شرم وحجاب میرے اندر نا سمجھی کے زمانے سے غیر معمولی ہے اس کی وجہ سے کتنے ہی نقصان بھی اٹھائے اور اخلاقی اعتبار سے فائدے بھی۔ والدہ صاحبہ اس بات پر خود تعجب کیا کرتی تھیں کہ بہت ہی کم عمری کے زمانے سے میں کسی کے سامنے کپڑے نہیں اتارتا تھا لیکن ایک دن بڑی مہمان داری ہوئی سیکڑوں مرد اور عورتیں جمع ہوئیں اور سب کے سامنے سونے کی چڑیا اڑائی گئی۔ مجھے اس طریقے پر سخت اعتراض ہے۔ ختنوں پر نہیں اس کے اعلانِ عام پر۔ اس طرح سب کو تماشہ دکھانے اور ہنگامہ کرنے پر۔ ہماری معاشرت میں بہت سی رسمیں ایسی ہیں جن میں سے بعض میں بے غیرتی ہے بعض مہمل اور بعض مسرفانہ اور تباہ کن ہیں۔ اسی طرح کا ایک واقعہ جس سے میں بہت متاثر ہوا یہ ہے کہ آگرے میں سادات کا ایک خاندان اب سے ایک پشت پہلے بہت مقتدر اور ذی حیثیت سمجھا جاتا تھا۔ خدا کی دی عزت اور نام بھی۔ زیادہ تر لوگ صاحبِ ثروت تھے ان لوگوں نے خوب عیش کیے خوب فضول خرچی کی اور خوب کھایا کھلایا۔ معمولی بسم اللہ اور سالگرہ بھی پوری شادی کی طرح ہوتی تھی۔ ان میں ایک بزرگ تھے ان کا مکان بارش میں ڈھے گیا، مرمّت کے لیے ان کے پاس پیسہ نہ تھا ناچار بچوں کو لے کر اپنے خاندانی قبرستان کے ایک دالان میں جا پڑے۔ میں مزاج پرسی کو گیا تو آنکھوں میں آنسو بھر لائے: ''مزاج وزاج کیا ہے بیٹا فاقوں نے یہ حال کر دیا ہے'' چپکے سے میرے کان سے منہ ملا کر کہنے لگے، دو تین روز بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ ایک رشتہ دار صاحب نے ان کا کفن دفن کیا، سوم کے دن سارے خاندان کو کھانا کھلایا اور بانٹا۔ کہنے لگے یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں کچھ نہ کرتا خاندان کی نام ناک کا سوال تھا۔

میں نے یہ دیکھا اس نے پہلے بھی کے واقعات بھی یاد کیے، سوچا اور مشورہ کیا تو معلوم ہوا اسّی فیصدی تباہی ان فضول رسموں کی بنا پر آتی ہے۔ اپنے محترم دوست مفتی انتظام اللہ شہابی اور دوسرے احباب کی مدد سے سارے شہر کے علماء دین کو مدعو کیا ان میں بعض دیوبندی عقیدے کے تھے بعض بریلوی اور بعض تبلیغی جماعت والے اس لیے بڑی منّت سماجت سے جمع ہوئے یہ شرط کر لی گئی کہ کوئی مختلف فیہ مسئلہ نہیں چھیڑا جائے گا۔ میں نے اطمینان کرا دیا کہ میرا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں میں جو بُری رسمیں آ گئی ہیں ان کے خلاف موقع بموقع دو حرف کہہ دیا کیجیے اس طرح

ایک جماعت بن گئی مجلس علماء اس کا نام رکھا گیا صدر سکریٹری منتخب ہو گئے، فارم چھپ گئے اور غریب خانے پر اس کا دفتر قائم ہو گیا مگر کام کرنے پر کوئی تیار نہ ہوا۔ تبلیغی جماعت کے ایک عالم اس شرط پر تیار ہوئے کہ ہم لوگ ان کے ساتھ مختلف محلّوں کی مسجدوں میں جائیں گے اور مولانا نماز کی تاکید کے ساتھ ان رسموں کے خلاف بھی کچھ کہہ دیا کریں گے۔ اتفاق سے میں اور مفتی انتظام اللہ شہابی دونوں تقریر کرنے سے محذور ہیں اس لیے یہ سہارا بہت معلوم ہوا اور ہم مولانا کا جلوس لے کر مسجدوں میں پہنچے۔ مولانا نے نماز جماعت ختم ہونے کے بعد نمازیوں کو نماز کی تاکید فرمائی اور کلمہ گویوں کو کلمہ کی تلقین کی مگر ہمارا مدّعا ان کی زبان پر نہ آیا۔ اس کی وجہ مولانا نے یہ بتائی کہ مسجدوں میں عموماً عربی کے طالبِ علم رہتے ہیں اگر موت اور شادی کے کھانے کی مخالفت کی گئی تو ان طالبِ علموں کا نقصان ہوگا۔ مفتی انتظام اللہ صاحب پاکستان تشریف لے گئے اب میں اور میرا گھر رہ گیا ہے جو موت اور لڑکی کی شادی کا کھانا نہیں کھاتا۔ کھانے کا کھلانا ضروری ہے اس کے لیے بہت مواقع پیدا کیے جاتے رہتے ہیں مگر طنز و ملامت جاری ہی رہتی ہے۔

ہم لوگ غلط رسم و رواج اور سودی قرض کے علاوہ مقدمے بازی کے بھی مارے ہوئے ہیں۔ میرے دادا صاحبؒ نے دنیا کی جائداد کے لیے مقدمے بازی کو جائز نہیں رکھا اور فیصلہ ثالثی پر راضی ہو گئے مگر یہ فیصلہ ثالثی بھی مقدمہ بازی سے کم تباہ کن ثابت نہ ہوا۔ ان کے بہت قریب کے چچا ڈپٹی سیّد امداد علی صاحب سی آئی ای (سر سیّد احمد خاں کے شریک کار اور پھر حریف) نے عزیز داری اور اعتماد سے فائدہ اٹھایا اور ایسا فیصلہ کیا جو خاندانی تاریخ میں یادگار رہ گیا یعنی بیوی کو اس کے شوہر کی جائداد کے علاوہ شوہر کے بھائیوں کی جائداد میں سے بھی مہر دلوادیا اور فیصلہ کے الفاظ ایسے رکھے کہ مہر کا جھگڑا ابھی باقی رہا۔ اس خرابی کی جڑ گھر داماد رکھنے کی فضول رسم تھی بیٹی جب کہ اولاد اکبر ہوا اور مختار کل ہو تو اس سے کون سی چیز بچ سکتی ہے چنانچہ سامان خانہ داری نقد و جنس زر و جواہر حتّیٰ کہ خاندانی تبرّکات کچھ بھی محفوظ نہ رہا۔ رسم و رواج نئے ہوں یا پرانے ان کی اندھی تقلید کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ غلط اعتماد اور بے جا بے اعتمادی دونوں نقصان دہ ہیں۔ ہر قدم اٹھانے سے پہلے شطرنج کی طرح آگے کی کئی چالیں سوچنا ضروری ہیں۔ خدا پر توکل بہت ضروری چیز ہے مگر اسبابِ ظاہر سے روگردانی بھی مناسب نہیں ہے۔ برتوکل زانوے اشتر بہ بند

انسان جب بیمار ہوتا ہے تو مرض کا مرکز اگرچہ جسم کا کوئی خاص حصہ ہوتا ہے مگر بیمار

سارا جسم ہی ہوتا ہے۔ یہی قوموں کا حال ہے کہ روبہ زوال قوموں کا ہر طبقہ محتاجِ اصلاح ہوتا ہے۔ میرے اوقات کا بڑا اور بہترین حصہ علما صوفیہ اور شعرا میں گزرا ہے اور یہ بات مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتی ہے کہ اخلاقی اعتبار سے ان میں نیچے سے نیچے طبقے میں کوئی فرق نہیں۔ اگر مجھے بعض سچے صوفی اور نیک کردار علما و شعرا کی زیارت و صحبت میّسر نہ آتی تو میں مجموعی طور سے انسان ہی سے ناامّید ہوگیا ہوتا۔ اس خرابی کی ذمّہ داری میرے خیال میں اخلاقی تعلیم اور سماجی نظام میں ہم آہنگی نہ ہونے پر بھی ہے اور طریقِ تعلیم و نصاب تعلیم پر بھی زنا شراب چوری وغیرہ عیب، جن کو سماج برا سمجھتا ہے، اہم سمجھے جاتے ہیں اس لیے چھپ کر کیے جاتے ہیں ریاکاری، غیبت، خودستائی وغیرہ چونکہ سماج میں اتنی بری نظر سے نہیں دیکھے جاتے اس لیے علما و صوفیا مقدسین و غیر مقدسین ان میں سب ہی مبتلا ہیں اور اسے عیب نہیں سمجھتے علمائے ظاہر کا طبقہ ظاہر کو آراستہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ صوفی حضرات اپنے معاصی کو بھی تصوّف میں ڈال دیتے ہیں اور شاعر تو ان سب سے بے نیاز ہیں۔ وہاں ہر چیز ہنر ہی ہنر اور فن ہی فن ہے۔ ان حضرات کی بڑی کمزوری جنس ہے مگر پنڈتوں نے جیسے جنسی بے راہ روی اور ہوس کو مقدّس بنالیا ہے، اس طرح شاعروں نے اسے فن بنالیا ہے۔ علما کا بھی حلال و حرام تقریر و تحریر میں دوسرا ہے اور عمل میں دوسرا۔ ان کا اخلاق اسلام کے اخلاق سے دور کا بھی تعلّق نہیں رکھتا۔

ایک مرتبہ ایک دیوبندی عالم ایک درخواست لے کر تشریف لائے کہ محرم شریف کی فاتحہ کے لیے شکر کا پرمٹ دلوادیا جائے۔ یہ وہ عالم تھے جو محرم کی فاتحہ کا شربت اور کھانے کو حرامِ محض سمجھتے ہیں۔

ایک زمانے میں دیوبندی اور بریلوی علما کے بڑے معرکے رہتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ اسلام صرف انھی مسائل کی تحقیق کا نام ہے اور علمائے اسلام کا فرض صرف یہ معرکہ آرائیاں ہی ہیں۔ میں بریلی گیا تو خیال آیا کہ ان حضرات کی زیارت کرنا چاہیے چنانچہ ان میں سے ایک مقتدر ترین عالم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مولانا مسجد میں تشریف رکھتے تھے چاروں طرف طلبا اور علما حاضر تھے میں نے سچّی عقیدت اور ادب سے مصافحہ کیا اور سامنے بیٹھ گیا۔ مولانا نے مجھے بہت ذلّت آمیز نظروں سے دیکھا اور دوسری طرف متوجہ ہوگئے۔ میں سمجھا شاید میری وضع قطع یا کم عمری اس بے توجہی کا سبب ہے کچھ دیر تک عجیب کس مپرسی کے عالم میں اپنے آنے پر پچھتاتا رہا۔ آخر میں نے ہمّت کر کے مولانا کو مخاطب کیا، مولانا نے مجھے دوبارہ غور سے دیکھا اور فرمایا، تم وہاں

ٹھہرے ہوئے ہوگے جہاں رنڈی کا ناچ ہوتا ہے۔ان کا مطلب خانقاہ نیازیہ سے تھا۔مولانا کا قیافہ صحیح تھا مگر ’’رنڈی کا ناچ‘‘ خانقاہ میں میں نے رنڈی کا ناچ کبھی نہیں دیکھا، مجھ سے نہ رہا گیا میں نے کہا یہ جھوٹ اور اتہام ہے۔مولانا برافروختہ ہوگئے، فرمانے لگے میرے طالبِ علموں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور مجھ سے آ کر بیان کیا۔میں نے عرض کیا رنڈی کا ناچ دیکھنے والے یقیناً فاسق ہیں آپ نے فاسقوں کی شہادت کیسے صحیح مان لی۔اچھا تو یہاں کیوں آئے ہو؟ مولانا نے فرمایا ان کی آنکھیں آگ برسا رہی تھیں۔چاروں طرف سے بڑے بڑے داڑھی والے مولانا کے بزن بولنے کا انتظار کر رہے تھے لیکن میں نے جیتے ہوئے جواری کی طرح کئی داؤں ایک ساتھ لگا دیے اور کئی سوال ایسے کر ڈالے جن میں سے ہر ایک مولانا کا توازن خراب کرنے کے لیے کافی تھا۔آخر مولانا نے موذّن سے فرمایا اذان دو اور اس طرح ہونٹوں پر مہریں لگا دی گئیں۔اس کے بعد میں نے کبھی ایسا خطرہ مول لینے کی جرأت نہیں کی اور کسی ایسے بزرگ کی زیارت کا قصد نہیں کیا۔یہ ایک ہی زیارت ساری عمر کے لیے کافی ہے۔

بہ حیثیت شاعر مجھے جن واقعات وحادثات سے سابقہ پڑا ان کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔دس سال سے پندرہ سال کی عمر تک ہم چھ سات چچازاد پھوپھی زاد بھائی تقریباً ایک ہی کے گھر کے مختلف حصّوں میں رہتے تھے۔سب نے مل کر ایک انجمن بنائی اور اس میں پندرھویں دن مشاعرے ہونے لگے کیونکہ ہم دو تین لڑکے شعر کہنے لگے تھے اور مشاعرے اگرچہ دیکھے نہ تھے مگر اکثر اپنے بڑوں سے ان کا ذکر سنتے رہتے تھے جو شہر میں مختلف مقامات پر ہوتے رہتے تھے۔ہماری انجمن میں میری غزل پسند کی جاتی تھی۔میرے چچازاد بھائی، جو سب میں بڑے تھے اور ہم سب سے زیادہ تعلیم یافتہ تھے، میری غزلوں پر رشک کیا کرتے تھے حالانکہ بعد میں وہ قبولے کہ وہ خود اپنے والد مرحوم کی غزلیں تخلّص بدل کر پڑھا کرتے تھے۔میری اس زمانے کی غزلیں ایسی ہوتی تھیں کہ کوئی بھی شاعر انھیں اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے شرمائے گا مگر ان کے طنز آمیز پہلودار وار کا مجھ پر بڑا شدید ردعمل ہوا اور میں نے اپنا معمول بنا لیا کہ میرا شعر اگر کسی کے شعر کا ہم مضمون ہوتا تو میں اپنا شعر کاٹ دیا کرتا تھا۔پھر ایک عرصے کے بعد کچھ واقفِ فن حضرات نے مجھے سمجھایا کہ اگر تمھارا شعر ہم مضمون ہونے کے باوجود دوسرے کے شعر سے اچھا ہو اور اس میں ترقی کا کوئی پہلو ہو تو اسے کاٹنا نہ چاہیے۔میرا عمل اب تک اسی پر ہے پھر بھی متقدمین کے شعر سے اگر مضمون لڑ جائے تو میں اپنا شعر کاٹ دینا اچھا سمجھتا ہوں، ان کے تقدّم اور احترام کا

تقاضا یہی ہے۔ اس ضمن میں بعض موقعے ایسے بھی آئے کہ بعض ناموراور مشاہیر شعرا نے میرے کسی شعر کو سن کر یہ اعتراف کیا کہ یہ مضمون نیا ہے اور پھر تھوڑے دن بعد وہی مضمون ان حضرات نے شعر میں باندھ کر مجھے سنایا۔ غالباً یہ حضرات اس کو جائز سمجھتے ہوں مگر میں اسے جائز نہیں سمجھتا اور سخت معیوب سمجھتا ہوں جائز ناجائز کا امتیاز ایسا اٹھ گیا ہے اور بات یہاں تک آ پہنچی کہ حال میں بھوپال سے ایک کتابچہ شائع ہوا اس میں ایک صاحب کے نام سے میری پوری غزل درج تھی۔ تخلص کے سوا ایک حرف بھی نہیں بدلا گیا تھا غزل بھی وہ جو ریڈیو دہلی کے مشاعرے میں پڑھی گئی، کئی دفعہ ریلے ہوئی۔ ہندوپاک کے رسائل میں شائع ہوئی اردو اور ہندی رم الخط میں شعرا کے کے منتخب کلام کی صورت میں شائع ہوئی۔ یہ بھی ہوا مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ ان شاعر صاحب سے جب احتساب کیا گیا تو انھوں نے جو معذرت کی اور جو معافی نامہ لکھا اس کی عبارت یہ ہے:

''یقین مانیے قبلہ میرے ایک قریبی دوست نے کافی عرصہ ہوا یہ غزل مجھے روانہ کی تھی جس میں انھوں نے میرا تخلص بھی لکھ مارا اور یہ تحریر کیا کہ تم استعمال کر سکتے ہو۔ حالانکہ کلام دیکھ کر مجھے شک ہوا۔ مجھے یہ قطعاً علم نہ تھا کہ وہ اتنا بڑا مذاق کر کے نہ صرف میری بلکہ آپ ایسے بزرگ اور ادب نواز شخص کو تکلیف پہنچائیں گے۔ غلطیاں انسان سے ہوتی ہیں اور بزرگ انھیں معاف کر دیا کرتے ہیں یہ ایک پہلی اور شاید اب آخری غلطی ہوگی جو باعثِ مصروفیت کہیے یا باعثِ جہالت عمل میں آئی —

آپ کا منتظر کرم بھوپال ۲۱/ اگست ۱۹۶۳ء''

جناب شفا گوالیاری نے، جن کے توسّط سے یہ معافی نامہ آیا تھا مجھے ایک طویل خط میں لکھا۔

''.... کو بلوایا پہلی بار ان کی زیارت ہوئی، دیکھ کر افسوس ہوا گریجویٹ سمجھ دار آتے ہی ہاتھ جوڑ کر رونے لگا اور جو کچھ اس غلطی کی وجہ بتائی وہ ان کے معافی نامے میں درج ہے۔ نیاز مند شفا گوالیاری ۲۷/ اگست ۱۹۶۳ء''

میں چونکہ معاف کر چکا ہوں اس لیے ان شاعر صاحب کا نام ظاہر نہیں کرتا اور نہ پہلے ظاہر کیا مگر یہ واقعہ عبرت اور آج کل کی حالت ظاہر کرنے کے لیے عرض کیا گیا۔ جس غزل کا یہ قضیہ ہے اس کا مطلع یہ ہے۔

حاصلِ عشق غمِ دل کے سوا کچھ بھی نہیں اور اگر ہے تو سب ان کا ہے مرا کچھ بھی نہیں

مشاعروں میں شریک ہونے اور دوسروں کو اپنے شعر سنانے کا مجھے کبھی شوق نہیں ہوا۔ مولانا سیماب اکبر آبادی مرحوم نے میری اس عادت کا تذکرہ شاعر آگرہ نمبر میں افسوس اور شکایت کے ساتھ کیا ہے اور مولانا حامد حسین قادری مرحوم نے نقد ونظر میں لکھا ہے:

''غزل سنانے کا کوئی اصرار کرتا ہے تو تین یا چار شعر پڑھ دیتے ہیں پوری غزل شاید ہی کبھی سنائی ہو''

مولانا سیماب مرحوم نے مجھے سمجھایا کہ یہ شعر عاقبت میں تو کام آئیں گے نہیں انھیں چھپا کر رکھنے سے کیا فائدہ ہے اس کے بعد سے مولانا کے رسالے ''پیمانہ'' میں کلام دینا شروع کر دیا اور پھر دوسرے رسالوں میں چھپنا شروع ہو گیا لیکن اچھے شعر سن کر اچھے شعر کہہ کر اور انھیں معیاری رسائل میں شائع کرا کے اور اسی طرح دانشمندوں سے اپنے اشعار کی داد پا کر مجھے خوشی ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ سفر میں ایک صاحب کا ساتھ ہو گیا۔ انھوں نے بتایا کہ میں نواب صاحب ٹونک کی پیشی میں ہوں۔ پھر انھوں نے مجھ سے سفر کا سبب اور نام پوچھا تو میرا تخلص سن کر ان کی تیوری چڑھ گئی۔ کہنے لگے ہمارے نواب صاحب کے یہاں بہت سے شاعر آیا کرتے ہیں' میں ان سے سفارش کر کے کچھ نہ کچھ دلوا دیا کرتا ہوں۔ میں اس واقعہ سے بہت متاثر ہوا اور اب تو بہ حیثیت شاعر کسی سے متعارف ہوتے جی ڈرتا ہے کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ کبھی کبھی ریل کے سفر میں کوئی قدردان اپنے ذوق شعر کا اس طرح مظاہرہ کرتا ہے کہ شاعر سے شعر سنانے کی فرمائش کرتا ہے اور پھر دوسرے ہم سفروں کو اس طرح داد طلب نظروں سے دیکھتا ہے کہ ''کہیے کیسی مفت کی تفریح کرائی'' ایک افسر قدردانی فرماتے ہوئے شاعروں کو کلب میں مدعو کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ سامعین کی طرح شاعر بھی ان کا شکریہ ادا کرے اور اب تو ہوٹلوں میں کبھی شاعروں کا پروگرام ہوتا ہے کبھی گویّوں کا اور کبھی نقالوں کا۔ اسی طرح نیتا اور سیاسی حضرات اپنے جلسوں میں تقریروں سے پہلے شاعروں کو پڑھواتے ہیں جس طرح تماشہ دکھانے سے پہلے مداری کو پٹڑیاں رکھ کر ڈگڈگی بجاتا ہے ہولی اور عید ملن پر استاد پھندن خاں سارنگی پر درباری سناتے ہیں، پروفیسر گھوش مسمریزم کے کرشمے دکھاتے ہیں گھنشیام داس ڈھپلی پر خیال پیش کرتے ہیں اور شاعر اپنا کلام بلاغت نظام پیش کرتا ہے۔

شاہجہاں پور سے ایک خط آیا کہ میں شاعر ہوں اور آپ بھی شاعر ہیں آگرہ دیکھنے کا شوق ہے اس لیے میں آرہا ہوں اور تین چار دن آپ کے یہاں قیام کروں گا۔ مجھے مہمان کے

آنے سے خوشی ہوتی ہے، میں نے لکھا ضرور تشریف لائیں کاش آپ شاعری کا رشتہ نہ لگاتے تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔ دو تین روز بعد ایک صاحب تشریف لائے آتے ہی میرے آخری جملے کا شکوہ کیا، فرمانے لگے مجھے دو تین روز سخت صدمہ رہا۔ میں نے معذرت کی اور بتایا کہ بعض شاعروں نے مجھے کس کس طرح پریشان کیا ہے۔ پھر وہ شاعروں کی تلاش میں نکل گئے اور شام کو دو تین مقامی شاعروں کے ساتھ تشریف لائے۔ میں شام تک ان کے انتظار میں کھانا لیے بیٹھا رہا۔ انھوں نے معذرت بھی نہیں کی۔ دو تین روز اسی طرح گزر گئے۔ میں ان کا انتظار کرتا رہتا اور وہ آ کر فرما دیتے کہ میں کھانا کھا آیا۔ تیسرے روز فتح پور سیکری جانے لگے تو میں نے عرض کیا کہ مہربانی فرما کر اپنے محلے کا نام اور کسی قریبی عزیز کا پتہ لکھواتے جایئے۔ بہت ناخوش ہوئے آپ نے مجھے کیا سمجھ لیا ہے، یہ سوال کیوں کر رہے ہیں میں نے کہا صرف اس لیے کہ اگر نصیبِ دشمناں آپ کی ریل یا بس لڑ جائے تو آپ کا یہ سامان احتیاط کے ساتھ آپ کے عزیزوں کے پاس پہنچا دوں۔ ان کا یہ احسان ضرور ہے کہ انھوں نے مجھے کلام سننے یا سنانے کی زحمت نہیں فرمائی ورنہ صبح دوپہر شام شعر سننے پڑتے ہیں اور ایک آدھ غزل سنانی پڑتی ہے پھر کسی کی جیب کٹ جاتی ہے کسی کا سامان ریل میں سے غایب ہو جاتا ہے اور بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ سب فریب تھا۔

سنہ ۱۹۴۰ء میں میرا سیدھا ہاتھ کندھے کے پاس سے ٹوٹ گیا اور مجھے شفاخانے میں داخل ہونا پڑا۔ کہنی میں سوراخ کر کے ایک لوہے کی کیل ڈال دی گئی اور اس میں لوہے کا وزن باندھ کر ہاتھ لٹکا دیا گیا۔ دوسرے روز صبح ایک صاحب تشریف لائے۔ یہ میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے اور میرے شناسا بھی تھے۔ دیکھتے ہی فرمانے لگے ارے صاحب میں تو تلاش کرتا ہوا آپ کے دولت خانے پر گیا وہاں ملاقات ہی نہ ہوئی میں نے عرض کیا میں خود آپ کے ہسپتال میں حاضر ہو گیا فرمایئے کیا خدمت ہے کہنے لگے بات یہ ہے کہ ہمارے پرنسپل صاحب جا رہے ہیں ان کو ہم رخصتی پارٹی دے رہے ہیں، ایک نظم کہہ دیجیے۔ جس ہاتھ سے نظم لکھتا ہوں وہ تو یہ آپ کے سامنے لٹکا ہوا ہے۔ میں نے عرض کیا — صاحب آپ بولتے جایئے میں لکھتا جاؤں گا۔ آپ نے فلاں صاحب سے نظم کیوں نہیں لکھوالی وہ تو بہت اچھے شاعر ہیں — میں پہلے ان کے ہی پاس گیا تھا مگر وہ تو معاوضہ مانگتے ہیں۔

اسی زمانے میں ایک اینگلو انڈین نرس نے میری پیٹھ پر اسپرٹ پاؤڈر ملتے ہوئے کہا۔ میں نے سنا ہے آپ بڑے فینس پوئٹ ہیں — پوئٹ تو ضرور ہوں فینس ہوں یا نہیں یہ

مجھے معلوم نہیں — تو پھر آپ لیٹے لیٹے کیا کرتے ہیں نرس پر ایک نظم لکھ دیجیے نا۔ میں نے نرس پر ایک نظم لکھ دی حرفِ تمنا میں شامل ہے۔

ایک واقعہ جس سے میں بہت متاثر ہوا وہ ایک والیِ ریاست کے کردار سے متعلق ہے۔ عبدالوہاب خاں عاصم میرے ایک بہت عزیز دوست ہیں پہلے جے پور میں افسرِ خزانہ تھے اور اب پاکستانی ہیں۔ جے پور کی ملازمت سے پہلے وہ نواب صاحب مانا ور (کاٹھیاواڑ) کے معلم خصوصی رہ چکے تھے اور ہمیشہ نواب صاحب کے یہاں جاتے آتے رہتے تھے۔ انھوں نے مجھے یہ لکھا کہ نواب صاحب مانا ور مشاعرہ کرنا چاہتے ہیں بشرطیکہ آپ یہاں آنے کا حتمی وعدہ کریں۔ بات یہ ہوئی کہ ایک روز بمبئی میں نواب صاحب کے پاس کئی فلمی اداکارائیں بیٹھی تھیں اور نواب صاحب کی فرمائش پر سب اپنے اپنے پسندیدہ شعر سنا رہی تھیں اس میں کسی نے میکش کے نام سے کچھ شعر سنائے وہ نواب صاحب کو بہت پسند آئے، انھوں نے آپ کے بلانے کے لیے مجھے کہا میں نے کہہ دیا کہ میکش یوں نہیں آئیں گے ایک مشاعرہ کرا دیجیے اور اس میں ان کے ہم رتبہ شعرا کو مدعو کر دیجیے میں ان کو بھی بلالوں گا نواب صاحب راضی ہو گئے ہیں اور دس ہزار روپیہ کی منظوری دے دی ہے میں نے عاصم صاحب کو جواب دیا کہ آپ جب لکھیں گے میں آجاؤں گا مہربانی کر کے مشاعرہ نہ کیجیے۔ اس طرح میں مانا ور پہنچا یہ موقع نواب صاحب کی سالگرہ کا تھا۔ آس پاس کے شہر و دیہات کے ہزاروں آدمی اس جشن کی تقریبات دیکھنے آتے۔ اس وقت (۱۹۴۴ء) میں نواب صاحب چوبیس پچیس سال کے ایک خوش رو اور تندرست نوجوان تھے۔ جب میں پہنچا تو کلب کے لان میں مختلف کھیل ہو رہے تھے اور ایک وسیع و بلند اسٹیج پر مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ انھیں کے ساتھ بہت ہی سادہ لباس میں نواب صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے، معانقہ کیا اور اس طرح ملے جیسے برسوں کے دوست۔ مہمانوں اور معزز حضرات کے علاوہ ایک طرف کئی فلمی اداکارائیں اپنی زرق برق ساڑھیوں میں ملبوس بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف کے ایل سہگل اپنے چھوٹے بھائی مہندر سہگل کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے دوسری طرف رستم زماں گاما پہلوان اپنا چاندی کا گرز لیے تشریف رکھتے تھے۔ رات دن ایک جشن و ہنگامہ، رنگ و نور، نغمہ و سرور، فتنہ گوش و نظر اور بلائے دل و جاں بنے ہوئے تھے اور ہر ذرہ زبانِ حال سے کہہ رہا تھا ''الفراق اے ننگ و ناموس الوداع اے عقل و ہوش'' اتنی باضابطہ و شائستہ تفریح اور منظم ہنگامہ نشاط و سرور میں شرکت کا میری عمر میں پہلا اور آخری موقع تھا۔ دو چار دن اچھے گزر گئے پھر نظر سطح سے

گہرائی میں جانے لگی اور انبساط آہستہ آہستہ پہلے عدم انبساط اور پھر انقباض میں بدلتا گیا۔

اس بزم نگاراں اور خیل سیم تناں میں ایک حسین وجمیل نوخیز لڑکی نواب صاحب کے ساتھ سائے کی طرح نظر آتی تھی اور نواب صاحب اپنے ظاہری رکھ رکھاؤ کے باوجود اس سے بے طرح مانوس معلوم ہوتے تھے۔ نواب صاحب کے ماموں نے، جو ایک معمّر اور سنجیدہ بزرگ تھے، مجھے تنہائی میں کہا کہ ابھی تک یہ لڑکا (نواب صاحب) محفوظ رہا مگر اب اس کے قدم ڈگتے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بات انھوں نے مجھے سانپ کاٹے کا عمل بتاتے ہوئے کہی۔ انھوں نے بتایا کہ اس عمل کے عامل کو ساری عمر کے لیے زنا، شراب اور کئی چیزوں کا پرہیز ضروری ہے ورنہ عمل باطل ہونے کے علاوہ عامل کے لیے خطرہ بھی ہے۔ اتفاق کی بات کہ اسی دوران میں ایک روز شام کو جب ہم سب لوگ نواب صاحب کے ساتھ کلب میں بیٹھے ہوئے تھے لوگ ایک بے ہوش بڑھیا کو اٹھائے ہوئے لائے اُسے سانپ نے ڈس لیا تھا نواب صاحب نے ماموں صاحب سے کہا آپ اسے جھاڑیے۔ نہیں بابا صاحب آپ ہی جھاڑیے۔ نواب صاحب مسکرائے اور کہنے لگے۔ اچھی بات ہے، آپ خیال کرتے ہوں گے میں نے آپ کا عمل ضائع کر دیا ہے۔ ایک مٹکی میں پانی اور نیم کا جھونڑا لایا گیا نواب صاحب نے کچھ پڑھنا شروع کیا اور نیم کے جھونڑے کو پانی میں بھگو کر بڑھیا کے منہ پر چھینٹے دینے شروع کیے۔ تھوڑی دیر میں بڑھیا نے آنکھیں کھول دیں اور نواب صاحب کو دیکھ کر گھونگھٹ کاڑھ لیا۔ لوگوں نے پوچھا کون ہیں، کہنے لگی بابا صاحب ہیں ماموں صاحب نے مسرّت اور ندامت کی ملی جلی نظروں سے مجھے دیکھا اور میں نے تعجب اور حیرت کی نظروں سے ماموں صاحب کو کہ ایک نوجوان آزاد ریاست کا فرماں روا کس طرح شعلوں سے بھی کھیلتا ہے اور دامن کو بھی بچاتا ہے۔

اس سلسلے میں مجھے اپنی نوعمری کا ایک واقعہ یاد آیا کہ ہمارے یہاں مرزاپور کے ایک صاحب ابراہیم نامی نے چند مہینے قیام کیا تھا وہ کسی بڑے زمیندار کے اکلوتے لڑکے تھے باپ نے اہتمام کیا تھا کہ کوئی علم وفن ایسا نہ ہو جس کی انھیں تعلیم نہ دی جائے مختلف علوم وفنون کے ماہران کی تعلیم وتربیت کے لیے مقرر کیے گئے تھے۔ ابراہیم صاحب پر جب تباہی آئی تو گھر سے نکل کھڑے ہوئے عقل مندوں کا قول ہے کہ وقت آپڑے تو دیس سے پردیس اچھا ہے۔ ہمارے مردانے میں ایک مختصر کوٹھری انھوں نے قیام کے لیے پسند کی۔ صبح ہی ضروریات سے فارغ ہو کر کوٹھری کے کواڑ بند کر لیتے ایک پیتل کا لوٹا لے لیتے اس پر ٹھیکہ لگاتے اور گھنٹہ سوا گھنٹہ الاپتے

رہتے ۔میں نے ایک روز پوچھا تو کہنے لگے کہ ایک روز کی مشق ناغہ ہو جانے سے بڑا فرق پڑ جاتا ہے ۔ایک روز ابراہیم صاحب نے مجھ سے کہا مجھے آپ کا طرزِ عمل بہت پسند ہے، غیر عورتوں سے بچنا بہت اچھا ہے مگر اتنا اعراض بھی خطرناک ہے اگر کبھی لغزش ہوگئی تو سنبھلنا مشکل ہو جائے گا گھوڑے کو سدھاتے ہیں تو جس چیز سے وہ چمکتا اور ڈرتا ہے اسی کے پاس اسے لے جاتے ہیں لیکن چابک سنبھالے رہتے ہیں یہی نفس کا حال ہے۔

بات میں بات یاد آتی ہے نواب صاحب مانا ور تو ایک تعلیم یافتہ تربیت پائے ہوئے اور اعلیٰ اخلاق کے انسان ہیں لیکن ایک پیشہ ور لڑکی کا ماجرا اس سے زیادہ عجیب ہے۔

ہمارے مکان کے بالکل سامنے ایک پنجابی لڑکی صاحب جان آ کر رہی ۔رنگ روپ ناک نقشہ سج دھج سب کچھ ایسا کہ راہ چلتے آدمی دیکھ رک جاتے ۔جوانی تو دوانی ہوتی ہی ہے۔ بڈھے باولے ہو گئے تھے ۔مجھے اس سے خدا واسطے کا بیر تھا وہ بہت بے تکلف خبری اور ادب آداب سے قطعاً نا آشنا تھی ۔یہ بات ہو یا کوئی اور مجھے اس میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی اس کے ساتھ بوڑھے ماں باپ اور دو بھائی تھے ۔اس سے میری نفرت بڑھتی رہی ۔بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ میرے یہاں آنے جانے والے اور کنبے رشتے کے کتنے ہی مرد اس کے اسیر ہو گئے ۔ایک روز میں نے ایک لڑکی کا سلام لے لیا وہ لڑکی بھی پیشہ ور تھی ۔صاحب جان یہ دیکھتے ہی چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح مجھ پر حملہ آور ہوگئی جو کچھ منہ میں آیا اس نے کہنا شروع کر دیا میری اچھائیاں اور برائیاں سب ایک سانس میں بکھان ڈالیں ۔میرے کان شائیں شائیں کرنے لگے، ہاتھ پانو شل ہو گئے ،زبان گنگ ہوگئی میں اس کا جواب بھی نہیں دے سکتا تھا اس کا گلا بھی نہیں گھونٹ سکتا تھا وہ دور تھی ۔لوگ سن رہے ہوں گے ،دیکھ رہے ہوں گے میں اس خیال سے بدحواس ہو گیا تھا ۔کتنے ہی روز اس رنج میں کٹ گئے میں نے برآمدے میں آنا چھوڑ دیا میں اس کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتا تھا ۔ایک روز میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا صاحب جان برقع کی نقاب الٹے ہوئے مردانہ ٹھاٹ سے کمرے میں گھس آئی اس کے چہرے پر ایک فاتحانہ شان اور اطمینان تھا وہ بالکل میرے مقابل دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی گھٹنے کھڑے کر کے دونوں کہنیاں ان پر ٹکا لیں ،سگریٹ نکال کر سلگائی اور لمبے لمبے کش لے کر دھویں کے بادلوں سے کمرہ بھر دیا ۔اتنے عرصے میں مجھ پر کئی عالم گزر گئے میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں اور کس طرح اس سے انتقام لوں آخر میں غصّے میں کھڑا ہو گیا ۔اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور کہا خاموش بیٹھ جاؤ ورنہ — ورنہ تو کیا

کرے گی میں نے سختی سے کہا میرا توازن خراب ہوتا جارہا تھا وہ بھی کھڑی ہوگئی اس کے چہرے پر بڑا اطمینان تھا اور اس کی مسکراہٹ میں بڑی شوخی تھی۔ کہنے لگی ورنہ ابھی اندر جاتی ہوں اور تمھاری امّاں جان سے کہتی ہوں کہ صاحبزادے صاحب نے مجھے دو مہینے رکھا اور ایک پیسہ نہیں دیا۔ ایک سیکنڈ ہی میں میرا پارہ نقطۂ انجماد تک پہنچ گیا مجھ سے کھڑا نہیں رہا گیا وہ بھی بیٹھ گئی۔

''آخر تم کیا چاہتی ہو''

''کچھ بھی نہیں''

''پھر کیوں آئی تھیں''

''جی چاہا تھا۔ رنڈی کا گھر، وکیل کا گھر، پیروں کا گھر، ایک سا ہوتا ہے جس کا جی چاہا چلا آتا ہے۔''

کہتی ہوئی اٹھی اور مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

مہینے گزر گئے کوئی واقعہ نہیں ہوا نہ وہ آئی پھر۔ میرے ایک بہت معزز دوست میرے یہاں آکر مقیم ہوئے وہ بڑے ذی علم ایک بڑے جاگیردار اور صاحبِ ذوق انسان تھے اور بڑے حسن پرست اور مست قلندر بھی تھے مگر غلط کردار نہ تھے۔ صاحب جان نے دو چار نظروں میں انھیں یقین دلا دیا کہ وہ ان کے لیے بے قرار ہے۔ مردوں کی اس کمزوری سے اس سے زیادہ کون واقف ہوگا اور اس سے زیادہ کس نے فائدہ اٹھایا اور بے وقوف بنایا ہوگا۔ چنانچہ پیام سلام آنے لگے اور ملنے کی جگہ طے ہوگئی۔ میرے دوست مجھ سے بڑی سچّی محبت کرتے تھے اور جب تک میں شریک نہ ہوں اپنی کسی تفریح کو مکمّل نہیں سمجھتے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے بہت دن ہوگئے اعتمادالدولہ نہیں دیکھا تھوڑی دیر وہاں چل کر بیٹھیں۔ اعتمادالدولہ کے ایک برج میں ہم دونوں جا کر بیٹھ گئے تھوڑی دیر میں صاحب جان سیدھی اسی گنبد میں آموجود ہوئی اس نے برقعہ اتار کر ایک طرف پھینک دیا ہمارے پاس آکر بیٹھ گئی اور بغیر کسی تمہید کے میری شکایتیں شروع کردیں۔ میرے دوست سے اس نے فریادی لہجے میں کہا میری ان سے صلح کرادیجیے یہ مجھ سے ناراض رہتے ہیں میں ان سے محبّت کرتی ہوں مگر یہ مجھے ذلیل سمجھتے ہیں ان کے خیال میں محبّت پاک اور بے غرض ہوتی ہی نہیں۔ اس کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی وہ ایک سانس میں سب کچھ کہہ دینا چاہتی تھی جیسے یہ اس کی آخری سانس ہو۔ میرے دوست کا نشہ ہرن ہوچکا تھا وہ کبھی اس کا منہ دیکھتے کبھی میرا۔ آخر میں نے اس کی بات کاٹی۔ اگر تم واقعی مجھ سے محبّت کرتی ہو تو جو میں کہوں وہ کروگی۔

ہاں ضرور۔اس نے کہا — اچھا تو اس گنبد سے نیچے کود پڑو۔میری زبان سے پورا جملہ نہیں نکلا تھا کہ وہ گنبد کی طرف دوڑی اور ساتھ ہی میرے دوست بدحواس ہوکر دوڑے اور بہ مشکل اُسے پکڑ سکے۔میں اس کے تیور دیکھ کر اپنی حماقت پر شرمندہ ہوگیا۔میں نے کہا اچھا یہاں آؤ بیٹھ کر باتیں کریں وہ پاس آکر بیٹھ گئی اس کی آنکھوں میں زخمی ہرنی کی سی مایوسی اور بے کسی تھی میں نے اسے سمجھانا شروع کیا۔تم کسی بھلے آدمی کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھ جاؤ۔اگر تم واقعی مجھ سے محبت کرتی ہو اور میرے کہنے سے جان دے سکتی ہو تو میرا یہ کہنا مان لو۔وہ تھوڑی دیر گم سم بیٹھی رہی پھر کہنے لگی تین دن بعد جواب دوں گی۔وہ ٹھیک تین دن بعد آئی۔اس روز وہ بہت سنجیدہ اور متین معلوم ہو رہی تھی میرے لیے بھی اس کے حسن میں اس وقت غضب کی کشش پیدا ہوگئی تھی کہنے لگی پہلے میرا پورا حال سن لو۔میں انبالے کی ایک شریف زادی ہوں' یہ نواب نام کا جوان آدمی جسے تم میرا بھائی سمجھتے ہو' یہ مجھے بھگا کر یہاں لے آیا تھا' یہ بڈھا اور یہ بڑھیا نواب کے ماں باپ ہیں' یہ مجھے مجبور کرتے ہیں کہ میں دو سو روپیہ ماہوار کما کر انھیں دیتی رہوں۔اب میں نے یہ طے کرلیا ہے کہ یا تو میں بیس روز بعد یہاں سے چلی جاؤں گی اور نکاح کرلوں گی ورنہ زہر کھالوں گی لیکن ایک بات اور سن لو یہ بڈھا بڑھیا تمھارے بہت معتقد ہیں میرے جانے کے بعد یہ تمھارے پاس آئیں گے اگر ان کے کہنے سے تم نے کوئی دعا یا تعویذ ایسا کیا کہ میں واپس آگئی تو میں ان سے تمھارا نام لے دوں گی کہ انھوں نے مجھے بھگوایا تھا۔پھر ایک ایک بات ویسی ہوئی جیسی اس نے کہی تھی وہ ایک پنجابی مہر شاہ کے ساتھ چلی گئی۔مہر شاہ کسی تھیٹر میں ملازم تھا کئی سال بعد مہر شاہ آگرے آیا اس نے کہا صاحب جان بڑی وفادار اور شریف عورت نکلی۔میں اپنی کمپنی کے ساتھ وطن باہر گیا ہوا تھا اسے طاعون ہوا اور وہ مرگئی محلّے والوں نے اُس کی اول منزل کردی میں آخری وقت اس کے پاس نہ تھا اس کا آخری دیدار بھی نہ کرسکا۔اب میں اندازہ کرتا ہوں تو سیکڑوں شریف عورتوں سے زیادہ اپنے دل میں صاحب جان کی عزّت پاتا ہوں اسے کھو کر میں اس کی عزّت پر مجبور ہوں جسے اگر پالیتا تو ہمیشہ ذلیل سمجھتا:

اسی دامن کو اب کعبہ بنا کر پوجتا ہوں میں
کسی کے ہاتھ سے دامن چھڑانا یاد آتا ہے

جب ان شخصیات کا ذکر کیا جائے جن سے میں متاثر ہوا تو حضرت سراج السالکین شاہ

محی الدین احمد نظامی نبیرۂ حضرت مولانا شاہ نیاز احمد بریلوی کا ذکر نہ کرنا بڑی حق ناشناسی اور کفرانِ نعمت ہوگا کیونکہ حضرت ہی کے فیض تعلیم سے میں کفر واسلام کی حقیقت سے آشنا ہوا اور مذہب وتصوّف کے بہت سے نظریوں سے مجھے رہائی حاصل ہوئی ،کشف وکرامات کی حقیقت معلوم ہوکر دل سے ان کی تمنّا جاتی رہی اور انسان کے مقام اور کائنات کی حقیقت سے کچھ نہ کچھ روشناسی حاصل ہوگئی کیوں کہ میں نے حضرت کی صورت میں انسانِ کامل کی زیارت کرلی۔ یہ ضرور ہے کہ اپنی بے عملی کی وجہ سے علم کے حدود سے آگے نہ بڑھ سکا لیکن یقین کی وہ دولت جو مجھے ان کی خدمت میں حاصل ہوئی میرے لیے کافی ہے:

تیرے مے خانے کی تلچھٹ بھی ہے کافی ساقی
بھردے چلّو میں جو شیشے میں ہو باقی ساقی

حضرت سراج السالکین کی شخصیت عجیب وغریب تھی مافوق البشر کا لفظ اس کے اظہار کے لیے کم تر ہے کشف وکرامات کے واقعات آخر زمانے میں اس کثرت سے ہونے لگے تھے کہ ان پر سے تعجّب جاتا رہا تھا۔ خانقاہ شریف میں جو واقعات ہوتے تھے ان سے قطع نظر چند واقعے ایسے ہیں جو یادگار ہیں اور ہر وقت ہر شخص ان کو اب بھی دیکھ سکتا ہے ایک چیز جس کا تعلّق حضور صلی اللہ علیہ السّلام کی شخصیت سے ہے وہ ایک گھاس ہے جس کے چند تنکے باقی ہیں اور عرس کے موقع پر اکثر حاضرین کو اس کی زیارت کا موقع میسّر آتا ہے گھاس کو ایک عرق گلاب کے بھرے ہوئے پیالے میں ڈال دیا جاتا ہے اور سب لوگ بہ آوازِ بلند درُود شریف پڑھتے ہیں۔ جب اسم مبارک یعنی محمد زبان پر آتا ہے تو گھاس میں پیچ وتاب پیدا ہو جاتا ہے وہ پیچ وتاب کے ساتھ اوپر آتی ہے اور نیچے جاتی ہے۔ اس گھاس کی روایت یہ ہے کہ کسی جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے وضو فرمایا تھا اور وہاں یہ گھاس پیدا ہوگئی تھی اوّل تو گھاس چودہ سو سال تک قائم رہنا ہی محال عقلی ہے اور پھر اسم مبارک لیتے ہی اس کا پیچ وتاب معجزہ ہے دوسری حضرت کی بے شمار کراماتوں میں سے جو باقی ہے وہ ایک فوٹو ہے جو غالباً حضرت کی مرضی کے بغیر کسی صاحب نے لینے کی کوشش کی تھی۔ فوٹو کی آؤٹ لائن اور خدوخال سے صاف پہچانا جاسکتا ہے کہ یہ فوٹو حضرت ہی کا ہے مگر سینۂ مبارک کے اندر سے پیچھے کا حصہ صاف دکھائی دے رہا ہے کہ یہ مسند کا چوبی تکیہ ہے اور فوٹو بھی صاف نہیں ہے، پہچانا ضرور جاتا ہے۔

میں جب حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو میری عمر ۱۲۔۱۳ سال کی ہوگی اور میں

ٹونک کے ایک غیر مقلد مولوی سے مشکوٰۃ اور تفسیر جلالین پڑھتا تھا اور تمام صوفیوں اور تصوف سے بدظن ہو چکا تھا یا کر دیا گیا تھا۔ اس لیے حضرت کی ہر حرکت و سکون کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا تھا۔ پھر میں نے حضرت سے چند مختصر رسالے تصوّف کے پڑھے چند تقریریں سنیں اور حضرت کا کردار و عمل دیکھا۔ میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ بایزید و جنید، شبلی و رومی ابن سینا و فارابی کے کرامات و مقامات اور علم و دانش کے افسانے کتابوں میں پڑھے تھے وہ ان آنکھوں سے دیکھے اور سمجھے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں ان کے کشف و کرامات سے متاثر نہیں ہوا لیکن مجھ پر سب سے زیادہ اثر ان کے خارج از اندازہ وقیاس۔ علم و دانش اور ان کے کردار و عمل کا ہوا۔ ان کی خدمت میں گزرے ہوئے چند لمحے میری ساری عمر کا حاصل ہیں:

وہ چند لمحے جو گزرے ہیں ان کی صحبت میں
نہ ہوتے یہ بھی تو اس زندگی کا کیا کرتے

آخر میں مجھے ایک بات اور عرض کرنا ہے جو شاید بے محل سی ہو وہ کہ ہندوستان کے مختلف مذاہب کے ماننے والے صدیوں سے ایک ساتھ رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے اتنے ناواقف کیوں ہیں اور اس کی ذمہ داری کس پر ہے۔ میرے خیال میں اس کی ذمہ داری عوام پر نہیں ہے بلکہ اس کی ذمہ داری ابتدائی تعلیم دینے والوں پر ہے جو ابتدا ہی سے بچوں کے دماغ کو زہر آلود کرتے رہتے ہیں۔ اور ایک کو دوسرے سے ناواقف رکھتے ہوئے نفرت کا بیج بوتے رہتے ہیں۔ آپ نصاب کو بہتر بنا دیں گے پڑھائیں گے یہی سانپ جن کی ہر پھنکار قاتل ہے اس ضمن میں یہ واقعہ سنیے کہ ابھی چند دن ہوئے فیروز آباد کے ایک دوست کے ساتھ ایک پنڈت جی تشریف لائے ان کا تعارف اس طرح کرایا گیا کہ آپ سنسکرت میں ایم اے ہیں ہندی میں ساہتیہ رتن اور شاستری ہیں انگریزی میں ایم اے ہیں اور کسی کالج میں پروفیسر رہ چکے ہیں اور یہ سبھا منتری اور مبلّغ بھی تھے، مسلم یونیورسٹی میں طالب علم رہے ہیں اور اسلامی فقہ سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اسی نقطے سے شاستری جی نے اپنے واقعات سنائے کہ کس طرح وہ پڑھے لکھے مسلمانوں سے فقہ کے مسائل پر بحث کر چکے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ مسلمانوں کو خود بھی امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل کے اختلاف کا حال معلوم نہیں ہے۔ اسی ضمن میں انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ایک امام کہتے ہیں کہ کُتّے کو بغیر ذبح کیے کھانا جائز نہیں ہے اور ایک کہتے ہیں کہ بغیر ذبح کے کھا سکتے ہیں۔ غالباً انھوں نے کتّوں کے پکڑے ہوئے شکار کے متعلق سن لیا ہوگا اور اس کی بہ

خرابی بلا دی ۔ ہندو بچے جو مسلمانوں کے ساتھ اسکولوں میں پڑھتے ہیں کہتے ہیں کہ جس طرح ہم گائے کو پوجتے ہیں اسی طرح مسلمان سؤر کو پوجتے ہیں اسی لیے اس کا گوشت نہیں کھاتے۔ آگرے کے ایک کالج میں پروفیسر صاحب کی ماں کا انتقال ہوگیا ان کی ارتھی بڑی شان سے نکلی کالج کا تمام اسٹاف طالبِ علم، دوست احباب سب ہی ساتھ تھے۔ راہگیروں میں سے ایک مسلمان بوڑھا آگے بڑھا اور ارتھی کو کندھا دے دیا پروفیسر صاحب مجھ سے فرماتے تھے کہ لوگوں نے اس کا برا مانا اور اسے روکنا چاہا مگر میں نے کہا رہنے دو جانے کس جنم میں ان کا سمبندھ رہا ہو۔

مسلمان عام طور سے نہیں جانتے کہ ہولی دسہرے دیوالی کی اصلیت کیا ہے۔ اور ہندو محرم عید بقرعید کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔

اتنے کرداروں کا ذکر کرنے کے ساتھ اگر میں اپنے مرحوم دوست ڈاکٹر کنور محمد اشرف کا ذکر نہ کروں تو مناسب نہ ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب کی چند باتوں سے میں بہت متاثر ہوا جن کا ذکر اپنے ایک مضمون میں کر بھی چکا ہوں ایک تو یہ کہ وہ علمی بحث کے دوران کبیدہ خاطر نہیں ہوتے تھے نہ ان کا لہجہ بدلتا تھا میری ان کی بات چیت، جس میں بحث لطیفے اور گپ شپ سب ہی کچھ شامل ہوتی تھی، گھنٹوں چلتی تھی۔ میں نے انھیں خودستائی کرتے کبھی نہیں دیکھا اور سب سے زیادہ متاثر کرنے والا ان کتابوں کا واقعہ ہے جو انھوں نے لندن سے منگوائی تھیں اور پھر ان کو سینے سے لگائے لگائے ساری دنیا کا چکّر لگا آئے پاکستان کی جیل میں قید کاٹ آئے اور پھر خود آگرے آکر وہ کتابیں انھوں نے مجھے واپس کیں وہ فضول کاغذ جو نشانی کے لیے کتابوں کے درمیان میں رکھ دیے جاتے ہیں بجنسہ محفوظ تھے ان کے یہ واقعے میں خصوصیت کے ساتھ مال وقف کھانے والے، قرض اور عاریت لے کر واپس نہ کرنے والے اور بدعہدی کرنے والے مقدس دین داروں کو سنایا کرتا ہوں۔

سننے والے اکتا گئے ہوں گے۔ بیان کرنے والا بہرحال اکتا گیا۔ اب اگر کوئی یہ سمجھے کہ اتنے سرد و گرم دیکھنے کے بعد ان واقعات کا لکھنے والا ذی ہوش اور پختہ کار ہوگیا ہوگا تو یہ غلط ہے۔ اب تک وہی بچوں کا سا سادہ مزاج قائم ہے سب کی بات کا یقین اور سب سے خلوص، جو آدمی ایک دفعہ دھوکا دے چکا ہو وہ پھر جب چاہے دھوکا دے لے جو بھی ناخوش کر چکا ہو وہ ذرا سی دیر میں پھر خوش کر لے حسن اور اچھی چیزوں میں وہی کشش و جذب جو بچپن میں شروع ہوا تھا علمی صحبتوں کا وہی شوق اور ذی علم حضرات سے وہی محبت جو ابتدائے طالب علمی میں تھی۔ غرض دیکھا بہت کچھ سمجھا بہت کم اور عمل کچھ نہ کیا۔ اب کبھی امنگ اٹھتی ہے تو یہ سوچ کر رہ جاتا ہوں:

چراغِ کشتہ لے کر ہم تری محفل میں کیا آتے
جو دن تھے زندگی کے وہ تو رستے میں گزار آئے

فانی بدایونی

[اس عنوان کے تحت جو واقعات عرض کیے گئے ہیں ان میں سے بعض ماہنامہ ''شاعر'' کے فانی نمبر میں تحریر کیے جا چکے ہیں۔ یہ نمبر فانی صاحب کے انتقال کے بعد ہی شائع ہوا تھا۔ یہ رسالہ اور اس کے ساتھ اور بہت سے رسالے مجھ سے ڈاکٹر رام بابو سکسینہ صاحب مرحوم (مصنف ہسٹری آف اردو لٹریچر) لے گئے اور جب بھی ان سے واپسی کا تقاضا کیا انھوں نے بڑی معصومیت سے فرمایا، آپ مطمئن رہیں اگر میرے پاس ہیں تو آپ کے رسائل بہت ہی حفاظت سے ہوں گے۔ اس واقعے کا اظہار اس لیے ضروری ہوا کہ اب جب کہ محترمی سرور صاحب کے ارشاد کی تعمیل میں یہ واقعات لکھ رہا ہوں تو فانی صاحب سے بچھڑے ہوئے برسوں ہو چکے ہیں اور دروغ گونہ ہونے کے باوجود بھی میں اپنے حافظے سے مطمئن نہیں ہوں اس لیے اگر شاعر میں ذکر کیے ہوئے واقعات سے کچھ اختلاف واقع ہو جائے تو دوسرے اصحاب مجھے معذور نہ بھی سمجھیں تو بھی میں اپنے آپ کو ضرور معذور اور قابل درگزر سمجھوں گا۔

اس مضمون کے لیے عنوان سرور صاحب ہی نے مقرّر فرما دیے تھے۔ مجھے اس سے بہت امداد ملی ہر عنوان سے متعلق واقعات یاد آتے گئے اور میں لکھتا گیا۔ اگرچہ میں ان واقعات کو علاحدہ علاحدہ عنوانوں پر تقسیم کر کے نہ لکھ سکا لیکن یہ عنوان راہبری نہ کرتے تو اتنے واقعات یاد نہ آ سکتے۔ میکش]

ترکی ٹوپی، چست شیروانی، علی گڑھ کا پاجامہ، قد مائل بہ درازی، چھریرا بدن، گندمی رنگ، متناسب اعضا شانے ذرا آگے کو جھکے ہوئے، آنکھیں چھوٹی لیکن عقاب کی طرح تیز ہیں اس طرح دیکھ لیں کہ دوسرے یہ بھی محسوس نہ کرسکیں کہ دیکھا یا نہیں، خوش گفتار خوش رفتار، نشست و برخاست اور گفتگو میں شائستگی اور آداب کا لحاظ۔ محفل کی طرح خلوت میں بھی شائستہ اور متین۔ کچھ کھوئے ہوئے کچھ ہوشیار یہ ہیں جناب شوکت علی خاں صاحب فانی بدایونی بی۔اے۔ ال۔ ال۔بی علیگ

غالباً ۱۹۲۶ء کی گرمیاں تھیں، دوپہر کے وقت میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا کہ مظہر اکبرآبادی مرحوم گھبرائے ہوئے آئے۔ کہنے لگے فانی صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ آپ اجازت دیں تو یہ رائفل علاحدہ رکھ دوں۔ میں نے رائفل علاحدہ رکھ دی مگر مجھے یہ اچھا معلوم نہ ہوا کیوں کہ یہ رائفل میں نے اسی روز خریدی تھی۔ میری درخواست پر سٹی مجسٹریٹ نے سفارش کی تھی مگر مسٹر نیول اس زمانے میں کلکٹر تھے اور رائفل کا لائسنس دینے میں بہت محتاط تھے، انھوں نے درخواست نامنظور کردی تھی اور پھر میں نے خود جاکر اور لڑ جھگڑ کر درخواست منظور کرائی تھی۔ یہ اس زمانے میں میرے لیے بڑی کامیابی تھی اور اس کی مسرت میں مظہر صاحب خلل انداز ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ فانی صاحب میرے پاس آئے بھی نہیں تھے۔ مظہر صاحب نے فانی صاحب کے احترام میں میرے مکان کو ہوٹل پر ترجیح دی تھی۔ اس زمانے میں آگرے میں ریسٹورانٹ نئے نئے کھلے تھے۔ میرے مکان کے سامنے رحمٰن ہوٹل تھا جہاں سارے شہر کے شاعروں اور ان سے دل چسپی لینے والوں کا جماؤ رہتا تھا۔ حتیٰ کہ مولانا سیماب مرحوم اور ساغر صاحب بھی دور سے چل کر اکثر یہاں آتے تھے۔ اس صحبت میں فانی صاحب کے اخلاق کا مجھ پر اچھا اثر پڑا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ وہ مجھ سے زیادہ مخاطب رہے اور میری غزل کی خوب داد دی۔ یہ پہلی داد اور پہلی ہمت افزائی تھی جو جگر صاحب کے علاوہ میں کسی بڑے شاعر سے حاصل کرسکا تھا۔ البتہ اس وقت فانی صاحب کا حلقۂ احباب میرے لیے بہت امّید افزا ثابت نہ ہوا تھا۔ مجھے یاد نہیں اس وقت فانی صاحب نے اپنی کون سی غزل سنائی تھی اور دوسرے شعرا نے کون کون سی۔ اپنی غزل ضرور یاد ہے اور اس کا وہ شعر بھی جس پر فانی صاحب نے بے قرار ہوکر داد دی تھی اور بار بار پڑھوایا تھا:

میں مضطرب ہوں اور مرے جذبات حشر خیز!
وہ چپ ہیں اور کیف کی دنیا لیے ہوئے

(۱ حرف تمنا میں یہ مصرعہ بدل گیا ہے)

فانی صاحب سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ اس مرتبہ وہ اٹاوے سے آگرے آئے تھے۔ وہ یہ اندازہ کرنے آئے تھے کہ یہاں ان کی وکالت کامیاب رہے گی یا نہیں۔ تھوڑے دن بعد فانی صاحب پھر میرے یہاں آئے اس وقت ان کے ساتھ اٹاوے کی کسی عدالت کے کوئی اہل کار تھے۔ ان کا تعارف فانی صاحب نے ایسے ہی اجمال کے ساتھ کرایا تھا۔ وہ مجھے بہت ہی بے تکے سے آدمی معلوم ہوئے اور بہت ہی جلد بے تکلفی کا مظاہرہ کرنے لگے، میں منتظر رہا کہ فانی صاحب انھیں متنبہ کریں گے آخر مجھی کو اپنے تیور سخت کرنے پڑے، ان صاحب پر تو اس کا اثر نہ ہوا مگر میں نے دیکھا کہ فانی صاحب میری حالت دیکھ کر محظوظ ہو رہے ہیں۔ اس وقت میں فانی صاحب کے لیے بہتر رائے قائم نہ کرسکا۔ تھوڑے دن بعد فانی صاحب مستقل آگرے آگئے اور شومارکیٹ سے آگے تراہے کے قریب ٹھیکے دار عبدالکریم صاحب کا مکان کرائے پر لے کر سکونت اختیار کی۔ ان کا دفتر بالاخانے پر تھا۔ صبح موکلوں سے ملتے۔ دوپہر کو سول کورٹ جاتے اور شام کو احباب اور دوسرے آنے جانے والوں سے ملتے۔

آگرے میں فانی صاحب کے مخصوص احباب میں پنڈت پرمیشری ناتھ رینا وکیل بالو بند یشری پرشاد وکیل مخمور اکبرآبادی۔ مانی جائسی۔ ل احمد۔ حافظ امام الدین وغیرہ تھے۔ دوسرے شعرا میں نجم آفندی۔ اخضر اکبرآبادی دلگیر شاہ وغیرہ سے بھی ان کے تعلقات اچھے تھے۔ البتہ مولانا سیماب سے ان کے مزاج نے میل نہ کھایا۔ اس کی وجہ یہ بھی سمجھی جاسکتی ہے کہ مولانا سیماب ایک مخصوص مزاج اور مخصوص حلقے کے آدمی تھے اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ فانی صاحب کے حلقۂ احباب کا سیماب صاحب سے ربط نہ تھا۔ کچھ بھی ہو مگر یہ واقعہ ہے کہ سیماب صاحب کی شروع میں فانی صاحب سے ملاقات رہی۔ اتفاق کی بات کہ اس زمانے میں فانی صاحب کے یہاں ''پلان چٹ'' کا مشغلہ جاری تھا ایک دن سیماب صاحب بھی اس میں شریک ہوئے اس وقت معمول مرزا غالب کی روح تھی۔ سب اپنی اپنی غزلیں سنا رہے تھے اور مرزا غالب موقع محل سے داد دے رہے تھے۔ سیماب صاحب کا نمبر آیا اور جب انھوں نے اپنی غزل سنائی تو بجائے داد کے بیداد ملی۔ سیماب صاحب کا خیال یہ تھا کہ یہ سازش ان کے بعض ہم عصر شعرا نے انھیں ذلیل کرنے

کے لیے کی تھی۔ اس کے بعد سیمابؔ صاحب نے فانیؔ صاحب کے یہاں آنا جانا ترک کر دیا تھا اور صرف محفلوں اور مشاعروں کی ملاقات پر اکتفا کر لیا گیا تھا۔ یہ تذکرہ مولانا سیمابؔ نے خود بھی کسی عنوان سے شاعر کے فانی نمبر میں کیا ہے لیکن خاص بات یہ ہے کہ فانیؔ صاحب اور سیمابؔ کسی کو بھی میں نے ایک دوسرے کے متعلق کچھ کہتے ہوئے نہیں سنا۔ فانیؔ صاحب یوں بھی کسی کو برائی سے یاد نہ کرتے تھے، ناپسندیدگی کا اظہار بھی بہت شائستگی سے کرتے تھے۔ مرزا یگانہ چنگیزی کی غالب دشمنی کا جب بھی ذکر آیا انھوں نے مرزا یگانہ صاحب کو معذور سمجھا۔ ان کے اس طرح کے اشعار پڑھ کر قہقہہ ضرور لگاتے پھر ہم لوگوں کی طرف دیکھتے:

غالب کو چچا بنا کے چھوڑا میں نے

یا

غالب میرا چچا میں غالب کا چچا

وہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی بچّہ باپ کے کندھے پر چڑھ کر چھت کو چھو لے تو اسے یہ نہ بھول جانا چاہیے کہ اس بلندی میں اس کے باپ کا قد بھی شامل ہے۔ ہمارے احباب میں سے ایک صاحب نے جگر صاحب اور ان کی شاعری کے متعلق کچھ کہا فانیؔ صاحب کو یہ بات ناگوار گزری مگر انھوں نے صرف اتنا کہا کہ کسی زمانے میں آپ لوگ یہ فخر کریں گے کہ ہم جگر کے ساتھ یہاں اٹھتے تھے یہاں بیٹھتے تھے۔ جگر صاحب کی شاعری کی مداحی کے علاوہ فانیؔ صاحب کو جگر صاحب سے ایک دلی لگاؤ اور محبّت تھی۔

فانیؔ صاحب عموماً کسی شاعر پر تبصرہ کرنے کے عادی نہ تھے یوں بھی ان کی پسند سے زیادہ ان کی ناپسندیدگی کا اندازہ مشکل تھا لیکن ایک مرتبہ "تسنیم[۲]" میں اپنی بیاض انتخاب شائع کرنا شروع کی تھی۔ اس میں زیادہ اشعار نظیری نیشاپوری کے تھے۔ دو ایک نمبروں میں ہی یہ انتخاب شائع ہو کر رہ گیا اور اردو شعروں کی نوبت نہ آئی۔ لیکن اردو شعرا میں وہ میرؔ و غالبؔ کو بہت پسند کرتے تھے۔ پسندیدہ اشعار کا اثر ان کے چشم و ابرو سے بھی ظاہر ہو جاتا تھا۔ ان کی داد رسمی اور محفلی نہیں ہوتی تھی اور وہ جتنے متاثر ہوتے تھے اتنا ہی ظاہر کرتے تھے البتہ شعر کی غلطی پر بے تکلف احباب کو بھی نہ ٹوکتے۔ میں نے اس کا ان سے بارہا شکوہ بھی کیا۔ میری نظر میں فانیؔ صاحب کی ایسی شخصیت تھی کہ وہ خلوص و محبّت سے مجھے میرے اغلاط پر متنبہ کر سکتے تھے۔ پھر بھی میں ان کے چشم و ابرو سے اندازہ کرتا رہتا تھا اور جس شعر پر وہ خاموش ہو جاتے میں سمجھ جاتا کہ اس میں کوئی نہ

کوئی نقص ہے۔ ایک دفعہ ایسے ہی ایک موقع پر میں نے اصرار کیا کہ بتایئے اس شعر میں کیا غلطی ہے۔ کہنے لگے غلطی کوئی نہیں ہے آپ نے درست کہا ہے مگر میں اپنے لیے اسے جائز نہیں سمجھتا کہ جانتا، دیکھتا وغیرہ کا قافیہ فلسفہ کیا جائے۔

فانیؔ صاحب نظم کے زیادہ قائل نہ تھے اسی لیے علامہ اقبالؔ کے بھی بہ حیثیت شاعر زیادہ معترف نہ تھے۔ جگر صاحب اور دوسرے احباب کے ساتھ میں ان کی گفتگو خاموشی سے سنا کرتا تھا کیوں کہ میری رائے اس کے خلاف تھی۔ ایک مرتبہ میں سفر سے واپس آیا تھا تو فانیؔ صاحب نے حسبِ معمول مجھ سے فرمایا۔ ہمارے لیے کیا لائے۔ اس سے ان کا مطلب نئی غزل یا نظم ہوتا تھا کیوں کہ عموماً سفر میں کچھ نہ کچھ کہہ لیا کرتا تھا۔ اس سفر میں مجھے زبورِ عجم کے مطالعے کا موقعہ مل گیا تھا اور میں نے اس میں سے اچھے شعر انتخاب کر لیے تھے وہ میں نے فانیؔ صاحب کو سنانے شروع کیے۔ وہ خاموشی اور تعجب سے سنتے رہے کیوں کہ میں فارسی شعر نہیں کہتا اور پھر اتنے اچھے شعر آخر جب میں نے یہ شعر پڑھا۔

چناں پیش حریم او کشیدم نغمہ دردے
کہ دادم محرماں را لذتِ سوز جدائی ہا

تو فانیؔ صاحب تڑپ اٹھے کہنے لگے سچ بتایئے کس کے شعر ہیں میں نے کہا ایسے ہی کسی نظم گو کے ہیں۔ آخر میں نے بتایا کہ اقبالؔ کے شعر ہیں تو بہت متعجب ہوئے پھر کہنے لگے شعر سنیے۔

از جلوتیاں لذتِ ذوق نگہے پرس
برخلوتیاں فرصت نظارہ حرام است

یہ شعر فانیؔ صاحب ہی کا ہے اس وقت انھوں نے مجھے یہ نہیں بتایا۔ اس کے بعد میں نے انھیں ہمیشہ اقبالؔ کا معترف پایا۔ وہ اکثر اپنا کوئی شعر سناتے اور یہ نہیں بتاتے کہ ان کا ہے، یہ ان کا خاص انداز تھا اور کبھی کبھی میں بھی ان کے اس انداز کا انتقام لیتا تھا۔ میرے ایک دوست نے مجھے ایک مرتبہ یہ شعر سنایا۔

یہ جستجو ہے کہ ہے عالمِ مجاز کہاں
تلاشِ چشمِ حقیقت نگر نہیں ہے مجھے

ان صاحب کو یہ معلوم نہ تھا کہ کس کا شعر ہے۔ مجھے بہت پسند آیا۔ فانیؔ صاحب آئے تو میں نے انھیں سنایا اور بہت تعریف کی کہنے لگے آپ کو واقعی نہیں معلوم یہ شعر کس کا ہے۔ میں نے

کہا مجھے نہیں معلوم، نہ سنانے والے کو معلوم ہے کہنے لگے حضرت یہ شعر میرا ہے میں نے کہا ہو سکتا ہے۔ کہنے لگے ہو سکتا ہے۔ ارے صاحب باقیات میں ہے۔ میں لطف لیتا رہا اور وہ سنجیدگی سے کوشش کرتے رہے کہ مجھے یقین آجائے میں تو کبھی کبھی انھیں ستاتا لیکن فانی صاحب کو اس میں خاص ملکہ تھا اور اس میں وہ بہت لطف لیتے تھے ایک دن پوچھنے لگے حقیقت اور مجاز میں کیا فرق ہے میں نے کہا کچھ نہیں، صرف اعتباری فرق ہے جس طرح ظاہر و باطن کا فرق۔ اس طرح وہ تقریباً ایک گھنٹہ مجھے الجھاتے رہے۔ اعتراض اور جواب کا سلسلہ چل رہا تھا کہ کہنے لگے اچھا ایک غزل سنیئے' میں نے کہا یہ بات ختم ہو جانے دیجئے' کہنے لگے نہیں پہلے غزل سن لیجے۔ انھوں نے ترنم سے غزل شروع کر دی۔

میں ہوں اک مرکزِ ہنگامۂ ہوش ورم ہوش
دل اگر عالمِ مستی ہے تو سر عالمِ ہوش

آخر جب اس شعر پر پہنچے۔

کچھ نہ وحدت ہے نہ کثرت نہ حقیقت نہ مجاز
یہ ترا عالم مستی وہ ترا عالم ہوش

تو انھوں نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

ایک روز ہنستے ہوئے آئے۔ میں نے کہا خیریت تو ہے، فرمانے لگے ابھی راستے میں شیعہ اسکول کے ایک ماسٹر صاحب ملے کہنے لگے فانؔی صاحب آپ کے اس شعر کا کیا مطلب ہے خصوصاً دوسرا مصرع تو سمجھ ہی میں نہیں آتا۔

دنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے.
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

میں نے ماسٹر صاحب سے عرض کر دیا کہ جب شعر کہا تھا تو کچھ سمجھ ہی کر کہا ہوگا اب تو مجھے بھی نہیں معلوم کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ میں نے کہا صاحب اب وہ لوگوں سے کہتے پھریں گے کہ فانؔی صاحب مہمل کہتے ہیں۔ انھیں خود اپنے شعر کا مطلب معلوم نہیں۔ فرمانے لگے آپ بھی کبھی اپنے شعر کا مطلب کسی کو نہ بتایئے گا۔

اسی طرح مجھے ایک مرتبہ فانؔی صاحب نے یہ بھی نصیحت کی تھی کہ طرح پر غزل نہ کہا کیجیے۔ مدت سے ہم طرح پر غزلیں کہہ رہے ہیں آخر یہ امتحان کب تک۔ اور اگر اب تک ہم

دوسروں سے ہی غزلیں لکھوا کر لے آتے ہیں تو اب بھی لے آئیں گے میرے لیے یہ نصیحت دیوانہ راہوئے بس است کا مصداق ہوگئی کیوں کہ میں خود بھی کبھی مشاعرے کی طرح پر غزل کہہ کر خوش نہ ہوا۔

ایک دفعہ بسمل جے پوری مرحوم جو بڑے ذی علم سخن سنج اور سخن ور آدمی تھے مجھ سے فرمانے لگے۔ فانی صاحب بہت اچھے شاعر ہیں مگر بعض اوقات مہمل کہہ جاتے ہیں۔ میں نے عرض کیا مثلاً۔ فرمانے لگے جیسے یہ شعر

دادِ خود نمائی لے وحدتِ تمنا سے
آئینہ طلب فرما کثرتِ تماشا سے
اس نظر نے چن چن کر آج پھر مٹا ڈالا
اضطرابِ ناپیدا ہر سکونِ پیدا سے

میں نے عرض کیا کہ دوسرا شعر تو مفہوم کے اعتبار سے سادہ ہے صرف اندازِ بیان میں پیچیدگی ہے اس کے بعد میں نے پہلے شعر کا مطلب بیان کرنا شروع کیا۔ بسمل صاحب بہت متاثر ہوئے۔ فرمانے لگے کہ شعر واقعی بہت بلند اور اچھا ہے مگر جو مطلب آپ نے بیان کیا ہے وہ فانی صاحب کی استعداد سے بلند ہے۔ میں نے یہ پورا واقعہ فانی صاحب سے بیان کیا۔ بہت ہنسے۔ تفصیلات پوچھتے رہے اور محظوظ ہوتے رہے۔

ایک روز بہت گھبرائے ہوئے کچہری سے سیدھے میرے پاس آئے، کہنے لگے جلدی بتائیے یہ شعر کس کا ہے۔

دیکھا کیے وہ مست نگاہوں سے بار بار
جب تک شراب آئے کئی دور ہوگئے

میں نے آگرے کے ایک معروف شاعر کا نام لیا، کہنے لگے آپ نے ان سے سنا ہے انھوں نے یہ شعر آپ کو اپنا کہہ کر سنایا ہے۔ میں نے کہا صاحب ایک دو دفعہ نہیں بار ہا سنا ہے کہنے لگے اب پورا واقعہ سنیے۔ آج کچہری میں یہ حضرت تشریف لے آئے تھے میں بار روم میں بیٹھا تھا۔ کہنے لگے فانی صاحب کچھ ارشاد فرمائیے۔ میرا بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا وہ اصرار کیے جا رہے تھے۔ میں نے کہا مجھے اپنا ایک شعر بھی اس وقت یاد نہیں آ رہا ہے۔ کہنے لگے کسی اور ہی کا سنا دیجیے مگر میں آپ سے سن کر جاؤں گا میں نے سوچا ان ہی کا شعر سنا دوں میں نے یہ شعر سنا دیا۔ انھوں نے

بڑی سنجیدگی سے داد دی، مجھے تعجب ہوا۔ میں نے کہا۔آپ کو تو معلوم ہے ناکس کا شعر ہے یہ۔ بہت ہی منہ بنا کر کہنے لگے جی ہاں شاد عظیم آبادی کا ہے۔ پھر فانؔی صاحب فرمانے لگے۔ بھئی ہم لوگ سمجھتے تھے کہ ظالم نے عمر بھر میں ایک شعر تو کہہ لیا۔ آج معلوم ہوا یہ بھی دوسروں کا تھا۔

یہی شاعر صاحب ایک دفعہ ہم لوگوں میں آگئے۔ بابو چھمن پرشاد صاحب جج کی کوٹھی پر سب جمع تھے۔ جگر صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔ یہ صاحب داد وصول کرنے میں بڑے ماہر تھے، پڑھتے بھی خوب تھے۔ انھوں نے غزل پڑھنا شروع کی۔ ہم سب لوگ خواستہ وناخواستہ داد دے رہے تھے۔ فانؔی صاحب ایک آرام کرسی پر لیٹے ہوئے تھے اور بالکل خاموش تھے۔ شاعر صاحب نے گرج کر کہا: فانؔی صاحب شعر ملاحظہ ہو۔ فانؔی صاحب جی کہہ کر خاموش ہوگئے۔ دو ایک شعر پڑھنے کے بعد پھر انھوں نے کہا: فانؔی صاحب شاید آپ سن نہیں رہے ہیں۔ فانؔی صاحب نے کہا: خوب سن رہا ہوں ارشاد فرمائیں۔ ان کا یہ وار بھی خالی گیا اور فانؔی صاحب آخر تک خاموش بیٹھے رہے۔ ایسے اتفاق اکثر ہوئے اور میں نے دیکھا کہ فانؔی صاحب نے غیر معمولی جرأت سے کام لیا۔ ویسے اکثر معاملات میں وہ اس قسم کی جرأت سے قطعاً عاری تھے۔ ان کے بعض ہم نشیں جو اُن سے بہ باطن ناخوش تھے اکثر ان پر فقرے کس دیتے تھے۔ میری نوعمری تھی اور تحمل کا مادّہ کم تھا۔ میرے تیور بدل جاتے تو فانؔی صاحب میرا زانو دباتے اور چپکے چپکے کہتے خدا کے لیے خاموش رہو کیا لڑوگے۔

فانؔی کے شعر کی اگر کوئی داد نہ دے یا ان سے زیادہ کسی دوسرے شاعر کو داد مل جائے تو اس کا ان پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا اور اسی طرح اگر ان کے شعر غیر معمولی طور پر پسند کیے جائیں تو وہ متاثر نہ ہوتے تھے۔ آگرے کے مشہور رئیس پنڈت راج ناتھ صاحب کنزرو کے یہاں اکثر فانؔی صاحب اور ان کے ساتھ ہم لوگ مدعو ہوتے۔ خاص کر جب کہ کوئی معزز سخن فہم مہمان ان کے یہاں آتا۔ عموماً فانؔی صاحب، مانؔی جائسی، مخمورؔ اکبرآبادی اور میں اور کبھی کبھی نجم آفندی اور رعنؔا اکبرآبادی بھی شریک ہوتے۔ ایک مرتبہ جب سب غزلیں پڑھ چکے تو ایک معزز مہمان نے فانؔی صاحب کو مخاطب کر کے کہا: آپ بڑے شاعر ہیں آپ کے شعر بھی بلند ہوتے ہیں لیکن ہمیں ان کم عمر شاعر کا کلام زیادہ پسند آیا۔ میرے کلام کی داد جس انداز سے دی گئی تھی وہ مجھے پسند نہ آیا۔ میں نے خیال کیا فانؔی صاحب کو یہ بات ناگوار گزرے گی مگر وہ مسکرا رہے تھے، ان کے چہرے پر مسرّت تھی اور ان کی تائید میں میری تعریف کر رہے تھے۔

فانؔی صاحب کو عموماً وہی شعر پسند آتے تھے جن میں گہرائی ہو اور اندازِ بیان تیکھا ہو یا پھر میرؔ کے نشتروں کی طرح دل میں اتر جانے والے ہوں۔ جو شعر انھیں پسند آتا اس کی بے ساختہ داد دیتے تھے۔ میں نے انھیں اس بارے میں کسی شخص سے متاثر ہوتے نہیں دیکھا۔ آگرے میں ان کی صحبت ایسے لوگوں سے تھی جو سخن فہم اور سخن سنج تھے اور فلسفیانہ مذاق رکھتے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آگرے کے دورانِ قیام میں جو غزلیں انھوں نے کہیں ان میں تخیّل زیادہ گہرا اور فلسفیانہ ہے۔

یوں تو وہ بظاہر کھوئے کھوئے سے معلوم ہوتے تھے، مگر بعض اوقات ان پر عجیب قسم کی کیفیت طاری ہوتی تھی۔ ایک روز میں اپنے مکان کی بالائی چھت پر تنہا بیٹھا تھا۔ گرمی کا زمانہ تھا، دن ڈوب چکا تھا۔ فانؔی صاحب آگئے انھوں نے رسماً مزاج پرسی بھی نہیں کی، نہ کوئی اور بات کی۔ تھوڑی دیر خاموش بیٹھے رہے۔ پھر بڑے ہی دردناک ترنّم سے یہ غزل شروع کردی۔

شباب ہوش کی فی الجملہ یادگار ہوئی
وہ اک نگاہ جو صرفِ جمالِ یار ہوئی
بہار نذرِ تغافل ہوئی خزاں ٹھیری
خزاں شہیدِ تبسّم ہوئی، بہار ہوئی

غزل پڑھنے کے بعد کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے اور پھر اٹھ کر چلے گئے جیسے صرف یہ غزل سنانے ہی آئے ہوں۔ مگر یہ تو اس وقت بھی پرانی ہو چکی تھی۔ ان کے جانے کے بعد دیر تک مجھ پر عجیب اداسی چھائی رہی۔ ان کی چوٹ کو بغیر سمجھے ہوئے مجھے اپنی ساری چوٹیں ابھرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

ایک روز آئے مجھے سالِ نو کی مبارک دی پھر فرمانے لگے۔ چلیں نجم آفندی کو مبارک باد دے آئیں۔ میں ساتھ ہو لیا راستے میں وہ میرا یہ شعر گنگناتے رہے۔

ترکِ جستجو کرکے دل کا مدّعا پایا
ترکِ جستجو لیکن فیضِ جستجو ہی ہے

اب بھی اس راستے میں جب میں اس مقام پر پہنچتا ہوں جہاں میں نے ان کو یہ شعر پڑھتے سنا تھا تو فانؔی صاحب کی آواز میرے کانوں میں گونجنے لگتی ہے۔

فانی صاحب طبعاً بلند اخلاق کے اور نہایت شائستہ انسان تھے ایک روز میرے یہاں آئے، ہنستے بولتے دوپہر ہوگئی۔ چلتے وقت پیشاب سے فارغ ہونے کا ارادہ کیا۔ پھر کہنے لگے

اب گھر پہنچ کر ہی فارغ ہوں گا۔ گھر پہنچے تو مولوی سعید الدین صاحب سب جج آگرہ فانی صاحب کے منتظر بیٹھے ہوئے ملے۔ فانی صاحب ان کے پاس بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد پیشاب کی سمیت اثر کر گئی اور بے ہوش ہو گئے۔ کئی روز بعد میں فانی صاحب سے ملنے گیا تو انھوں نے خود مجھے یہ واقعہ سنایا۔ میں نے ان کے اس اخلاق کے خلاف احتجاج کیا۔ کہنے لگے یہ اچھا نہ معلوم ہوا کہ میں انھیں بیٹھا چھوڑ کر چلا جاتا اور پھر تھوڑی دیر تو حاجت معلوم ہوتی رہی اس کے بعد حاجت بھی نہ رہی اور پھر میں بالکل بے ہوش ہو گیا۔

ایک روز فیروز صاحب (فانی صاحب کے صاحب زادے) آئے مجھ سے کہا کہ والد صاحب کی طبیعت بہت سخت خراب ہے۔ سینے میں درد ہے۔ آپ کو یاد کیا ہے۔ میں اس وقت ایسی مصروفیت میں تھا کہ ان کے ساتھ نہ جا سکا اور شام کو فانی صاحب کے مکان پر پہنچا۔ اس زمانے میں وہ گھٹیا اعظم خاں کے پولیس چوکی والے چوراہے پر ایک بڑے مکان میں رہتے تھے۔ ان کا دفتر بالا خانے پر تھا اور زنانہ مکان نیچے تھا۔ اوپر کا راستہ علیحدہ تھا اور نیچے کا راستہ علیحدہ۔ جب مجھے اوپر کوئی نہ ملا تو میں نے نیچے آکر پھاٹک کی زنجیر ہلائی، کوئی جواب نہ آیا۔ تھوڑی دیر انتظار کے بعد آواز دی۔ پھر بھی کوئی جواب نہ آیا۔ میں ناامید ہو کر واپس آنے ہی کو تھا کہ دروازہ آہستہ آہستہ کھلنا شروع ہوا۔ میں نے دیکھا کہ فانی صاحب بیٹھے ہوئے دروازے کا پٹ کھول رہے ہیں۔ ان سے اچھی طرح بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ پھر وہ بیٹھے بیٹھے کھسکتے ہوئے اپنے بستر تک واپس گئے۔ تھوڑی دیر بعد فانی صاحب نے آہستہ آہستہ بات کرنی شروع کی۔ کہنے لگے سینے میں سخت قسم کا درد اٹھا تھا، زندگی سے بالکل مایوس ہو گیا، میرا جی چاہا آپ کو دیکھ لوں۔ اب تو میں بہت اچھا ہوں ضعف رہ گیا ہے یہ آپ نے بہت اچھا کیا کہ آواز دے دی یہاں کوئی اور اس وقت تھا نہیں۔ آپ واپس چلے جاتے تو مجھے بڑا صدمہ ہوتا۔ میرا عجیب حال تھا۔ جی چاہتا تھا ان سے مل کر خوب چیخ کر روؤں۔ ان کی اس پرخلوص محبت کا اثر دل سے کس طرح محو ہو سکتا ہے۔

فانی صاحب کو مشاعروں سے دلچسپی نہ تھی پھر بھی ان کو اکثر مشاعروں میں شریک ہونا پڑتا تھا۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ لوگ مجھے مدعو کرنے آئے ہیں اور اتفاقاً فانی صاحب بھی میرے یہاں مل گئے ہیں اور فانی صاحب کو مدعو کیا گیا ہے تو فانی صاحب نے فوراً اقرار کر لیا ہے اور مدعو کرنے والوں کو مطمئن کر دیا ہے لیکن میں ہمیشہ صداقت سے معذرت اور انکار کرتا اور اسی کے ساتھ دوسری طرف سے اصرار بڑھتا۔ فانی مسکراتے رہتے اور مشاعرے والوں کی سفارش

کرتے۔ انجام یہ ہوتا کہ میں پکڑا جاتا اور فانؔی صاحب عین وقت پر غائب ہو جاتے۔ پھر وہ کہتے تم اتنا انکار کیوں کرتے ہو مگر کوشش کے باوجود مجھے یہ فن ابھی تک نہیں آیا۔

میں ایک مرتبہ نئی دہلی میں ایک شادی میں شریک تھا۔ میں نے دیکھا کہ میرے ایک بہت ہی قریبی عزیز کرسیوں کی قطاروں میں نکلتے ہوئے باہر جا رہے ہیں۔ میں ان کے پیچھے چلا ہی تھا کہ ایک صاحب نے کرسی پر سے اٹھ کر میرا بازو پکڑ لیا: آداب عرض ہے۔ آداب عرض ہے۔ آپ نے مجھے پہچان لیا۔ جی ہاں پہچان لیا مجھے چھوڑ دیجیے ابھی حاضر ہوتا ہوں مگر وہ میرا بازو تھامے رہے۔ میں نے دیکھا کہ میرے عزیز کار میں بیٹھ کر روانہ ہو چکے تھے۔ مجھے ان کی کوٹھی کا نمبر بھی معلوم نہ تھا۔ مجھے بڑی تکلیف ہوئی میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا فرمائیے کیا حکم ہے۔ کہنے لگے آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ جی ہاں بالکل نہیں۔ میں نے کہا۔ مگر آپ نے تو کہا تھا کہ پہچان لیا۔ میں نے کہا جتنی سزا مجھے آپ دے چکے ہیں اس سے زیادہ نہ دیجیے۔ کہنے لگے۔ حضرت میں زیدی ہوں۔ ایک زمانے میں سینٹ جانس کالج میں پڑھتا تھا اور آپ سے بڑے مخلصانہ مراسم تھے۔ آپ مجھے بھول جائیں مگر میں تو اس واقعے کی وجہ سے آپ حضرات کو نہیں بھول سکتا۔ کون سا واقعہ؟ میں نے سوال کیا۔ کہنے لگے ہمارے کالج میں سالانہ مشاعرہ تھا۔ ہم لوگ آپ کے پاس آئے آپ نے شرکت کا وعدہ کر لیا۔ پھر فانؔی صاحب کے پاس گئے انھوں نے وعدہ کر لیا اسی طرح مانؔی صاحب نے وعدہ کر لیا۔ ہم لوگ اپنے مشاعرے کی کامیابی کی امید پر بڑے خوش تھے اور سب میں اعلان کر دیا تھا۔ پھر مشاعرے کے وقت ہم لوگ آپ کو لینے آئے آپ کو لے کر مانؔی صاحب کے پاس گئے انھیں ساتھ لیا پھر سب فانؔی صاحب کے یہاں آئے فانؔی صاحب نہ خود گئے نہ آپ کو جانے دیا۔ اب آپ اندازہ کر لیجیے کہ جب ہم مشاعرے میں پہنچے ہوں گے تو کیا حال ہوا ہوگا۔ سارا ہال مہمانوں اور طالب علموں سے بھرا ہوا منتظر تھا اور ہم — بس وہ شرمندگی ہمیشہ یاد رہے گی۔

فانؔی صاحب کے کسی انداز سے ان کی معاشی پریشانی کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ باوجود خلوص و محبّت کے انھوں نے مجھ سے اپنی کوئی پریشانی بیان نہیں کی۔ یہ مجھے ان کے حیدرآباد جانے کے بعد ان کے خاص دوست اور ہم پیشہ پنڈت پی۔ این رینا صاحب سے معلوم ہوا کہ فانؔی صاحب کبھی کسی مکان کا پورا کرایہ ادا نہ کر سکے۔ جب کسی ایک مکان کا کرایہ بہت چڑھ جاتا تو وہ

دوسرا مکان کرائے پر لے لیتے۔ انھوں نے ہمیشہ اچھے اور بڑے مکان کرائے پر لیے ان کے خرچ ان کی آمدنی سے زیادہ ہی رہتے تھے اور یہ چیز ان کی معاشرت میں شامل ہوگئی تھی غالباً وہ خرچ کم کرنا بھی نہیں چاہتے تھے اور اسی لیے زیادہ پریشان بھی نہ ہوتے تھے۔

ان کا پیشہ وکالت کا تھا۔ ان کے ہم پیشہ ان کی قانونی سوجھ بوجھ کی تعریف کرتے تھے مگر آمدنی کے اعتبار سے وہ کامیاب وکیل نہ تھے۔ موکلوں سے بات چیت کا طریقہ بھی پیشہ کے اعتبار سے بہتر نہیں کہا جا سکتا۔ اکثر بار روم میں وکیل انھیں گھیر لیتے اور غزلیں سنتے رہتے۔ خدا بھلا کرے بابو لچھمن پرشاد صاحب کا جب سے وہ سب جج ہو کر آگرہ آئے انھوں نے بڑے بڑے کمیشن فانی صاحب کو دینے شروع کر دیے۔ اس زمانے میں فانی صاحب کی معاشی حالت سنبھل گئی تھی۔ مخالفین نے لچھمن پرشاد صاحب کی شکایت ہائی کورٹ کو لکھی اور آخر ان کا تبادلہ ہو گیا۔ وہ کئی سال یہاں سب جج رہے۔ لچھمن پرشاد صاحب کو اچھے شعر اور اچھے شاعروں سے والہانہ محبت تھی فانی صاحب کے تو وہ عاشق ہی تھے۔ جگر صاحب سے بڑی محبت تھی۔ جگر صاحب آ جاتے تو ہماری صحبتیں اور گرم ہو جاتیں۔ سب جج صاحب عدالت چھوڑ کر کوٹھی پر آ جاتے۔ پیش کار اور دوسرے صاحب معاملہ اہم کام سے کوٹھی پر آتے تو انھیں اچھا معلوم نہ ہوتا۔ لچھمن پرشاد صاحب شعر خوب سمجھتے تھے اور بے تکلفی سے شاعر کو غلطی پر ٹوک بھی دیتے تھے۔ میرے سامنے ایسے کئی موقعے آئے اور ہمیشہ ان کا اعتراض درست ہی ہوا۔ ایک دن لچھمن پرشاد صاحب میرے یہاں آ گئے، کہنے لگے کچھ تازہ کہا ہو تو سنائیے۔ میں نے غزل سنانی شروع کی جب اس شعر پر پہنچا۔

نزع تک دل اس کو دہرایا کیا
اک تبسّم میں وہ اتنا کہہ گئے

تو کہنے لگے ''اتنا'' غلط ہے، مقصود کیفیت کا بیان ہے یا کمیت کا۔ میں نے کہا، آپ بالکل درست فرماتے ہیں۔ میں نے انھیں اپنی بیاض دکھائی اس میں ''اتنا'' کاٹ کر ''کیا کچھ'' بنایا تھا مگر میں کیا کچھ کے بجائے اتنا پڑھ گیا تھا۔

وہ دن ہمیشہ یاد رہے گا جب سارا دن انتہائی بے فکری سے لچھمن پرشاد صاحب کی کوٹھی پر گزارا تھا۔ بے فکری آوارگی کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ جگر صاحب آئے ہوئے تھے شام کو صلاح ٹھیری کہ اب کوٹھی سے باہر کہیں چلنا چاہیے۔ آخر تاج محل منتخب ہوا سب وہاں پہنچے۔ گھاس کے ایک تختے پر بیٹھ کر جگر صاحب نے غزل شروع کی۔ تاج کا خادم دوڑا ہوا آیا: صاحب یہاں گانے

کی اجازت نہیں ہے۔ وہاں سے اٹھ کر درمیانی سنگ مرمر کے حوض پر آ کے بیٹھے جگر صاحب نے کوئی اور شغل کرنا چاہا۔ پھر ہماری طرف وہی خادم دوڑتا ہوا آرہا تھا۔ مخمور صاحب سمجھ گئے اور سب کو وہاں سے اٹھا کر باہر لے آئے۔ مخمور صاحب کہنے لگے یہ چھاؤنی کا علاقہ ہے۔ فوجی مجسٹریٹ یہاں کا حاکم ہے صبح جب اخبار میں خبر چھپتی کہ آگرے کے سول جج اور ہندستان کے مشاہیر حوالات میں بند ہیں تو لوگوں کو معلوم ہوتا۔ پھر سب وہاں سے اٹھ کر وکٹوریہ پارک میں ایک تالاب کے کنارے پر آ کر بیٹھ گئے موسم ایسا تھا کہ دن کو گرمی ہوتی اور شام کو سردی شروع ہو جاتی۔ سب گرمی کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ فانی صاحب کہہ رہے تھے خدا کے لیے گھر چلو ورنہ نمونیا ہو جائے گا سچ مچ وہ کانپ رہے تھے۔

فانی صاحب کے متعلق مجھ سے اکثر لوگوں نے پوچھا ہے کہ کیا وہ شراب پیتے تھے۔ پروفیسر ضیا احمد صاحب بدایونی نے ایک مرتبہ ''ہماری زبان'' میں لکھا تھا کہ فانی صاحب کوکین کھاتے تھے۔ یہ سب کچھ ناممکن تو نہیں ہے۔ فانی صاحب نے کبھی بھی اشارتاً کنایتاً اپنے کو زاہد یا متقی ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کی لیکن یہ مجھے یقین ہے کہ آگرے کی زندگی ان سب چیزوں سے پاک تھی۔ کوکین کھانے والے چونا زیادہ کھاتے ہیں۔ فانی صاحب کی تواضع میرے یہاں ہمیشہ پانوں سے بھی ہوتی تھی وہ کبھی زیادہ چونے کا تقاضا نہ کرتے۔ اسی طرح وہ اپنی پانوں کی ڈبیا سے احباب کی تواضع کرتے تھے۔ اس کے علاوہ میں فانی صاحب کے ساتھ ایسی بے تکلف صحبتوں میں شریک رہا ہوں جہاں شراب کا دور آزادی کے ساتھ چلا ہے میں عمر میں فانی صاحب کے صاحب زادوں کے برابر تھا ممکن ہے وہ میرا لحاظ کرتے ہوں مگر ان کے احباب میرا لحاظ کیوں کرتے اور کبھی تو کوئی فانی صاحب کو اپنے شغل میں شریک کرنے کی کوشش کرتا۔ شراب کے متعلق جوش صاحب سے زیادہ معتبر گواہ بھی نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے ابھی ریڈیو پاکستان سے فانی صاحب پر ایک بیان نشر کیا تھا جو رسالہ ساقی بابت اگست ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا ہے۔ اس میں جوش صاحب فرماتے ہیں:

''ایک رات کا ذکر ہے کہ فانی کے مکان پر چند یاران خرابات جمع تھے اور شغل نائے و نوش جاری تھا۔ فانی ایک گوشے میں ایک ایسے برہمن کی مانند لیٹے یا یوں کہنا چاہیے کہ پڑے ہوئے تھے جس کی آنکھوں کے سامنے گائے ذبح کی جا رہی ہو۔ فانی اس گئوہتیا کو برداشت نہیں کر سکے۔ انھوں نے بڑے رازدارانہ اشارے سے مجھے اپنے قریب بلایا اور کان میں مجھ سے کہا کیا غم غلط کر رہے ہو؟

اس سوال کے وقت فانی کے چہرے پر ایک ایسا رنگ دوڑ گیا جیسے وہ کسی زبردست عذاب کے نازل ہونے کی پیش گوئی فرما رہے تھے"

اسی مضمون میں جوش صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے:

"آگرے میں بھی فانؔی آسودگی سے دوچار نہیں ہو سکے حالاں کہ اس وقت لطیف (ل،) احمد اکبرآبادی، میکشؔ، مخمورؔ، شاہ دلگیر اور حافظ امام الدین کی سی ہستیاں موجود تھیں اور اس کے ساتھ ساتھ مقدس اور چھمو جان کی رومانی و رنگین صحبتیں شباب پر تھیں۔"

ایسا ہی کچھ، نقوش، لاہور کے شخصیات نمبر میں بھی جوشؔ صاحب نے ارشاد فرمایا ہے۔
سیّد مقدس حسین صاحب بی اے ال ال بی وکیل جوشؔ صاحب کے دوست بھی ہیں اور عزیز بھی۔
جوشؔ صاحب ان کو سب کچھ کہہ سکتے ہیں۔ جوشؔ صاحب کی نظم

اے رفیقانِ اکبر آبادی!
دل وفا کا ہے تم سے فریادی

بھی بہ قول جوشؔ صاحب مقدس صاحب کی شان میں ہے اور میں جوشؔ صاحب کے بیان کی کسی درجے میں بھی تردید نہیں کر رہا ہوں، میں بھی جانتا ہوں کہ عدم علم کوئی دلیل نہیں ہے لیکن مجھے اس کا تعجب ضرور ہے کہ میں نے اس سے پہلے یہ نہیں سنا کہ فانؔی صاحب کسی ایسی صحبت میں شریک رہے ہوں جہاں چھمّو جان (طوائف) بھی ہوں۔

فانؔی صاحب کو میں نے مردانہ حسن سے بھی کبھی متاثر ہوتے نہیں دیکھا۔ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ عام طور پر حسین عورتوں کو کس نظر سے دیکھتے تھے مگر میرے علم میں ان کا کردار نظر ایسے موقعوں پر بہت ہی شریفانہ تھا۔ ہاں اربابِ نشاط (طوائفوں) کے ساتھ میں نے دیکھا ہے کہ وہ بڑی خوش دلی اور زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے تھے اور ایسا اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی زندگی کا کوئی دور اس طبقے سے کسی نہ کسی درجے میں موانست کا رہا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ میں اس کا بھی چشم دید گواہ ہوں کہ ایک ایسی ہی جگہ فانؔی صاحب نے تھوڑی دیر کی خوش وقتی کے لیے جانا چاہا۔ انھوں نے مجھ سے اصرار کیا مگر میں نے معذوری ظاہر کی۔ ان کے ساتھ ان کے ایک دوست اور تھے ان کو ساتھ لے کر وہ چلے۔ میں دور سے دیکھ رہا تھا تقریباً آدھ گھنٹہ وہ گلی کے سامنے ٹہلتے رہے اور آخر واپس آگئے۔ اگر وہ اس زندگی کے کبھی زمانے میں عادی رہے ہوتے تو ایک ایسے اجنبی شہر میں جہاں کے عوام ان سے واقف نہ تھے وہ وہاں جانے میں ذرا بھی تامّل نہ کرتے۔ میرا خیال

ہے کہ ان کی زندگی حادثاتِ محبت سے ضرور دوچار رہی ہے مگر کسی قسم کے موانع کے سبب وہ کامرانی اور فائز المرامی سے محروم رہے اور اسی محرومی نے انھیں شاعر یاسیات بنایا یہ میرا پختہ عقیدہ بلکہ حال و مشاہدہ ہے کہ شاعر کی تعمیر میں اس کے دل کا خون اور اس کی ناکامیاں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ فانؔی کی قنوطیت کا راز یہی ہے۔ یہ حالات وواردات اس راہ کو احتیاط سے طے کرنے والوں پر گزرتے ہیں۔ فانؔی نے ان عیش کے لمحات کو قابلِ توجہ نہ سمجھا جو کتنے ہی آنی وفانی سہی مگر ایک ناکام سے ناکام انسان پر بھی آتے ہی ہیں۔ اور دراصل ان ہی لمحات کی بازیابی کی خواہش اور کوشش ایک مستقل غم کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ اس غم ہی کو فانؔی صاحب نے اپنا موضوع، اپنا مقصود بلکہ اپنا معبود بنالیا اور اس طرح انھوں نے نسبتہً زیادہ پائدار چیز کا انتخاب کرلیا۔ میں نے اس موقع پر دانستہ جاوداں کا لفظ استعمال نہیں کیا، کیوں کہ شاعرانہ مبالغے میں تو غم کو جاوداں کہہ سکتے ہیں لیکن درحقیقت اس فانی کائنات میں کوئی چیز بھی جاوداں نہیں ہے نہ خوشی اور نہ غم۔

میں نے اکثر فانؔی صاحب کی آنکھوں اور چہرے پر ایسی کیفیات محسوس کی ہیں جن کو ان کے گزرے ہوئے حادثات کے نقشِ قدم سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور ایسے اوقات میں ان سے میں کہتا: فانؔی صاحب آپ ایک ایسی زمین سے مشابہہ ہیں جس پر سیکڑوں سیلاب گزر چکے ہوں اور اب اس پر ایک یاس انگیز سکوت چھایا ہوا ہو۔ وہ مجھے بڑی محبت اور افسردگی سے دیکھتے۔ ایک آہِ سرد بھرتے، پھر مسکرا کر میرؔ کا یہ شعر پڑھتے۔

دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ
جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا

فانؔی صاحب کا سمجھنا مشکل تھا۔ ان کی آنکھیں چھوٹی تھیں، ان کا چہرہ سنجیدہ اور پُروقار تھا نہ ان کے چہرے سے اور نہ ان کی آنکھوں سے ان کے جذبات کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ سب کو دیکھ لیتے اور کچھ دیکھ لیتے۔ مگر دوسرے لوگ یہ نہ سمجھتے کہ انھوں نے کیا دیکھا اور کیا سمجھا۔ ویسے وہ بڑے ہنس مکھ تھے ہم لوگوں میں بیٹھتے تو خوب ہنستے ہنساتے، محبت آمیز طنز بھی کرتے اور شوخی وشرارت بھی، مذاق بھی کرتے اور قہقہے بھی لگاتے۔ یہ ضرور ہے کہ قہقہے کا پہلا ٹکڑا ان کے حلق میں اٹک سا جاتا، ایسا معلوم ہوتا کہ ان کا نازک دل خوشی کا متحمل نہیں ہورہا ہے اور زبان بند ہوگئی ہے۔ پھر اسی لمحے وہ خوب ہنستے مگر سب میں ایک سنجیدگی اور وقار اور اسی کے ساتھ ایک اور کیفیت ان پر حاوی رہتی۔ میں اس کیفیت کا نام نہیں جانتا مگر جیسے وہ ہر بات کو راز سمجھ رہے ہیں اور راز کی طرح ظاہر کررہے ہیں جیسے انھیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے، کوئی ان کی بات سن تو نہیں رہا ہے۔

خود میری حیثیت دوسروں کی نسبت سے بہت ہی متضاد واقع ہوئی ہے اور جب بہت سے متضاد قسم کے مجھ سے محبّت اور خلوص رکھنے والے ایک صحبت میں میرے یہاں جمع ہو جاتے ہیں تو ان سب کے احساسات کا احترام اور اپنی حیثیت کو سنبھالنا میرے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسے موقع پر جوشؔ صاحب جیسے علمِ مجلسی کے ماہر خود بھی میرے ساتھ وحشت کا شکار ہو جاتے تھے لیکن فانیؔ صاحب میری وحشت سے بہت لطف اندوز ہوتے تھے۔ وہ خود تو عموماً کوئی حرکت ایسی نہ کرتے جس سے میری الجھن میں اضافہ ہو۔ البتہ بعض مواقع ایسے بھی آتے جہاں وہ میری اس کمزوری کو دوسروں کی نظر میں نمایاں کرتے۔ اشاروں اور لطیف فقروں سے انھیں متوجّہ کرتے اور میں جتنا زچ ہوتا اتنا ہی وہ لطف اندوز ہوتے۔ یہ طرزِ عمل ان کا وہاں ہوتا جہاں وہ یہ محسوس کرتے کہ میں خود بھی اس الجھن سے بدحظ نہیں ہوں اور نہ دوسروں کی نظر میں سبک ہو رہا ہوں۔ اہلِ مشاعرہ مجھے مدعو کرتے، میں معذرت کرتا تو وہ اہلِ مشاعرہ کی حمایت کرتے، میری معذرتوں کے جواب دیتے۔ اس لیے نہیں کہ وہ خود یا مجھے مشاعرے میں شریک کرنا چاہتے ہوں۔ کوئی ایسا شخص آ جاتا جس سے میں موانست رکھتا ہوں تو وہ یہ ضروری سمجھتے کہ اس شخص پر ظاہر کر دیں کہ یہ شخص تم سے محبّت نہیں کرتا۔ صرف تفریح مقصود ہے۔ مجھ سے کوئی شکوہ کرتا تو وہ اسے شہہ دیتے اور میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتے جاتے۔

عمر اور مرتبۂ شاعری کے تفاوت کے باوجود مجھے انھوں نے کبھی احساسِ کمتری نہیں ہونے دیا۔ اس مضمون میں کہیں میں نے عرض کیا ہے کہ فانیؔ صاحب نے مجھے کبھی میری غلطی پر نہیں ٹوکا۔ اس کے یہ معنی تو ہو نہیں سکتے کہ میں نے کبھی غلطی نہیں کی۔ یہ واقعے کے بھی خلاف ہے اور فطرتِ انسانی کے بھی۔ یہ مطلب ضرور لیا جا سکتا ہے کہ فانیؔ صاحب کی صحبت سے مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچا لیکن ایسا بھی نہیں ہے۔ ایک فائدہ مجھے فانیؔ صاحب سے یہ پہنچا کہ ان کی ہمّت افزائی سے مجھ میں خود اعتمادی پیدا ہو گئی۔ کوئی صاحب اسے غلط فہمی بھی کہہ سکتے ہیں لیکن میں اسے خود اعتمادی ہی سمجھتا ہوں۔ اس خود اعتمادی میں سب سے بڑا ہاتھ فانیؔ صاحب، جگرؔ صاحب اور جوشؔ صاحب کا ہے۔ اس کے علاوہ ان حضرات کے ساتھ مخصوص اور مختصر صحبتوں میں شرکت کرنا پڑتی تھی ان صحبتوں کی داد اور بیداد میرے نزدیک بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ میرے جیسے نوعمر اور نو وارد شخص کے لیے، جس کا کوئی مقام اور حیثیت متعیّن نہ ہوئی ہو ایسی محفلوں میں داد کے ساتھ بیداد کا خطرہ بھی رہتا ہے۔ دوسرا بہت ہی اہم فائدہ یہ ہوا کہ ان صحبتوں نے میری انفرادیت کو ابھارا۔

ان شعرا کے مضامین اور انداز سے بچ کر کہنا اور پھر اس کے مقابلے میں مخصوص سخن سنج حضرات سے داد حاصل کر لینا معمولی بات نہ تھی۔

فانی صاحب سے میری آخری ملاقات اپریل ۱۹۳۵ء میں ہوئی جب کہ وہ حیدر آباد سے جے پور کے ایک یادگار مشاعرے میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ یہ طرحی مشاعرہ ۲۰/۲۱/۲۲/ اپریل ۳۵ء کو جے پور کے تاریخی عجائب گھر کے البرٹ ہال میں ہوا تھا۔ اس مشاعرے میں فانی صاحب کی ایک نمایاں حیثیت ان کی شاعرانہ عظمت کے علاوہ یہ بھی تھی کہ وہ ریاست حیدر آباد کے نمائندے کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے اور اسی لیے تمام شعرا سے علیحدہ آگرہ ہوٹل جے پور میں ان کے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس مشاعرے کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ مولانا امجد حیدر آبادی نے اس میں اپنی طرحی غزل سنائی۔ اس موقع پر بہتر یہ ہوگا کہ اس مشاعرے کے متعلق چند دل چسپ اقتباسات رسالہ ''روشنی'' جے پور سے پیش کر دیے جائیں۔ یہ نمبر آل انڈیا مشاعرہ نمبر کے نام سے نکلا تھا اور اس سب سے زیادہ عجیب چیز منشی امیر الدین خاں صاحب شوخ کے الفاظ سے کھینچے ہوئے وہ قلمی چہرے ہیں جو انھوں نے مخصوص شعرا کی صورت و سیرت، مزاج و انداز کے امتزاج سے مرکّب کیے ہیں۔ ان شعرا میں سے چند مرحوم ہو گئے ہیں اور جو زندہ ہیں وہ بھی اتنے بدل گئے ہیں کہ شاید خود اپنے کو نہ پہچان سکیں:

خود شری حضور پر نور دام اقبالہ وجلالہ (مہاراجہ جے پور) رونق افروز بزمِ مشاعرہ ہونے والے تھے۔ دو خاص ایڈی کانگ تشریف لے آئے تھے لیکن سلور جوبلی کی مصروفیت مانع جلوہ افزائی رہی۔

بزم کا افتتاح جناب لفٹنٹ کرنل سر ہنری بیچم کے۔ سی۔ آئی۔ ای۔ ای۔ سی۔ بی۔ ای وائس پریسیڈنٹ کی تقریر سے ہوا۔ یہ تقریر نہایت مختصر لیکن کافی جامع اور اپنے موقع کے لحاظ سے بہترین تھی اور اس قابل تھی کہ جے پور میں جو حضرات ذرا بھی شعر و شاعری سے دل چسپی رکھتے ہیں وہ سوچیں کہ شاعری محض چند ارکان پر مناسب الفاظ ٹھیک بٹھا دینے کا نام نہیں ہے۔ نہ شاعری اس کا نام ہے کہ قدما کے خیالات کو بہ تبدیلِ الفاظ و اسلوب اپنا بنالیں بلکہ شاعر ہونے سے پہلے اس کی ضرورت ہے کہ فطرت کی اداؤں سے دل چسپی پیدا کی جائے...

جناب ممدوح کے بعد سیّد احمد علی شاہ جعفری ایم اے ال ال بی صدر مجلس استقبالیہ نے مختصر تقریر میں محترم مہمانوں کی تشریف آوری، شہر کے اربابِ ذوق کی دل چسپی و تکلیف فرمائی کا شکریہ ادا کیا۔ اس تقریر کے بعد باتفاق رائے جملہ حاضرین عالی جناب پنڈت امرناتھ صاحب

اٹل ایم اے۔ صدر مشاعرہ کمیٹی مسندِ صدارت مشاعرہ پر جلوہ افروز ہوئے اور سب سے پہلے حضرت فانؔی بدایونی نے غیر طرحی غزل پڑھی۔

مشاعرہ چار نشستوں اور چھتیس گھنٹوں میں ختم ہوا اور کل ایک سو ستر شعرا نے اپنا کلام پڑھا۔ سب سے بڑی خصوصیت جو اس مشاعرے کو حاصل ہوئی وہ یہ ہے کہ شہر یار دکن حضور نظام خلد اللہ ملکہ نے ریاست حیدر آباد کے نمائندے کی حیثیت سے مولانا شوکت علی فانؔی بدایونی کو ریاست سے مصارفِ سفر عطا کر کے شرکتِ مشاعرہ کے لیے بھیجا اور یمین السلطنت ہزا کسلنسی مہاراجہ سر کشن پرشاد بالقابہم نے اپنا کلام عطا کر کے حضرت ماہر القادری کو پڑھنے کے لیے بھیجا۔ چوں کہ حضور ممدوح زمانۂ محرّم میں غزل نہیں لکھتے ہیں اس لیے طرح میں سلام ارشاد فرمایا۔

خاص خاص شعرا سے روشناسی و تعارف

پنڈت امرناتھ صاحب ساحر دہلوی

اپنی خضر صورتی سے کلجگ میں تقدّس کا دیوتا۔ اخلاق و آداب کا ایسا پجاری کہ ڈنڈوت کے قابل۔ ہماری ہندستانی روایات تمدّن و معاشرت کا نمونہ۔ ستّر کے قریب عمر مگر جمہور کا اس قدر محبوب کہ جی چاہتا ہے کہ:

لاکھوں برس رہے وہ اسی سن و سال میں[۳]

جی ہے کہ اس کے شعروں سے سیر ہی نہیں ہوتا اور چاہتا ہے کہ:

وہ کہے جائیں ہم سنے جائیں

مقطع آتے ہی رزی کو جواُن کی پشت پر کھڑا ہے، کوسنے کو جی چاہتا ہے کم بخت جھک کے کیوں نہیں کہہ دیتا کہ:

تھوڑی سی اور ڈال دو جامِ سفال میں

پنڈت برجموہن وتاتریہ صاحب کیفی

مٹھی بھر آدمی مگر کوہِ وقار۔ باریک نقشہ، دھان پان۔ نظم کا بادشاہ، نثر کا سلطان، آنکھوں میں موہ لینے کی طاقت، زبان میں مسحور کر دینے کی طلاقت، پرانی اور نئی معاشرت دونوں کا ملا جلا قابلِ تقلید نمونہ، خود کچھ کہے تو دوسروں کو ہمہ تن گوش بنا دے۔ دوسروں سے سنے تو خود ہمہ تن گوش بن جائے۔ اخلاق و آداب اس کی گھٹّی میں پڑے ہیں دوسروں کے جذبات کا احترام اس کی جبلّت میں ہے۔ عقیدت آگے بڑھ کر منہ وم لیتی ہے، جب وہ کہتا ہے:

مختار ہونے پر ہی نہیں حریّت کا حصر
ثابت ہوا یہ ہم کو حیات بلال میں

ظالم نے ہندستان میں پیدا ہوکر اپنی قیمت گرادی۔ یورپ و امریکہ میں پیدا ہوتا تو اس کا ایک ایک بول بنکوں کے توسّط سے پبلک تک پہنچتا۔

ساغر صاحب نظامی اکبر آبادیؒ

مشاعرے کی فلم کا اسٹار اور بہترین اداکار۔ ہر مشاعرے کے مجموعہ ساز کی بنسری۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کے الفاظ میں ''ناظورۂ دل نواز'' نیاز فتح پوری کی اصطلاح میں ''پیکرِ شعریت'' اگر شعر کو مختلف قافیہ سمجھیے تو وہ قافیہ ''جمال'' بھاشا شاعری کا ''چیلا'' اردو شاعری کا برق تمثال۔ غزل میں مضامین عشرت انگیز سے ہیجانِ لطیف کو برانگیختہ کرنے والا غزل پڑھی تو بہاری ست سئی کے نایکہ بھید کے ریکارڈ کو سنا دیا۔ نظم پڑھی تو قاآنی کے ترنّم کو تازہ کر دیا۔ روٹھ کر جلد منّنے والا، تھوڑے سے انکسار کے بعد بہت پڑھنے والا۔

جوش صاحب ملیح آبادی

جوش ملیح آباد غلط بلکہ صبیح جوش آباد۔ نمود ظاہر کے اعتبار سے پورا افغان، لہجے کے لحاظ سے کچھ ایرانی گو اس کا ترنّم شرمندۂ آداب موسیقی نہ ہو مگر اثر انداز۔ یہی ہمارے تمھارے بولنے کے معمولی الفاظ ہیں۔ مگر جدّتِ ترکیب اور خوبیِ تدبیر سے اعجاز معلوم ہوتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جوانی کی تنگ آغوش سے خود کو نکلتا دیکھ کر پریشان ہے اور سرگرم فغاں:

مرضی ہو تو سولی پہ چڑھانا یارب
سو بار جہنّم میں تپانا یارب
معشوق کہیں آپ ہمارے ہیں بزرگ
ناچیز کو یہ دن نہ دکھانا یارب

جو انسان بچّوں کی طرح تقدیر کی انگلی پکڑ کر پانو چلتے ہیں ان کو تدبیریں بتلا کر پروان چڑھاتا ہے۔ جو دل مایوسی کی قبریں بن گئے ہیں ان میں امنگ و حوصلہ اور عمل کی دنیائیں بساتا ہے۔

پنڈت آنند نرائن ملا خلف جگت نرائن

بڑے باپ کا بڑا بیٹا، نوخیزی سے آگے بڑھ کر نوجوان بھاری بھرکم کرزن فیشن پر گاندھی کیپ۔ برج نرائن چکبست سے کچھ فیض اشراقی پائے ہوئے نہ تنہا خوش رو بلکہ خوش گو۔ ان

ہی کی کوشش سے ساحل گومتی کے اتنے مایۂ ناز شاعر ہماری وادیٔ گلستان[۵] تک آئے۔

تاباں صاحب بدایونی

مشاعرے کا گاماں۔ بزم کا سینڈو۔ پہلوانِ سخن۔ بلا کا شاعر۔ اپنی شہ زور اداکاری سے البرٹ ہال میں زلزلہ پیدا کر دیا۔ اٹھ کر، بیٹھ کر حرکات سے زبان سے اس طرح شعر کو ادا کیا کہ جس نے سنا اس نے نعرۂ تحسین بلند کیا۔ جس نے دیکھا وہ داد کے لیے چلا اٹھا۔ پرانی تہذیب کا شائستہ نمونہ۔ امیرانہ ٹھاٹھ میں کچھ فقیری کی لٹک۔ خودداریوں میں انکسار کی آمیزش۔

نواب محمد غوث صاحب دھولپوری[۶]

ساٹھ سے متجاوز۔ کسرتی بدن۔ آنکھوں میں کاجل کی باریک تحریر۔ سر پر شانہ و آئینہ کی امداد سے ہموار پٹے، بھرا چہرہ، سینہ برّاق، نورانی ڈاڑھی، فراخ سینہ، چست انگرکھا، تنگ مہری کا پاجامہ۔ رات کے جلسے میں ہلکا کاسنی عمامہ باندھے دن کی مجلس میں سفید ریشم سے کڑھی گول ٹوپی اوڑھے۔ بار بار اپنے ڈنڑ بلّوں پر نظر دامن کو شکن سے بچانے کی کوشش۔ غرض کہ اس عمر میں ایک دیدار و انسان اور اس عہدِ تساہل میں بے انتہا رکھ رکھاؤ کا نمونہ۔ شعر سے دلچسپی اور جسمانی آن بان سے معلوم ہوتا ہے کہ اکھاڑے کو مشاعرہ ہی نہیں بلکہ بارہا مشاعرے کو اکھاڑا بھی بنایا ہوگا۔

جگر صاحب مرادآبادی

نجد کے مجنوں نے ہندستانی لباس پہن لیا ہے..... آشفتہ گیسو لباس سے بے پروا۔ استغنا کی لہروں میں بہا جاتا ہے....

کچھ شاعروں نے روحانی قوّتوں کو ابھارا، کچھ نے گرمیٔ عمل پیدا کی، کچھ نے نشاطِ لطیف کو گدگدایا۔ جگر نے مشاعرے میں کیف کی پھواریں برسائیں جس سے ہر سامع مست ہوگیا۔

میکش صاحب اکبرآبادی

سادہ رو، سادہ لباس کچھ خود میں گم۔ اپنی آنکھوں سے اپنے تخلص کو بتلا دیا۔ متین مفکّر، شعر کہہ کر مزے نہیں لیتا بلکہ مزے میں آکر شعر کہتا ہے۔ اداکاری کا شوق نہیں کچھ پروائے ترنم نہیں مگر لوگ ہیں کہ بے ساختہ داد دیتے ہیں۔

حضرت ماہر القادری حیدرآبادی[۷]

حیا پرور نوجوان، نہ آنکھ ملا کر شعر پڑھتا ہے نہ داد کا شکریہ آنکھ ملا کر ادا کرتا ہے۔ اپنے اشعار سے چٹکیاں لیتا ہے مگر نہیں جانتا کہ کون کون بے چین ہوا۔

سراجؔ صاحب لکھنوی

لکھنوی تہذیب کا حامل خواجہ وزیرؔ و نسیمؔ سے کچھ ورثہ پائے ہوئے خانوادۂ انیسؔ کی زبان کا کچھ چٹخارہ لیے ہوئے جواں عمر، جواں خیال، جواں طلب۔ اف حاصلِ مشاعرہ شعر لکھ گیا۔

کچھ اور مانگنا مرے مشرب میں کفر ہے

لا اپنا ہاتھ دے مرے دستِ سوال میں

شوکت علی صاحب فانیؔ بدایونی

مشاعرے میں فرخندہ بنیاد ریاست حیدرآباد دکن کا قائم مقام۔ متین کہ دوسرے کو خود بیں ہونے کا دھوکا ہو جائے۔ اتنا صاحبِ تمکین کہ تمکنت کا گماں ہو جائے۔ سخن ور سے زیادہ سخن فہم کبھی عوام کے غوغا اور ناشناساؤں کے شورِ تحسین سے متاثر ہو کر داد نہیں دی۔ اسی شعر پر سر ہلا دیا یا داد دی جو بیاضِ مشاعرہ میں انتخاب ہے۔

شیر محمد خاں صاحب بومؔ ہاپوڑی

اس میں شک نہیں کہ پے در پے شعروں کے تداخل سے گودماغوں کو ہیضہ و تخمہ کی نوبت نہیں پہنچی تھی مگر گرانی ضرور ہو گئی تھی مگر بوم بولا اور خوب وقت پر بولا۔ اس کے اشعار نے دماغی جُلاّب کا کام دیا۔ سامعین ترو تازہ ہو گئے سب کوفت رخصت ہو گئی۔ اس کے شعروں پر چار پانچ ہزار آدمیوں کے نعرہ ہائے تحسین بار بار چھت کے بلوریں جھاڑوں سے ٹکراتے تھے۔ ہال کے درو دیوار یوارِ قہقہہ بنے ہوئے تھے مگر اس بندۂ خدا کے چہرے پر تبسم کا نام و نشان بھی نہ تھا۔

مولوی سیّد محمد معشوق حسین صاحب اطہرؔ ہاپوڑی ثم جے پوری

دبلا پتلا ہڈیوں کی مالا، تقاضائے سن کی وجہ سے قدموں سے سینہ آگے۔ امامِ فن زبانِ اردو کا جیتا جاگتا، چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا۔ شاعر ہی نہیں بلکہ شاعر گر۔ شاعری کے قدیمی اسکول کا آخر اور تنہا مسلم الثّبوت استاد۔

منشی لچھمی نرائن صاحب سخاؔ جے پوری

سینہ تانے ہوئے چست لباس۔ کھوپڑی شکن ڈنڈا ہاتھ میں۔ آواز میں کڑک۔ غزل پڑھے تو فوجدارِ سخن [8] معلوم ہو۔ مصرع اٹھائے تو خود شاعر پر چھا جائے۔ ہر انتظام کا اہل۔ ریٹائر ہونے پر بھی نئے رنگروٹوں سے زیادہ مستعد۔ مرنجان و مرنج۔ یار شاطر، صلح کل کا عامل۔ جب شاعر ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو تو یہ فریقین کی ٹھوڑیوں میں ہاتھ ڈال کر منتیں کرتا ہے لیکن جب

کوئی بزرگوں کو بے ادبی سے یاد کرے تو یہ آپے سے باہر ہو جاتا ہے شاہ نصیر کی پانچویں پشت میں۔ الفاظ شعر میں فارسی ترکیبوں سے دلآویزی۔ معانی میں کچھ مقدس محبت کی لذت بخش چاشنی۔

ہائے یہ شعر اس کا نہ ہوتا، میرا ہوتا:

صاف آرہی ہے اس سے صدائے درود پاک
پہچانتے ہیں ہم یہ سخا کا مزار ہے

مولوی سید انوار الرحمٰن صاحب بسملؔ جے پوری

لباس و انداز سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کی کسی اکیڈمی کا نہیں بلکہ ہارون رشید کی بے تکلف مجلس علمی کا کوئی رکن عزیز ہے۔ سرخ وسفید چہرے پر سفید ڈاڑھی کی شعاعیں بہت عقیدت فریب ہیں۔ آغوشِ تصوف و مہدِ علوم کا پرورش یافتہ۔ کسی کا معتقد ہو تو کان پکڑی چھیلی۔ کسی جگہ بے باک ہو تو ننگا قلندر۔ عربی فارسی کا منتہی، اردو کا ادیب۔ ہر زبان میں نظم ونثر پر حاوی۔ اس کی پیری کی آغوش میں اس کا دل ابھی تک نوجوانوں کی طرح مستانہ انگڑائیاں لیتا ہے۔

منشی چند بہاری لال صاحب صباؔ جے پوری

دستار سے جھاڑ شاہی، گفتار سے دہلوی، رفتار سے لکھنوی، مائلؔ کی جائداد بت خانہ وے خانہ ورحمت کا ورثہ دار۔ بڑے مزے کے شعر کہتا ہے مگر صرف دل نواز۔ سامعہ نوازی کی حسرت رہ جاتی ہے۔ جے پور کے مشاعروں میں شمع کا مرتبہ رکھتا ہے کہ جب تک کہ یہ سامنے نہ ہو پڑھنے میں لطف نہیں آتا۔

حضرت سیمابؔ اکبرآبادی

۱۹۰۶ء میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو وہ بقول امیر خسرو کے:

زیبقِ لرزاں نہ کفِ مرتعش

تھا لیکن اب وہ بظاہر ''سیماب قائم'' معلوم ہوتا۔ گوسن وسال وتجربات دنیوی نے اس میں متانت پیدا کردی مگر اس کے اشعار میں شوخیاں اب تک کھل کھیل رہی ہیں وہ اب بھی ایسا سیماب ہے جس کی شاعرانہ فطرت میں آتش خانے دبے ہوئے ہیں۔ گٹھا ہوا بدن خوش منظر طرز ولباس سے وضعِ جدید کا ابتدائی نمونہ۔ مشاعروں کی جان۔ انگلیوں پر گنے جانے والے چند اساتذۂ ہند میں سے ایک۔

(رسالہ روشنی۔ جے پور بابت مارچ واپریل ۱۹۳۵ء)

اس زمانے میں جے پور میں میرے بھائی سیّد احمد علی شاہ جعفری منصف ہو کر گئے تھے۔ اس سے پہلے وہ آگرے میں وکالت کرتے تھے اور فانی صاحب کے ہم پیشہ ہونے کی وجہ سے بھی فانی صاحب سے ان کے تعلقات تھے۔ میں جے پور پہنچا تو بھائی نے مجھ سے کہا کہ فانی صاحب کئی مرتبہ آپ کو دریافت کر چکے ہیں اور خود بھی تشریف لائے تھے تو دریافت کرتے تھے۔ ہم لوگ صبح کے ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ فانی صاحب مسکراتے ہوئے تشریف لائے اور مجھ سے لپٹ گئے۔ ان کے چہرے پر آگرے کی بہ نسبت رونق تھی۔ شیروانی بھی خلافِ معمول سفید ریشم کی تھی اور لباس میں بھی قدرے تکلف تھا وہ تھوڑی دیر بیٹھے پھر مجھے ساتھ لے کر آگرہ ہوٹل چلے گئے، یہیں ان کا قیام تھا۔ ایک موٹر کار ان کے لیے چوبیس گھنٹہ متعیّن تھی۔ کار میں بیٹھتے ہی کہنے لگے بغیر سوچے ہوئے اور انتخاب کیے ہوئے جلدی سے اپنا کوئی تازہ شعر سنا دیجیے۔ میں نے عرض کیا۔

بے گانگی نے تیری دیا ہوش غیریت
ثابت ہوئے ہیں کس ستمِ ناروا سے ہم

بہت خوش ہوئے غالباً وہ میری شاعرانہ رفتار کا اندازہ کرنا چاہتے تھے۔ پھر فوراً اپنا یہ شعر سنایا۔

گرچہ تھی صبحِ آگرہ بے نور
اوج پر تھا مگر ستارۂ شام

یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ شعر ان کے ایک منظوم خط کا ہے جو انھوں نے حیدرآباد سے حافظ امام الدین اکبرآبادی کو لکھا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ حافظ صاحب بھی اس شعر کی تلمیح سے واقف ہوں گے مگر میرے دریافت کرنے پر حافظ صاحب نے فرمایا کہ انھیں اس کے متعلّق کچھ علم نہیں ہے اس لیے غالباً میں ہی وہ تنہا شخص ہوں جو اس شعر سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ پھر ہم دونوں بہ مجبوری علیحدہ ہوتے۔ مشاعرے میں بھی کم جاتے اور جب جاتے اور جہاں جاتے ساتھ ساتھ جاتے ادھر ادھر گھومتے رہتے اور باتیں کرتے رہتے ۔ اب تو یاد بھی نہیں، جانے کیا باتیں تھیں وہ۔ کبھی ختم نہ ہونے والی باتیں لیکن جو ختم ہو ہی گئیں اور ہمیشہ کے لیے ہو گئیں۔

چند واقعات وہاں ایسے پیش آئے جو فانی صاحب کے ساتھ یاد آجایا کرتے ہیں۔ فانی صاحب نے کہا۔ پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی آئے ہوئے ہیں ان کی طبیعت بہت خراب ہو گئی

ہے چلو عیادت کر آئیں۔ پنڈت ساحؔر صاحب اپنے بھائی معجزؔ صاحب اور پنڈت کیفیؔ صاحب کے ساتھ پنڈت امرناتھ اٰتلؔ صاحب کی کوٹھی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ساحؔر صاحب نے لیٹے ہوئے تکیے سے سر اٹھا کر فرمایا۔ تعظیم معاف میں بیٹھنے سے بھی معذور ہوں، اسہال کی شدید تکلیف ہے۔ وہ واقعی بہت کمزور ہو گئے تھے ان کی عمر اور پھر مرض کی نوعیت۔ فانیؔ صاحب باہر آ کر فرمانے لگے کہیں یہ حضرت ختم نہ ہو جائیں۔ مشاعرہ رکھا رہ جائے گا۔ پھر دوسرے روز مشاعرہ شروع ہوا تو ساحؔر صاحب اپنا فرشی حقّہ لگائے مشاعرے میں تنے ہوئے بیٹھے تھے اور متواتر تین روز ہر نشست میں شروع سے آخر تک اسی طرح بیٹھے رہے۔ فانیؔ صاحب انھیں دیکھتے پھر میری طرف گھور کر مسکراتے۔

جے پور کے مشاعرے میں حیدر آباد سے مرزا یگانہؔ چنگیزی آئے تھے۔ میرے ان کے مخلصانہ مراسم کا فانیؔ صاحب کو علم تھا۔ فرمانے لگے مرزا یگانہؔ مجھ سے ایک غلط فہمی کی بنا کر خفا ہو گئے ہیں چلو ان سے صلح کرا دو۔ ہم یادگار میموریل میں یگانہؔ صاحب کا کمرہ تلاش کرتے ہوئے پہنچے۔ فانیؔ صاحب کے علاوہ تمام شعرا یہیں مقیم تھے۔ مرزا صاحب نہایت شائستہ آدمی تھے۔ وہ بڑے تپاک اور خلوص سے پیش آئے مگر صرف مجھ سے۔ اپنی کرسی چھوڑ کر پلنگ پر بیٹھ گئے، مجھے کرسی پر بٹھایا۔ فانیؔ صاحب کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ نہ ان سے بیٹھنے کو کہا میں ان کے اس طرز سے بے کیف ہو کر معذرت کر کے فانیؔ صاحب کو ساتھ لے کر اٹھ آیا۔ اسی روز شب کو مشاعرے کی آخری محفل تھی اور اساتذہ کے پڑھنے کی باری تھی یگانہؔ صاحب کو کچھ تو اسی مجلس میں جگرؔ صاحب نے برافروختہ کر دیا تھا اور پھر وہ اس لیے ناخوش ہو گئے کہ ان کا نام فانیؔ صاحب سے پہلے پکار لیا گیا۔ وہ ڈائس پر تشریف لے گئے اور محفل کو مخاطب کر کے فرمایا: غزل تو میں نے پوری ہی لکھی ہے مگر جس نمبر پر مجھے آواز دی ہے اس نمبر پر صرف چار شعر ہی پڑھوں گا۔ پھر انھوں نے واقعی صرف چار شعر ہی پڑھے ورنہ عموماً شاعر چار شعر پڑھنے کا اعلان کر کے چودہ شعر پڑھتے ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ کسی نے ان سے پوری غزل پڑھنے کے لیے نہ اصرار کیا نہ اور کوئی معذرت۔ شعرا کی ترتیب کا معاملہ اس سے ایک روز پہلے طے ہو چکا تھا۔ وہ بھی مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ ہوا یہ کہ پنڈت امرناتھ صاحب اٰتلؔ صدر مشاعرہ [11] نے جے پور اور باہر کے چند مخصوص اور تجربہ کار شعرا کو جمع کیا اور کہا کہ شعرا اول آخر پڑھنے پر اکثر ناراض ہو جاتے ہیں۔ میں یہ ذمّہ داری اپنے اوپر لینا نہیں چاہتا۔ آپ سب حضرات کو اس لیے زحمت دی ہے کہ اپنی اور دوسرے شعرا کی فہرست مرتب کر دیں۔

اس مجلس شوریٰ میں پنڈت امرناتھ ساحرؔ دہلوی۔ پنڈت کیفیؔ دہلوی۔ فانیؔ صاحب بدایونی بسملؔ صاحب جے پوری اور کتنے ہی موقر حضرات تھے۔ مجھے بھی نہ معلوم کسی لحاظ سے مدعو کرلیا گیا تھا۔ شعرا کو نمبر دیے جارہے تھے جب میرا نمبر آیا تو پنڈت ساحرؔ صاحب نے اس پر اعتراض کیا اور آپس میں ردّ و کد ہونے لگی۔ ساحرؔ صاحب کی دلیل یہ تھی کہ کلام کے علاوہ عمر اور شہرت کا لحاظ بھی ضروری ہے۔ بات بڑھتی جارہی تھی کہ ایک صاحب نے پنڈت صاحب کو ہوشیار کیا کہ میکشؔ بھی یہاں موجود ہیں۔ پنڈت جی نے ذرا سا تامّل کیا چاروں طرف دیکھا میں فانیؔ صاحب کے پیچھے خاموش بیٹھا ہوا تھا پھر انھوں نے فرمایا۔ ہاں میں انھیں خوب جانتا ہوں یہ میرے بچے ہیں۔ ان کے بزرگوں سے میرے بڑے گہرے تعلّقات تھے مگر میں اس موقع پر تعلّقات کا لحاظ نہیں کرسکتا۔ سب لوگ اور خصوصاً اثلؔ صاحب مجھے غور سے دیکھ رہے تھے۔ مجھے واقعی کوئی ناگواری نہیں تھی۔ میں اپنا مقام پہچانتا تھا میں نے ساحرؔ صاحب کی تائید کی اور ان کا شکریہ ادا کیا اور پھر میرا نام سراجؔ صاحب اور قدیرؔ صاحب لکھنوی کے ساتھ رکھ دیا گیا۔ میرے اس عمل کا صلہ مجھے اثلؔ جی نے اپنی پرخلوص دوستی کی شکل میں دیا۔ میرا خیال ہے کہ وہ میرے اس طرزِ عمل سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ وہ میرا تعارف ہمیشہ اپنا دوست کہہ کر کراتے۔ میرے یہاں آتے اور شادی دغمی میں عزیزوں کی طرح شریک ہوتے اور شریک کرتے۔

پھر جے پور سے فانیؔ صاحب آگرے آئے، ایک دن قیام کیا۔ دن بھر ساتھ رہے شام کو انھوں نے اور دوستوں کے ساتھ میرے یہاں کھانا کھایا۔ غزلیں سنیں سنائیں خط نہ لکھنے اور حیدر آباد نہ آنے کے شکوے اور پھر وعدے ہوئے اور پھر حیدر آباد کے لیے رخصت ہوگئے۔ کیا معلوم تھا کہ یہ آخری معانقہ ہے اور پھر ہم کبھی نہ ملیں گے اور پھر مجھے یہ سب معمولی معمولی واقعے اتنے عزیز ہوجائیں گے جتنے فانیؔ صاحب۔ ان کے بجائے ان واقعوں سے سکون حاصل کیا جائے ان کا ذکر ہماری صحبتوں میں موضوعِ سخن بنے گا لوگ مجھ سے ان کے حالات پوچھیں گے، ان کی باتیں سنیں گے اور میری طرح خود سننے والے بھی یہ محسوس نہ کریں گے کہ ایک دن یہ داستان بیان کرنے والا خود بھی داستان بن جائے گا۔

حواشی:

۱ حرفِ تمنا میں یہ مصرع بدل دیا گیا ہے۔

۲ تسنیم ایک رسالہ تھا جو غالباً ۱۹۳۰ء میں فانیؔ بدایونی، مانیؔ جائسی اور مخمور اکبرآبادی کی ادارت میں آگرے سے

شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ فانی صاحب کا نام تھوڑے عرصے بعد اس میں سے حذف کر دیا گیا اور رسالہ مانی صاحب کی ادارت میں کئی سال جاری رہا۔ پہلے نمبر میں فانی صاحب نے ایڈیٹوریل نوٹ لکھا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ شاعری میں جو فن کاری اور نوک پلک ان کے یہاں ہے وہی ان کی نثر میں بھی تھی۔ اگر کسی صاحب کے پاس "تسنیم" کا وہ نمبر ہو تو امید ہے کہ وہ اس میں سے فانی صاحب کی وہ عبارت شائع فرما کر شکریے کا موقع دیں گے۔ میکش

۳ مشاعرہ اسی طرح میں ہوا تھا

۴ ساغر صاحب کا وطن غالباً میرٹھ ہے مگر نقل راچہ عقل۔

۵ گلستاں۔ جے پور میں ایک پہاڑی پر بڑا تالاب ہے جو مقدس بھی سمجھا جاتا ہے۔

۶ دھولپوری نہیں بلکہ بھرتپوری

۷ یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ آپ ضلع بلند شہر کے رہنے والے ہیں

۸ منشی صاحب ریاست جے پور میں فوجدار کے عہدے پر مامور تھے۔ فوجدار تقریباً سٹی مجسٹریٹ کے مترادف ہے۔

۹ ریاست جے پور کے سکّے پر جھاڑ کا نشان تھا۔ اس لیے اسے سکّہ جھاڑ شاہی کہتے تھے۔

۱۰ مرزا مائل دہلوی مرحوم صبا صاحب کے اُستاد

۱۱ راجا امرناتھ اٹل۔ نسلاً کشمیری برہمن اور سر تیج بہادر سپرو کے داماد۔ اس زمانے میں ریاست جے پور میں وزیر مالیات تھے۔ صورت شکل، لباس، عادات، اطوار سے بالکل یورپین شاہزادے معلوم ہوتے تھے۔ انگلینڈ، امریکہ، روس وغیرہ کا سفر کیے ہوئے بڑے سلجھے ہوئے بزرگ تھے۔ اُردو ادب و شعر کے بڑے دل دادہ۔ افسوس کہ ۱۹۵۶ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

جگر مرادآبادی

یہ بات میرے لیے تکلیف دہ ہے کہ اپنے بزرگوں اور دوستوں کی موت کے بعد مجھے ان کے متعلق کچھ لکھنا پڑے جن کی زندگی میں ان کا میں احترام اور لحاظ کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ انسان تھے اور انسان میں خوبیوں کے ساتھ کچھ خامیاں بھی ہوتی ہیں۔ محبت ان خامیوں کو بھی محبوب بنادیتی ہے اور جدائی کے بعد وہ باتیں بھی یاد آتی ہیں، جو زندگی میں اچھی معلوم نہیں ہوتی تھیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ جگر میں کوئی بات تکلیف دہ نہ تھی سوائے شراب نوشی کے۔ جب وہ ایسی حالت میں میرے پاس آتے تو میں پریشان ہو جاتا اور وہ بڑی سچائی اور دکھ کے ساتھ کہتے ''دعا کیجیے مجھ سے شراب چھوٹ جائے'' خدا نے ان کی یہ دعا سن لی کیوں کہ وہ سچے دل کی دعا تھی۔ اور پھر ان میں جو خوبیاں تھیں وہ پوری طرح نکھر آئیں۔ وہ اتنے اچھے آدمی ہو گئے جتنا ایک انسان کو ہونا چاہیے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔ یوں بھی شراب پی کر ان کا جسم بے قابو ہو جاتا تھا مگر ان کی تہذیب اور شرافت میں فرق نہیں آتا تھا۔

مَیں جگر صاحب کا آگرے کا ابتدائی دور نہیں دیکھا۔ اس دور کی چند سنی ہوئی باتیں عرض کرتا ہوں جو اُن کے بے تکلّف دوستوں سے سنی ہیں۔ ان دوستوں میں حکیم سیّد نثار احمد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ حکیم سیّد وہاج الدین احمد صاحب بفضلہٖ حیات ہیں مگر اُنھیں تفصیل سے کوئی بات یاد نہیں لیکن یہ باتیں میں نے برسوں پہلے بارہا ان سے سنی ہیں۔ یہ دونوں صاحبان آگرے کے مشہور حکیموں کے خاندان کے افراد ہیں۔ ان کا مکان مبارک محل کے نام سے مشہور

ہے جہاں ایک چھوٹا سا کمرہ جگر صاحب کے لیے مخصوص تھا اور جگر صاحب ان حضرات کے ساتھ شطرنج، تاش اور دوسری تفریحات میں منہمک رہتے تھے۔ آگرے میں بی این بیجل کا چشمے کا کارخانہ تھا۔ اس کی ایک شاخ الہ آباد میں بھی تھی اور غالباً وہیں کی شاخ نے جگر صاحب کو اپنا سفری ایجنٹ مقرر کیا تھا اور چوں کہ اس کا صدر دفتر آگرے میں تھا اور بیجل صاحب یہیں رہتے تھے اس لیے جگر صاحب کا آنا جانا شروع ہوا، اور یہاں کے لوگوں سے تعلقات پیدا ہونے لگے اور پھر وحیدنامی ایک مسماۃ سے نکاح ہو جانے کے بعد وہ یہاں رہنے بھی لگے۔

وحید ایک شریف گھرانے کی لڑکی تھی جس کے شوہر نے اسے چھوڑ دیا تھا اور وہ پیشے پر بیٹھ گئی تھی۔ میں نے اس کے والد کو دیکھا ہے۔ وہ ایک سیاہ فام اور لحیم شحیم آدمی تھے اور جوتے کی تجارت کرتے تھے۔ وحید کے یہاں جگر صاحب کا اپنے دوستوں کے ساتھ آنا جانا شروع ہوا اور پھر تعلقات یہاں تک بڑھے کہ نکاح ہو گیا اور دونوں ایک علیحدہ مکان کرایہ پر لے کر رہنے لگے لیکن جگر صاحب کا لا اُبالی پن وہ بہت دنوں تک برداشت نہ کر سکی اور آخر علیحدگی ہو گئی۔ جگر صاحب کے دوستوں کا بیان ہے کہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ وہ گھر سے گوشت ترکاری کے لیے پیسے لے کر چلے ہیں اور پھر شطرنج میں مشغول ہو گئے ہیں۔ دوسرے روز انھیں ہوش آیا کہ گھر جانا ہے لیکن ان پیسوں کی تو یار لوگ مٹھائی کھا چکے۔ اب وہ دوستوں کی امداد کے طالب ہوتے کہ وہ اُنھیں گھر پہنچا آئیں اور وحید کے عتاب سے ان کی جان بخشی کرائیں۔ بی این بیجل جگر صاحب کا بہت لحاظ کرتے تھے۔ وہ بارہا چشموں کا ٹیسٹ بکس فروخت کر ڈالتے مگر بیجل ان سے باز پرس نہ کرتے۔ میرا خیال ہے کہ اس میں بیجل صاحب کی شرافت کے علاوہ تجارت کو بھی دخل تھا کیوں کہ جگر صاحب کی معرفت اُنھیں آرڈر بھی بہت مل جاتے تھے۔

ابتدا سے جگر صاحب کو آگرے میں لوگ بحیثیت شاعر بھی جانتے تھے مگر اُنھیں کوئی خاص مقام نہیں دیتے تھے۔ غالباً اس زمانے میں ان کا کوئی خاص مقام قائم بھی نہ ہوا ہو۔ کہا جاتا ہے کہ جگر صاحب نے مرزا خادم حسین رئیس اکبرآبادی مرحوم (متوفی ۱۹۱۴ء) کو بھی غزلیں دکھائی تھیں۔ اس بات کے راوی آگرے کے ایک معمّر اور مشہور شاعر بابو برِبھودیال شاؔم اکبرآبادی ہیں۔ اسی طرح سیمابؔ اکبرآبادی مرحوم کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ اُنھیں بھی جگر صاحب نے کبھی غزلیں دکھائی تھیں۔ یہ باتیں ایسی نہیں ہیں جن کی تردید یا تائید کی جائے یا اس کی تحقیق کی جائے۔ جگر صاحب نے مجھ سے صرف رساؔ صاحب کو غزلیں دکھانے کا ذکر کیا تھا اور اسی طرح کے

ایک موقع پر کہا تھا کہ اگر میرا استاد بننے سے کسی کی عزت بڑھ جاتی ہے تو مجھے اس کی تردید کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ابھی جون ۱۹۶۲ء کے ''شاعر'' میں بشیر بستانی صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے اس میں اصغر گونڈوی کی عزت افزائی کے لیے اُنھیں جگر صاحب کا استاد لکھا ہے:

''اصغر کی عظمت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے
کہ وہ جگر جیسے مستند شاعر کے استاد تھے۔'' (صفحہ ۱۹)

معلوم نہیں اس سے جگر کی عظمت ثابت ہوگی یا اصغر کی۔ لیکن یہ بات واقعے کے خلاف ہے بلکہ اصغر کو روشناس کرانے کا سہرا جگر کے سر ہے۔ وہ ہر ایک سے ان کا ذکر خیر کرتے، مشاعروں میں ان کی غزلیں خود پڑھتے، اور اس کے باوجود اصغر اپنی جگہ ہیں اور جگر اپنی جگہ۔ جگر صاحب شاہ عبدالغنی صاحب منگلوری سے بیعت تھے اور اصغر صاحب شاہ عبدالغنی کے مخصوص مریدوں میں بلکہ غالباً خلیفہ تھے اور اس میں شک نہیں ہے کہ مسائل تصوّف یا تعلیمِ باطن جگر نے اصغر سے ضرور حاصل کی ہوگی۔ مگر شاعری کا معاملہ اس سے علیحدہ ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ لیجیے کہ جگر کے یہاں اگر تصوّف کا اثر ہے تو وہ اصغر صاحب کی صحبت کا اثر ہونا چاہیے۔ اسی طرح ابھی ''صبح امید'' بمبئی بابت ستمبر ۱۹۶۲ء میں عابد شمسی مراد آبادی کا ایک مضمون ''نیرنگِ خیال'' کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے جس میں روشن فاطمہ نامی کسی اعلیٰ افسر کی لڑکی سے معاشقہ کا حال لکھا ہے جو آگرے کے کسی روشن خیال گھرانے کی لڑکی تھی اور جگر صاحب کو دیکھ کر اور ان کی جادو بھری آواز سن کر ان کی عاشق ہوگئی اور پھر آگرے سے ان کے ساتھ بھاگ گئی اور جگر صاحب کو جیل کی سزا بھگتنی پڑی۔ مضمون نگار نے یہ روایت مراد آباد کی ایک بزرگ سو سالہ خاتون کے نام سے بیان کی ہے۔ اس واقعہ سے جگر جیسے رند ہزار شیوہ کے دامن پر کسی مزید دھبّے کا اندیشہ تو نہیں ہے مگر یہ واقعہ ایسا نہ تھا جو آگرے میں کسی کو معلوم نہ ہوتا۔ جگر صاحب کے ابتدائی دور کے دوست ابھی موجود ہیں اور وہ جگر صاحب کی ایک ایک بات جانتے ہیں مگر نہیں جانتے تو روشن فاطمہ کا اتنا بڑا واقعہ جس میں جگر صاحب نے جیل کی ہوا بھی کھائی ہو۔ روشن فاطمہ کا نام کسی خاندان کی روشن خیالی ثابت کرتا ہو تو اور بات ہے ورنہ ہمارے یہاں مہذّب اور ذی علم خاندانوں میں اس ترکیب کے نام ہوتے نہیں ہیں۔ بہر حال جگر صاحب نے اپنے جو واقعات خود لکھوائے ہیں وہ جب سامنے آئیں گے تو ان واقعات پر روشنی پڑ سکے گی۔

جگر پر اعتراض کرنے والے ایک ہم صحبت سے فانی بدایونی مرحوم نے کہا تھا کہ: ''ایک

زمانہ ایسا آئے گا جب لوگ اس بات پر فخر کریں گے کہ ہم جگر کے ساتھ کسی جگہ بیٹھے تھے۔" یہ ایک پیشین گوئی تھی جس کا ہم میں سے کسی نے یقین کیا اور کسی نے اسے شاعرانہ بات سمجھا مگر آج وہ بات سچ ہو کر رہی۔ بہت سے حضرات جو جگر کو ان کی زندگی میں کوئی خاص مرتبہ نہیں دیتے تھے آج اپنے بیانوں میں ان کے ساتھ خصوصیت اور تعلقات جتا رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ شاعر کی حیثیت سے ان کی زندگی میں عوام نے جتنی ان کی قدر کی کسی شاعر کی نہیں کی۔ شروع شروع میں اونچے طبقے نے ان کی طرف توجہ نہ کی۔ اس زمانے میں غیروں کی حکومت تھی اور فن کاروں سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا لیکن عوام جب بھی ان کی قدر کرتے تھے۔ جب کالج کے طالبِ علم کسی شاعر کو سننے کے لیے تیار نہ ہوتے اور جب عوام کا مجمع شاعروں سے اُکتا جاتا تو ایک جگر ہی کی شخصیت ایسی تھی جن کا نام آتے ہی اور جن کی صورت دیکھتے ہی ساری محفل ہمہ تن گوش ہو جاتی اور ان کی آواز لاکھوں انسانوں پر جادو کر دیتی۔ جگر پہلے عوام میں مقبول ہوئے اور پھر ان کے کمال نے خواص اور حکومت کو ان کی قدر کرنے پر مجبور کیا۔

جگر صاحب کو خدا نے ظاہری حسن نہیں دیا تھا مگر ان میں بلا کی کشش تھی۔ ان کی مسکراتی ہوئی آنکھیں دیکھنے والوں کو پہلی ہی نظر میں موہ لیتی تھیں اور ان کی خلوص بھری آواز دل میں اتر جاتی تھی۔ اگر کسی نے جگر کو نہیں دیکھا تو اس نے محبت کا حسن نہیں دیکھا۔

اب میں یاد کرتا ہوں تو سنیما کی تصویروں کی طرح جگر کی مختلف تصویریں ایک ایک کر کے سامنے آجاتی ہیں اور میں دیکھتا ہوں کہ کیا بہ اعتبار شاعری اور کیا بہ اعتبار انسانیت وہ برابر بلند ہوتے گئے۔ وہ ایک سیڑھی سے دوسری سیڑھی نہیں، بلکہ ایک منزل سے دوسری منزل پر ترقی کرتے گئے۔

میں نے جگر کا شروع کا زمانہ نہیں دیکھا لیکن جب جگر سے میری ملاقات ہوئی ہے تو میری طالبِ علمی کا آخری دور تھا اور میری شاعری کا چرچا احباب سے نکل کر شہر میں پہنچ چکا تھا اور جگر غالباً اس زمانے میں اچھی طرح مشہور ہو چکے تھے مگر میں نے ان کا نام نہیں سُنا تھا۔ کیوں کہ میں شاعروں کی صحبت سے ابتدا سے الگ رہا اور طالبِ علمی کے زمانے میں ادبی رسائل بھی نہیں دیکھ پاتا تھا۔

جگر صاحب کے دوست حکیم سیّد وہاج الدین احمد صاحب نے ایک روز مجھ سے کہا کہ ایک شاعر ہیں جگر، وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے ان سے آپ کا ذکر کیا تھا۔ اور پھر دو تین

روز بعد میرے یہاں کے قدیم ملازم نے مجھ سے کہا کہ ایک شخص رات کو شراب پیے ہوئے آیا تھا، آپ کو پوچھتا تھا، میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ اس نے جگرؔ اپنا نام بتایا تھا۔ یہ ملازم میرے والد کے زمانے کا تھا۔ یہ اطلاع دیتے وقت اس کے لہجے میں درشتی اور اس کی آنکھوں میں تنبیہ تھی۔ میں خاموش رہا۔ میں نے اس سے پہلے کسی شراب پیے ہوئے آدمی کو دیکھا بھی نہ تھا۔ مجھے اس واقعے کا افسوس بھی نہ ہوا، مجھے جگر صاحب سے ملنے کا اشتیاق بھی نہ تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ اب نہ آئیں گے، مگر دو ایک روز بعد وہ دن کے وقت تنہا ہی تشریف لائے اور بڑے خلوص سے ملے اور پھر ملتے ہی رہے۔ وہ تقریباً روزانہ آتے اور پھر کچھ عرصے بعد دن دن بھر میرے پاس رہتے اور اس کے بعد تو وہ باہر سے جب آگرہ آتے تو میرے ہی یہاں قیام کرتے۔ آگرے کے کچھ شاعر اُنھیں پریشان کرتے رہتے تھے اس لیے وہ یہاں کے شاعروں سے خوش نہ تھے۔ لوگ ان کی غزلیں چُرا لیتے اور پھر مشاعروں میں اپنے نام سے پڑھ دیتے۔ اس لیے میرے پاس اُنھیں سکون بھی ملتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ دن بھر میرے یہاں رہے۔ وہ پیے ہوئے تھے۔ پھر شام کو وہ چلے گئے تو میں نے اپنے مکان کی سب سے اوپر کی چھت پر جا کر اطمینان کی سانس لی۔ میرا مکان سڑک پر ہے جگر صاحب مجھے پھر نظر آئے۔ میری طرف ان کی پشت تھی میں اُنھیں دیکھ کر چھپ گیا مگر اُنھوں نے مجھے چھپتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ پھر آ گئے اور بہت ہنسے۔ کہنے لگے۔ میرا اس وقت دوبارہ آنے کا ارادہ نہ تھا مگر آپ مجھے دیکھ کر چھپ گئے اس لیے میں آ گیا۔

ایک بار کا واقعہ، جسے میں حادثہ کہوں گا، مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ جگر صاحب مجھے اپنے ساتھ دلگیر شاہ ایڈیٹر ''نقاد'' کے یہاں لے گئے، وہ میرے ہم محلہ بھی تھے اور قریب کے عزیز بھی اور عمر میں اتنے بڑے کہ ان کا لحاظ مجھے کرنا ہی پڑتا تھا۔ دلگیر شاہ کے پاس ایک وارثی فقیر احرام باندھے بیٹھے تھے اور چار پانچ اور حضرات بھی تھے۔ جگر صاحب نے شیروانی کی جیب سے اَدّھا نکالا اور بہت ہی اخلاص و اصرار سے دلگیر شاہ سے کہا ''آج میں آپ کے ہاتھ سے پیوں گا۔'' دلگیر شاہ نے موقع کی نزاکت محسوس کر کے انکار کر دیا۔ اب جگر صاحب نے نمبر وار ایک ایک سے یہی اصرار کرنا شروع کیا اور سب ہی انکار کرتے گئے۔ یہاں تک کہ نوبت ان وارثی فقیر صاحب تک پہنچی، اُنھوں نے بھی سب کی تقلید کی۔ ان کے بعد میرا نمبر تھا۔ اتنی دیر میں سوچتا رہا کہ اس محفل میں میرے بعض مخالفین بھی ہیں، یہ مجھے بدنام کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے اور اس پر اضافے بھی کریں گے لیکن میں نے یہ اندازہ کیا کہ اس وقت جگر صاحب سے انکار کرنے میں

مجھے خدا سے زیادہ ان حضرات کا خوف ہے اور یہ خوف ریا کاری کے سوا کچھ نہیں اس لیے جگر صاحب نے جب مجھ سے کہا تو میں نے فوراً ان کے ارشاد کی تعمیل کر دی اور پھر جگر صاحب نے ان حضرات کی ایسی تواضع کی کہ اُنھوں نے بھی میری طرح اس واقعہ کو ہمیشہ یاد رکھا ہوگا۔

ایک دفعہ میں نے اُن کی فراست کا عجیب واقعہ دیکھا۔ایک صاحب نے اُنھیں ایک غزل سُنائی جو کسی رسالے کے تازہ شمارے میں شائع ہوئی تھی،اور پوچھا بتایئے یہ غزل کس کی ہے۔جگر صاحب اس وقت مخمور تھے اور بے توجہی سے سن رہے تھے۔جگر صاحب نے کہا پھر سنایئے اُنھوں نے پھر سُنائی۔جگر صاحب نے ایک منٹ تامل کیا اور کہنے لگے یہ غزل وحشتؔ کی ہوسکتی ہے۔اور وہ غزل وحشتؔ ہی کی تھی۔

وہ کہا کرتے تھے کوئی شعر نیا نہیں ہے۔میں دعویٰ کرتا ہوں کہ آپ کوئی سا شعر سنایئے۔میں اس مضمون کے شعر آپ کو سنادوں گا۔

اُنھیں شعر سنانے کا شوق نہ تھا اور ہو بھی کیسے سکتا تھا۔جب کہ ہر شخص ان سے شعر سنانے کی فرمائش کرتا تھا۔لوگ اُنھیں لے جاتے،ان کی ہر قسم کی تواضع کرتے اور گھنٹوں ان سے شعر سنتے۔اس زمانے میں اُنھیں تقریباً سارا کلام زبانی یاد تھا لیکن میں نے دیکھا کہ وہ اپنے بعض دوستوں کو زبردستی بھی شعر سناتے تھے۔ایک مرتبہ وہ کہیں باہر سے آئے اور میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ باہر جارہا تھا میرا سامان سواری پر رکھا جا چکا تھا اور ہم سب کمرہ سے باہر صحن میں نکل آئے تھے۔جگر صاحب سے میں نے معذرت کی۔مگر اُنھوں نے میرا بازو پکڑ لیا۔کہنے لگے میرے شعر سُن کر جانا ہوگا،میں تمھیں یہ غزل سنانے آیا ہوں اور پھر صحن میں کھڑے کھڑے اُنھوں نے سُنانا شروع کر دیا:

دل گیا رونقِ حیات گئی　　غم گیا ساری کائنات گئی

جگر صاحب سارے ہندوستان اور پاکستان میں ایک شاعر کی حیثیت سے آتے جاتے رہے ہیں اور ان کے جاننے والے ہزاروں لاکھوں ہیں۔ایسے واقعے بہت سے اوروں کے ساتھ ہوئے ہوں گے،جن میں سے کچھ میں نے بیان کیے ہیں۔واقعہ یہ ہے کہ ان میں بڑی شرافت اور رواداری تھی اور ان کی انسانیت بہت بلند تھی۔لوگ ان کی غزلیں اور دوسری چیزیں چرا لیتے تھے۔وہ غزلیں جب ان کے سامنے پڑھی جاتیں تو وہ مسکراتے اور بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا کہ ان میں جرأت نہیں ہے۔لیکن ایسا نہیں تھا۔جب کسی بڑے سے بڑے آدمی کے سامنے سچی بات

کہنے کا موقع آتا تو وہ بالکل نہیں چوکتے اور بڑی بے باکی سے سچی بات کہہ دیتے۔ وہ کبھی خوشامد نہ کرتے اور نہ اپنی خوشامد سے خوش ہوتے۔ اپنے دوستوں سے اُنھیں بڑا دلی تعلق تھا لیکن ان کے سامنے اس کا اظہار نہ ہوتا تھا۔ غائبانہ دوسرے لوگوں سے ان کے متعلق کہتے رہتے یا کبھی خطوں میں اس کا اظہار ہو جاتا تھا۔

اگر جگرؔ نہ ہوتے تو غالباً ہماری نئی نسل میں اتنے اور ایسے اچھے غزل گو شاعروں کا وجود نہ ہوتا۔ ان کی غزلوں نے غزل کے مخالفین کے قلعے فتح کر لیے اور ان کے ہتھیار چھین لیے۔ اُنھوں نے اپنی غزلوں سے صرف میدان ہی میں مقابلہ نہیں کیا بلکہ مخالفین کے گھروں میں گھس کر اُنھیں شکست دی۔

جگرؔ صاحب سے جو سب سے بڑا فائدہ مجھے پہنچا وہ ان خاص محفلوں کے ذریعے سے پہنچا جو فانیؔ صاحب کے آگرے آنے کی وجہ سے ہوتی رہتی تھیں اور جہاں مجھے فانیؔ اور جگرؔ کے ساتھ شہر کے سخن فہم اور اہلِ علم حضرات کے سامنے غزلیں پڑھنا پڑتی تھیں اور بے ارادے کے ایک مقابلے کی سی صورت پیدا ہو جاتی تھی۔ ہم نمبروار اپنا اپنا کلام سُناتے۔ ہندوستان کے ان دو بڑے شاعروں کے ساتھ غزل پڑھنا اور داد پالینا میرے لیے بڑی بات تھی۔ میں ان دونوں کے مقابلے میں کم عمر بھی تھا، ناتجربہ کار بھی اور نو آموز بھی۔ اس لیے مجھے زیادہ محنت کرنا پڑتی تھی۔ اور ان شاعروں کے انداز سے بچ کر کہنا پڑتا تھا۔ اس طرح مجھے ترقی کرنے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ جگرؔ سب سے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے میری شاعرانہ اعتبار سے ہمّت افزائی کی۔ اور مجھ میں خود اعتمادی پیدا کی اور اس کے بعد فانیؔ اور جوشؔ صاحبان سے مجھے یہی فائدہ پہنچا۔

جگرؔ صاحب سے آخری ملاقات ۱۹۵۶ء میں ہوئی تھی۔ وہ بہت روز سے آگرے نہیں آسکے تھے۔ کہتے تھے یہ ٹونڈلے کا ٹاپوآگرے کے راستے میں حائل ہو جاتا ہے۔ پورب سے جو گاڑیاں دہلی علی گڑھ جاتی آتی ہیں وہ آگرے آنے کے لیے ٹونڈلے پر بدلنی پڑتی ہیں۔ آگرے والوں کی اور میری بہت روز سے یہ خواہش تھی کہ وہ آگرے آئیں۔ میں نے اُنھیں لکھا اور وہ آگئے اور تین چار روز ٹھہرے۔ اب ان کا خلوص و محبّت ضابطے میں آگیا تھا اور بڑھ بھی گیا تھا۔ وہ بار بار کہتے مجھے سب یاد ہے میں پہلی باتیں بھولا نہیں ہوں۔ اور یہ صحیح تھا۔ وہ اتنے بڑے ہو کر بھی اپنے کو بڑا نہیں سمجھتے تھے۔ یہاں جس جس سے ان کا جس طرح کا ملنا تھا اس سے اسی طرح ملے۔ آگرے میں سینٹ جانس کالج، شعیب محمد انٹر کالج شو مارکیٹ کی انجمن کی طرف سے ان

کے اعزاز میں مشاعرے ہوئے۔سپاسنامے اور نقد تھیلیاں پیش کی گئیں۔گارڈ آف آنرز پیش ہوئے۔فوٹو بلاک ہوئے اور تین چار روز بڑی خوشی اور چہل پہل میں گزرے۔نقد تھیلیاں محفل میں اُنھیں لیتے ہوئے شرم آئی اور یہ خدمت مجھے انجام دینا پڑی۔وہ تنہائی میں بھی روپے شمار کرنے کو بہ مشکل تیار ہوئے۔اس قیام میں ان کے سینے میں ایک دو مرتبہ درد بھی اُٹھا ایک روزہ وہ درد سے بے چین تھے کہ ایک ڈاکٹر صاحب آگئے۔میں نے ان کا تعارف کرایا۔ان کا نام او۔این۔ سکسینہ ہے۔یہاں آگرے کے شفاخانے میں اس زمانے میں ایکسرے وغیرہ کے انچارج تھے اور بہت ہی شریف اور شاعر دوست انسان ہیں۔وہ اپنی مصروفیت کی وجہ سے ان مشاعروں میں شریک نہ ہو سکے تھے جو جگر صاحب کے اعزاز میں ہوئے تھے اور میں نے ان سے وعدہ کرلیا تھا کہ آپ گھر پر آجائیں تو میں جگر صاحب سے ان کا کلام سنوادوں گا۔لیکن ڈاکٹر صاحب تو ایسے وقت تشریف لائے تھے کہ میں جگر صاحب کی تکلیف سے خود بھی بے کیف ہو رہا تھا۔آخر میں نے جگر صاحب سے صرف یہ واقعہ بیان کردیا۔شعر سنانے کی فرمائش کا تو موقع ہی کیا تھا مگر جگر صاحب سنبھل کر بیٹھ گئے۔میں سمجھ گیا اور میں نے کہا۔دو شعروں سے زیادہ میں نہیں پڑھنے دوں گا۔مگر جگر صاحب نہ مانے اور دس بارہ شعر کی ایک پوری غزل سناڈالی۔وہ دوستوں کا بڑا لحاظ کرتے تھے،اور کہا کرتے تھے دوستوں کا میری زندگی میں بڑا اہم مقام ہے۔ایک دن کہنے لگے میرا مجموعہ شائع ہو رہا ہے اس میں میں نے آپ کا نام بھی... اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکے اور نہ میں پوچھ سکا جب ''آتشِ گل'' چھپ کر آیا تب یہ معمّہ حل ہوا۔اسی طرح دورانِ قیام میں اُنھوں نے ایک پارکر ۵۱ نمبر کا قلم میری طرف بڑھادیا۔اُنھوں نے کچھ کہا ہوگا مگر میں نہ سمجھ سکا۔ان کا گلا بھر آیا۔میں نے خاموشی سے قلم اُٹھالیا۔یہ قلم اور اُن کے چند محبّت بھرے خطوط،جن میں وہ اب مجھے ''محبّی و محبوبی'' سے مخاطب کیا کرتے تھے،میرا اعزیز ترین سرمایہ ہیں۔

جگر صاحب جہاں چلے گئے وہیں ہم بھی جارہے ہیں،ہم پھر ملیں گے،اسی محبت اور خلوص سے مسکرائیں گے،قہقہے لگائیں گے اور باتیں کریں گے،فضول اور کارآمد باتیں اور کبھی ختم نہ ہونے والی باتیں۔

مرزا یگانہ چنگیزی کے ساتھ چند لمحے

کسی اخبار میں جب میں نے پڑھا کہ مرزا یگانہ کے جنازے کے ساتھ صرف گیارہ آدمی تھے تو سب سے پہلا خیال جو مجھے آیا وہ یہ تھا کہ اگر گیارہ آدمی تھے تو بہت تھے۔ تعجب تو ان کے مرنے پر ہوا کہ ملک الموت سے ان کی کیسے بنی ہوگی۔ مرزا صاحب اس اصیل مرغ کی طرح تھے جو گردن ٹوٹنے پر بھی ہار نہیں مانتا۔ مرزا صاحب کے متعلق کسی کی رائے جو بھی ہو میرا ذاتی خیال اور تجربہ یہ ہے کہ وہ برے آدمی نہ تھے اور شاید بات تعجب سے سنی جائے کہ وہ مرزا غالب کو نہ صرف یہ کہ برا نہیں سمجھتے تھے بلکہ ایک بڑا شاعر بھی مانتے تھے مگر کچھ بات کی پچ، کچھ چڑ، کچھ مزاج کی ضد ان سب چیزوں نے انھیں عجیب سے راستے پر ڈال دیا تھا اور اسی کے ساتھ یار لوگ انھیں برابر دھمکیاتے رہتے تھے۔ ان کا مزاج ضدی بچوں کا سا تھا جتنا آپ چڑائیں گے وہ چڑتے جائیں گے۔

۱۹۱۸ء کی بات ہے جب میرٹھ ہاپوڑ سے ایک ماہنامہ نکلتا تھا ''خیال'' اس میں یاس عظیم آبادی کے مضامین چھپتے تھے (مرزا یگانہ کا پہلے یہی تخلص تھا) یہ مضامین یا تو مرزا ثاقب لکھنوی اور جناب عزیز لکھنوی پر اعتراض ہوتے تھے یا مرزا یگانہ پر کیے گئے اعتراضوں کا جواب ہوتے تھے۔ مرزا یگانہ کو سب سے پہلے میں نے اس طرح جانا۔ یہ زمانہ میرے لڑکپن کا تھا اس لیے میری رائے کو آپ معتبر نہ سمجھیں مگر مجھے مرزا صاحب کے مضامین اچھے معلوم ہوتے تھے۔ جب معلوم ہوا کہ یگانہ صاحب نے مرزا غالب پر بھی اعتراض کیے ہیں تو مجھے ان کے نام سے نفرت ہوگئی اور میں نے انھیں بھول جانے کی کوشش کی اور بھول گیا۔

بہت زمانے بعد ایک روز مرزا انجم آفندی اکبر آبادی کا رقعہ آیا جس میں مرزا یاسؔ یگانہ کی تشریف آوری کے سلسلے میں ایک مخصوص صحبتِ مشاعرہ کی اطلاع تھی۔ جی تو نہیں چاہتا تھا مگر مرزا انجم آفندی سے تعلّقات ایسے نہ تھے کہ نہ جاتا۔ چنانچہ وقتِ مقررہ پر حاضر ہوا تو اس وقت تک صاحبِ خانہ اور مہمانِ خصوصی کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ نجم صاحب نے مرزا صاحب سے میرا تعارف کرایا اور میں نے خلافِ تہذیب سب سے پہلے مرزا صاحب سے یہ عرض کیا کہ اتنے مشہور ہو جانے کے بعد آپ نے تخلّص کیوں بدل لیا؟ مرزا صاحب نے نہایت متانت سے فرمایا۔ حیدر آباد میں ایسا ہوا کہ میں اپنے ایک دوست کے یہاں ایسے وقت پہنچا کہ وہ چاند دیکھنے کے لیے چھت پر چڑھے ہوئے تھے۔ میری آمد کی اطلاع پر انھوں نے اپنے لڑکوں سے کہا چاند دیکھ کر یاس کا منھ نہ دیکھنا۔ اس بات کا مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ اسی روز میں نے اپنا تخلص تبدیل کر دیا۔ اس کے بعد ہی دوسرا سوال میں نے یہ کیا کہ آپ اپنے نام کے ساتھ علیہ السّلام کیوں تحریر فرماتے ہیں۔ فرمانے لگے کیا نبوّت اور امامت سب آپ بنی ہاشم ہی کے لیے مخصوص ہو گئی ہے۔ میں نے عرض کیا مرزا صاحبان میں کوئی پیغمبر بھی ضرور ہوگا، کہنے لگے مرزا غلام احمد قادیانی۔

اتنے میں شاہ دلگیر مرحوم اور خادم علی خاں صاحب اخضر وغیرہ تشریف لے آئے۔ یہ ہمارے یہاں کے معمّر اور موقّر شعرا میں سے تھے اور مرزا یگانہ کے تقریباً ہم عمر بھی تھے۔ معلوم ہوا کہ دلگیر شاہ سے مرزا صاحب کی رسم قدیم ہے۔ اخضر صاحب سے البتہ اسی محفل میں تعارف ہوا اور اس کے ساتھ ہی لکھنوی شعرا کا ذکر چھڑ گیا۔ مرزا صاحب نے کہنا شروع کیا ایک مشاعرے میں عزیزؔ لکھنوی نے یہ شعر پڑھا جس پر انھیں بڑا ناز تھا۔

دل سمجھتا تھا کہ خلوت میں وہ تنہا ہوں گے
میں نے پردہ جو اٹھایا تو قیامت دیکھی

مگر صاحب میں نے اس طرح داد دی کہ عزیز کہنے لگے تم نے میرے شعر کا ناس کر دیا۔ سب سنتے رہے اور ہنستے رہے، اس کے بعد مشاعرہ شروع ہوا۔ پہلے ہم نو مشقوں نے غزلیں سنائیں اس کے بعد دلگیر وغیرہ اساتذہ نے کلام سنایا۔ مرزا صاحب شائستگی اور وسیع القلبی سے داد دیتے رہے۔ آخر میں مرزا صاحب کی باری آئی انھوں نے غزل شروع کی مطلع ارشاد فرمایا:

پیام زیرِ لب ایسا کہ کچھ سنا نہ گیا
اشارہ پاتے ہی انگڑائی لی رہا نہ گیا

شاہ دلگیر نے اپنی بلند آواز میں کہا۔ ”کیا کہہ دیا ہے مرزا صاحب سبحان اللہ“ اور اس کے ساتھ ایک فرمائشی قہقہہ بھی۔ خادم علی خاں صاحب (اخضر) نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”مرزا

صاحب جواب نہیں ہوسکتا، سارا کوک شاستر ایک شعر میں نظم فرمادیا ہے آپ نے۔" ہم سب کو ہنسی ضبط کرنا مشکل تھی مگر مرزا صاحب نے نہایت اطمینان سے پوری غزل سنا کر دم لیا۔ غزل تو ختم ہوگئی مگر دلگیر شاہ اور اخضر صاحب دیر تک فقرے چست کرتے رہے۔

دوسرے دن صبح ہی مرزا صاحب یہاں تشریف لائے۔ کیسے زحمت فرمائی صبح ہی صبح میں سوچنے لگا۔ مرزا صاحب نے بیٹھتے ہی فرمایا۔ "کل کی باتوں کا آپ کچھ خیال نہ کیجیے گا، میری اور دلگیر شاہ کی پرانی بے تکلفی ہے۔" "میں تو آپ کا اور ان کا دونوں کا خورد ہوں۔" میں نے عرض کیا۔ اس کے بعد مرزا صاحب جب بھی آگرے تشریف لاتے اور جتنے روز بھی قیام فرماتے برابر میرے مکان پر تشریف لایا کرتے۔ گفتگو کا موضوع عموماً اعتراض کرنے والوں کی ناواقفیت ہوتا تھا یا اپنی قابلیت اور میں بہت خلوص سے ان کی باتیں سنتا رہتا تھا۔ وہ واقعی اس کے مستحق تھے کہ ان سے خلوص اور ہمدردی کا برتاؤ کیا جائے۔

مرزا صاحب میرے پاس عموماً شام کو آتے تھے۔ میں شام کو برآمدے میں بیٹھنے کا عادی ہوں، مرزا صاحب آتے تو میں انھیں کمرے میں بٹھاتا اور خود اس طرح بیٹھتا کہ برآمدے میں بیٹھے ہوئے اصحاب سے بھی مخاطب ہوتا رہوں اور مرزا صاحب کی خدمت میں بھی حاضر رہوں۔ میں مرزا صاحب کا کسی سے تعارف بھی نہ کراتا تھا وہ خود بھی اس کا برا نہیں مانتے تھے۔ جو اسباب اس کے میرے ذہن میں تھے غالباً مرزا صاحب نے انھیں سمجھ لیا تھا اور ان پر راضی ہو چکے تھے۔ ایک روز میں کسی ضرورت سے زنان خانے میں چلا گیا۔ وہاں سے واپس آنے پر دیکھتا کیا ہوں کہ اچھا خاصا دنگل جما ہوا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچی ہوئی ہے کہ تم جانتے کیا ہو اور تم غالب کو سمجھنا تو کجا صحیح پڑھ بھی نہیں سکتے۔ بہت دیر تک میں دور کھڑا ہمت کرتا رہا کہ کس طرح آؤں اور معاملہ ختم ہو۔ آخر آنا ہی پڑا۔ ہوا یہ کہ ایک صاحب نے مرزا صاحب سے تعارف فرمالیا اور اس کے بعد ہنگامہ گرم ہوگیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ مرزا صاحب دوسرے روز تشریف نہ لائیں گے مگر وہ برابر آتے رہے۔

۱۹۳۵ء میں جے پور میں ایک یادگار مشاعرہ ہوا تھا۔ اس کی صدارت اور سرپرستی پنڈت امرناتھ صاحب اٹل نے کی تھی۔ موصوف سر تیج بہادر سپرو کے داماد اور بہت خوش ذوق انسان ہیں اور اس زمانے میں ریاست جے پور کے وزیر مالیات تھے اس لیے یہ مشاعرہ نیم سرکاری ہوگیا تھا۔ سرکشن پرشاد مرحوم نے حیدرآباد سے اپنا کلام بھی بھیجا اور فانی صاحب مرحوم کو بھی۔ ان کے علاوہ امجد حیدرآبادی، یگانہ چنگیزی، ماہر القادری مشاعرے میں شرکت کے لیے حیدرآباد سے آئے اور ہندوستان کے تقریباً تمام مشاہیر شعرا اس میں شریک ہوئے۔ فانی صاحب نے

مجھ سے فرمایا کہ یگانہ مجھ سے ناخوش ہیں انھیں یہ غلط فہمی ہوگئی ہے کہ حیدرآباد کے ایک اخبار میں شیعوں کے خلاف جو مضمون لکھا گیا ہے اس میں میرا ہاتھ ہے، چلو ان سے میری مفاہمت کرادو۔ میں اور فانی صاحب یادگار میموریل گئے جہاں میرے اور فانی صاحب کے علاوہ سب شاعر ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہم یگانہ صاحب کو تلاش کرتے ہوئے ان کے کمرے میں پہنچے۔ مرزا صاحب بڑے تپاک سے ملے، بہت خوش ہوئے کھڑے ہوگئے، اپنی کرسی چھوڑ دی مگر یہ سارا تپاک اور تواضع میرے لیے مخصوص رہا۔ فانی صاحب کی طرف بالکل توجہ نہ کی۔ میں نے فانی صاحب کو بٹھایا اور خود بھی بیٹھ تو گیا مگر اس برتاؤ سے مجھے سخت صدمہ ہوا اور آخر ہم دونوں بغیر کچھ کہے سنے مرزا صاحب کے پاس سے اٹھ آئے۔ باہر نکلتے ہوئے ہم نے دیکھا کہ ایک کمرے میں بہت سے لوگ جگر صاحب مرادآبادی کو گھیرے ہوئے بیٹھے ہیں۔ جگر صاحب ہمیں دیکھتے ہی باہر تشریف لے آئے۔ فانی صاحب نے معذرت کی کہ پھر ملیں گے مگر میں نے یگانہ صاحب کی ملاقات کی مختصر روداد جگر صاحب سے کہہ ہی دی۔ جگر صاحب سن کر خاموش ہوگئے، بات آئی گئی ہوئی۔ یہ مشاعرہ تین دن تین رات رہا تھا۔ آج رات کو اس کی آخری نشست تھی اور اساتذہ کے پڑھنے کی باری تھی۔ مشاعرے میں فانی صاحب کے ساتھ پہنچا تو منتظمین نے ہمیں ایک مخصوص جگہ لے جاکر بٹھا دیا میں نے دیکھا کہ میرے برابر صف میں مرزا یگانہ بیٹھے ہوئے ہیں اور میرے اور فانی صاحب کے پیچھے جگر صاحب تشریف فرما ہیں اور سرخوشی کے عالم میں جھوم رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر فرمانے لگے۔ ''میکش صاحب! اس کے پاس سے ہٹ کر بیٹھیے''۔ (یگانہ صاحب کی طرف اشارہ کرکے) مرزا یگانہ کی آنکھیں سُرخ ہوگئیں۔ جگر صاحب کہنے لگے: ''میکش ہم میں ہے تم میں نہیں ہے۔'' یگانہ صاحب کہنے لگے: ''دیکھیے یہ شخص یہاں بھی شیعہ سُنّی سوال پیدا کر رہا ہے۔'' جگر صاحب نے فرمایا۔ ''نہیں یہ شیعہ سنی کا سوال نہیں ہے یہ شاعر اور غیر شاعر کا سوال ہے میکش شاعر ہے تم شاعر نہیں ہو، ہٹ کے بیٹھو میکش کے پاس سے۔'' کچھ دیر بعد مرزا یگانہ کا نام پکارا گیا۔ ان کا مزاج پہلے ہی برہم ہو چکا تھا یہ شکایت اور پیدا ہوگئی کہ فانی صاحب سے پہلے انھیں آواز دے دی گئی، مرزا صاحب غزل پڑھنے تشریف لے گئے اور محفل کو مخاطب کرکے فرمایا: ''میں نے غزل تو پوری ہی لکھی تھی مگر جس نمبر پر مجھے آواز دی گئی ہے اس نمبر پر صرف چار شعر ہی پڑھوں گا۔'' مشاعرے پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مرزا صاحب نے چار شعر پڑھے اور اتر کر اپنی قیام گاہ پر تشریف لے گئے۔ مرزا صاحب سے اس کے بعد پھر مجھ سے ملاقات نہ ہوسکی۔

۱۔ تاج گنج اس محلے کا نام ہے جو تاج محل کے قریب آباد ہے (۲) ان تینوں کا انتقال ہوگیا

ڈاکٹر کنور محمد اشرف

ڈاکٹر محمد اشرف کو کبھی میں نے اپنا بڑا پن ظاہر کرتے نہیں دیکھا۔ اُنھوں نے کبھی غیر ممالک کے قصّے اور اپنے کارنامے بھی نہیں سُنائے۔ مجھے برسوں یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ وہ تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں۔

جب میں نے ان سے کہا کہ آپ مجھے بے عملی کے طعنے دیتے ہیں، اور میرے لیے سزائیں تجویز کرتے ہیں، اور خود کچھ نہیں کرتے، فضول تقریروں میں وقت ضائع کرتے ہیں، تو وہ ہنسے اور کہنے لگے کہ میرا موضوع ایسا ہے کہ اس پر ہندوستان میں کام کرنا مشکل ہے۔ لندن ایسی جگہ ہے جہاں ایک کاغذ کی چٹ پر کسی کتاب کا نام لکھ کر دے دیتا، اور دس منٹ میں وہ کتاب میز پر آ جاتی، تو مجھے معلوم ہوا کہ اُنھوں نے لندن بھی دیکھا ہے۔

ڈاکٹر اشرف کی سب سے اہم خصوصیت اُن کی موہ لینے والی شخصیت اور اُن کی دل میں اُتر جانے والی باتیں تھیں۔ سب سے پہلے مجھ سے ان کا تعارف ساغؔر نظامی نے کرایا تھا۔ ساغؔر صاحب کو مجھ پر بڑا تعجب ہوا کہ میں اشرف کو نہیں جانتا۔ مگر میں نے اس سے پہلے کبھی ڈاکٹر اشرف کا نام نہیں سُنا تھا۔ مجھے وہ دن یاد نہیں، مگر یہ وہ زمانہ تھا جب اشرف فیروزآباد کے حلقے سے کانگریس کے ٹکٹ پر اسمبلی کے لیے اُمید وار تھے۔ میرے پھوپی زاد بھائی سیّد عظمت علی شاہ مرحوم کانگریس کے بڑے مخلص اور سرگرم کارکن تھے اور وہ اشرف کے لیے کام کر رہے تھے۔ ڈاکٹر اشرف ان کے ساتھ میرے یہاں آتے اور راتوں کو قیام کرتے۔

ایک بار میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب بھرے بازار میں اپنا بستر خود اُٹھائے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ اُنھوں نے بستر ایک کونے میں ڈال دیا اور بے تکلفی سے مسکراتے ہوئے میرے پاس آبیٹھے۔ ان کے چہرے پر نہ حجاب تھا نہ معذرت کوشی۔ مجھے یہ بات بہت عجیب معلوم ہوئی اور بہت اچھی بھی۔ ڈاکٹر اشرف میرے ہم عمر بھی تھے اور ہم مذاق بھی لیکن میں دوستی اور ملاقات میں نہ ہم عمری کا پابند ہوں نہ ہم مذاق ہونے کا، البتہ شائستہ اور غیر مہذب آدمی سے نباہنا میرے لیے بہت مشکل ہے۔ لیکن میں دیکھتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب ہر قسم کے آدمی کے ساتھ نہ صرف یہ کہ بیٹھ سکتے تھے، بلکہ بیٹھنا جانتے تھے، ایک مرتبہ جوتے کے کچھ کاریگر اُنھیں اپنے پیر کے یہاں ایک قوّالی کی محفل میں لے گئے۔ میں وہاں پہلے سے بیٹھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب آکر ہماری صف میں بیٹھ گئے۔ میں قوالی سُنتا بھول گیا اور ان کی حرکات وسکنات دیکھتا رہا۔ وہ دوزانو گردن جھکائے ہوئے اس طرح بیٹھے ہوئے تھے جیسے کوئی صوفی بیٹھتا ہو۔ اور جیسے وہ ساری عمر قوالی کی محفلوں میں بیٹھتے رہے ہوں۔ کبھی کبھی وہ میری طرف دیکھتے اور فوراً نظریں چُرا لیتے۔ محفل کے بعد میں نے اُن پر بہت سے فقرے کسے اور اُن کے سلیقے کی داد بھی دی۔ کہنے لگے آج پہلی دفعہ اندازہ ہوا کہ تمھاری نظروں میں اتنی شرارت بھی ہوسکتی ہے۔

ان کی باتوں میں محبت آمیز طنز ہوتا تھا، ایسا کہ اگر وہ طنز نہ کرتے تو میں اُنھیں اس پر مجبور کرتا اور پھر ہم خوب ہنستے۔ یہاں تک کہ علمی بحث میں بھی یہی انداز رہتا۔ جب وہ آگرے میں تھے تو اکثر آدھی آدھی رات تک بحثیں ہوتی رہتیں، ان کا بحث کرنے کا انداز بھی بڑا دلچسپ اور شگفتہ ہوتا اور علمی بحثوں میں بھی ہم کافی ہنس لیتے تھے۔ وہ میرے موضوع پر اتنی ہی گہری واقفیت رکھتے تھے اور اتنی ہی سلجھی ہوئی بات کرتے تھے جیسی اپنے موضوع پر۔ میں نے 'نقدِ اقبال' کے دیباچے میں لکھا ہے کہ یہ ڈاکٹر اشرف ہی تھے کہ جنھوں نے طعنے دے دے کر مجھے اس محنت پر آمادہ کیا اور جب یہ کتاب میں نے اُنھیں بھیجی تو اُنھوں نے مجھے بڑا دلچسپ خط لکھا:

سعید منزل، راج باغ

سری نگر، ۲۸/ستمبر ۵۵ء

میرے محترم میکش صاحب۔ میں سمجھتا تھا کہ معتقدین کو قابو میں رکھنے کا فن خواجہ حسن نظامی پر ختم ہوگیا۔ مگر نہیں، آپ کی منزلیں دہلی والوں سے بہت آگے ہیں۔ حضور، میں تو آپ کا ویسے ہی احسان مند ہوں، اس نوازش سے گرانبار کرکے آپ نے محض اس کا ثبوت دیا ہے کہ اس

نیاز مند کو آپ اپنے عقیدت مندوں میں اب بھی شمار کرتے ہیں۔ اس ذرّہ نوازی کا میں صرف ایک جواب دے سکتا تھا کہ آپ سے قریب آنے کی کوشش کروں، چنانچہ میں ۴/ اکتوبر کو دہلی مستقل قیام کے خیال سے روانہ رہا ہوں، اور 'نقدِ اقبال' اور 'حرف تمنا' زادِ راہ کے طور پر تمام راستے اپنے ساتھ رکھوں گا۔

میرا ارادہ ہے کہ کسی اتوار کو اپنی اہلیہ کے ساتھ آگرہ حاضرِ خدمت ہوں۔ اُنھوں نے ابھی تک تاج محل اور آگرہ (اکبر آباد نہیں) کی کثافت نہیں دیکھی اور اُنھیں دیکھے بغیر میرے نزدیک ہندوستان کا مطالعہ پورا نہیں ہوتا۔ بہر نوع میرا آئندہ پتہ نوٹ فرمالیں.....

میں کروڑی مل کالج کے شعبۂ تاریخ کا چیرمین مقرر ہوگیا ہوں۔ سرِ دست کشمیر کی تاریخ مرتب کرنے میں مصروف ہوں اور اس میں ابھی سال بھر اور صرف ہوگا۔ اس کے بعد ہندوستان پر ایک کتاب لکھنا چاہتا ہوں ۔ بہرِ نوع یہ مہمل قسم کے منصوبے زندگی کے ساتھ ہیں۔ کبھی کبھی خیریت سے مطلع کیا کریں تو بڑا احسان ہو۔

نیاز کیش

محمد اشرف

ایک دفعہ میں نے انھیں کچھ تانبے کے سکّے دکھائے اور پوچھا کہ یہ کس زمانے کے ہیں، اس میں سے کچھ تو تغلق کے دور کے تھے، اور کچھ ایسے تھے جن پر کچھ نہ لکھا تھا، بلکہ کچھ نشان سا بنا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اُنھیں دیکھ کر کہنے لگے: ''ہم کمیونسٹوں کی حکومت ہوگئی تو سب سے پہلے میں آپ کو جیل بھیجوں گا، یہ سکّے اس ناقدری کے ساتھ رکھے ہیں''۔ میں نے کہا: ''کس طرح رکھنا چاہیے تھا'' کہنے لگے کہ ایک مخمل کا خوبصورت کیس بنوا کر رکھنا چاہیے تھا۔

مجھے اب تک ہر طبقے اور ہر قابلیت کے بے شمار آدمیوں سے بات چیت کا موقع ملا ہے، مگر ڈاکٹر اشرف اُن چند مخصوص آدمیوں میں سے تھے جن کی باتوں سے میں انتہائی لذّت اور مسرّت محسوس کرتا تھا۔

وہ پاکستان اور لندن اور جانے کہاں کہاں ہوکر جب دہلی آگئے تو اسی زمانے میں انجمن ترقیِ اُردو ہند کا اجلاس دہلی میں ہوا جس میں مولانا آزاد مرحوم نے آخری تقریر کی تھی۔ میں اس کے ایک جلسے میں شریک تھا اور میرے پاس روشؔ صدیقی بیٹھے ہوئے تھے، میں نے ان سے کہا، کہیں ڈاکٹر اشرف بھی مل سکتے ہیں؟ روشؔ صاحب کہنے لگے ابھی ملاقات کرادوں تو؟ اور یہ کہہ کر اُنھوں نے قریب ہی بیٹھے ہوئے ایک صاحب سے کہا، یہ میکش صاحب آپ کو تلاش

کرر ہے ہیں، اور دوسرے لمحے میں ڈاکٹر صاحب مجھ سے لپٹ گئے، اور پھر ہمیں نہیں معلوم کہ یہ اجلاس کب ختم ہوا۔ ہم تینوں اُٹھ کر پنڈال کے قریب ہی ایک چائے کی معمولی دوکان پر آ بیٹھے اور نہ جانے کب تک بیٹھے گپّیں ہانکتے رہے اور پھر کئی سال بعد ڈاکٹر صاحب آگرے آئے۔ کچھ پارٹی کے کام تھے، اور آگرہ کالج میں اُنھیں لیکچر دینے تھے، وہ شری ایم، این ٹنڈن جی کے یہاں ٹھیرے تھے۔ کام بہت تھے اور وقت کم، مگر وہ دوپہر سے پہلے میرے پاس آ گئے، اپنے ساتھیوں کو اُنھوں نے رخصت کر دیا، اور پانچ گھنٹے میرے پاس بیٹھے رہے۔

اس صحبت کا سب سے قابلِ ذکر، اور یادگار واقعہ یہ ہے کہ اُنھوں نے کاغذ کا ایک بڑا لفافہ مجھے دیا اس میں نظیر اکبر آبادی سے متعلق چند کتابیں تھیں جو لندن سے اُنھوں نے ل۔ احمد صاحب اور مجھ سے منگوائی تھیں اور میں نے لکھ دیا تھا کہ یہ میری طرف سے نذر ہے۔ لیکن وہ ان سب کتابوں کو بڑی حفاظت سے لائے تھے، اُنھوں نے دکھایا کہ یہ پاکستان جیل کی مہریں ہیں بغیر اس کے کتابیں میرے پاس نہیں رہ سکتی تھیں۔

وہ ایک ملک سے دوسرے ملک اور یہاں تک کہ جیل میں بھی ان کتابوں کو لیے پھرے تھے، اور پھر خود لا کر مجھے واپس کی تھیں جن کا واپس کرنا نہ ضروری تھا اور نہ اس کے لیے کوئی تقاضا تھا ان کتابوں میں جو غیر ضروری کاغذ نشانی کے لیے رکھے تھے وہ بھی بدستور محفوظ تھے، میں اس بات سے بہت زیادہ متاثر ہوا میں نے کہا خدا کو ماننے والے بے دین آدمی بھی اتنے ایماندار ہوتے ہیں، اس پر اُنھوں نے اخلاق پر ایک لیکچر دے ڈالا، مگر واقعہ یہ ہے کہ میں جب بھی کسی مولوی، پنڈت اور حاجی کو بے ایمانی کرتے دیکھتا ہوں تو مجھے اشرف کا یہ واقعہ برابر یاد آتا ہے۔ میں خدا کی ہستی پر اتنا ہی یقین رکھتا ہوں جتنا اپنی ہستی کا اور مجھے خدا سے امّید ہے کہ وہ اشرف پر ضرور رحم کرے گا جو زبان سے کافر اور کردار سے مومن تھا۔

مہاراجہ بلوان سنگھ بہادر

متخلص بہ راجہ

مرزا غالبؔ سے مجھے صرف عقیدت ہی نہیں بلکہ محبت بھی ہے۔ محبت کے اسباب میں اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو مرزا کی شاعرانہ عظمت کے علاوہ ان کی وہ شخصیت بھی شامل ہے جو یادگارِ غالب کے مصنف نے اپنے قلم سے بنائی ہے اور مجھے محبت تو دراصل ان سے اس لیے بھی ہے کہ وہ میرے وطن کے تھے۔ جس طرح نالائق اور بے کمال اولاد اپنے بزرگوں کے کمال پر فخر کیا کرتی ہے، اسی طرح میں بھی میر تقی میرؔ، نظیرؔ اور غالبؔ پر فخر کیا کرتا ہوں۔

فروری ۵۳ء کے آج کل میں مختار الدین صاحب آرزو کے مقالے ''مرزا غالبؔ سے ایک ملاقات'' میں میں نے پڑھا کہ غالبؔ نے میرے جدِّ بزرگوار سیّد منوّر علی شاہ صاحب کی مجالس کا ذکر کیا ہے تو مجھے اس تصور سے بڑی خوشی ہوئی کہ کبھی غالبؔ بھی یہاں آتے ہوں گے جہاں میں رہتا ہوں اور اسی سلسلے میں مجھے اس کمی کا شدید احساس ہوا کہ میں نے کبھی مرزا غالبؔ کا مکان اندر سے نہیں دیکھا۔ اندر کے حصے کے فوٹو بھی کسی تذکرے میں نظر سے نہیں گزرے۔ صدر دروازے کے اوپر کی سہ دری کا فوٹو غالباً مالک رام صاحب کے تذکرے میں ضرور دیکھا ہے اور یہ حصہ تو جب بھی اس طرف سے گزرنا ہوتا ہے نظر آ ہی جاتا ہے۔

مرزا غالبؔ کے مکان کے مختلف فوٹو لے کر ہم لوگ واپس آ رہے تھے کہ راستے میں راجہ کاشی کی حویلی نظر پڑی جس کا بلند اور کئی منزلہ پھاٹک اور اس کے اوپر کے کمرے ابھی سلامت ہیں۔ لیکن اس کا ایک بازو بالکل منہدم ہو گیا ہے۔ یہ حصّہ دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شتر

مرغ کا ایک بازو ٹوٹ گیا ہو اور وہ دوسرا پنکھ پھیلائے اپنی لامبی گردن اٹھائے کھڑا ہو۔ میں سوچتا رہا کہ اس حویلی کے بازو میں ایک احاطہ تھا۔ اس میں باغ تھا، پیڑوں کی ٹہنیاں احاطے سے باہر لٹکتی رہتی تھیں۔ پھاٹک میں نوکر چاکر اور پہرے دار رہتے تھے۔ آخر وہ سب کیا ہوئے۔ نہ صفائی ہے نہ مرمّت ہے نہ وہ رونق اور چہل پہل ہے۔ کیا سارا آگرہ ہی بدل گیا۔ مکینوں کے ساتھ مکان بھی بدل گئے۔ پھاٹک میں دیواروں پر، منڈیروں پر، کواڑوں پر سندھی عورتوں کے پاجامے، کرتے اور جانے کیا کیا پڑے سوکھ رہے تھے۔ باہر گندے پانی کیچڑ اور کوڑے کے ڈھیر تھے۔ یہ راجہ کاشی کی حویلی ہے، جہاں رات دن جلسے جشن اور مشاعرے ہوتے تھے۔ نظیر اکبر آبادی۔ حاتم علی مہر خلیفہ گلزار علی اسیر۔ مرزا عنایت علی ماہ جیسے اہلِ کمال کے جھمگٹ رہتے تھے۔ میں نے اپنے ہمراہیوں (مسٹر ٹامس اسمتھ اور معظم علی شاہ) سے کہا کہ اس حویلی کا فوٹو اور لے لیجیے۔ مگر کیمروں کی شصت درست بھی نہ کی جا سکی تھی کہ سندھی لڑکوں اور راہگیروں کی بھیڑ لگ گئی۔ مختلف سوالات اور شکوک کیے جانے لگے۔ آخر سامنے سے فوٹو نہ لیا جا سکا، اور ایک طرف جا کر ایک سمت سے فوٹو لیا گیا۔

راجہ صاحب کا حال ''خم خانۂ جاوید'' ''سخن شعرا اور'' ''ہندو ادیب'' میں مختصراً ملتا ہے ''خم خانۂ جاوید'' میں لالہ سری رام صاحب نے قدرے تفصیل سے لکھا ہے وہ لکھتے ہیں:

''راجہ رئیس با تمکین مہاراجہ بلوان سنگھ بہادر خلف ارشد مہاراجہ چیت سنگھ، تاریخ میں ان کا حال اس طرح درج ہے کہ جب راجہ چیت سنگھ کے والد راجہ بلونت سنگھ نے وفات پائی، نواب شجاع الدولہ نے تمام عہد ناموں کے خلاف چاہا کہ علاقہ بنارس پر اپنا دخل کر لیں۔ لیکن سرکار انگلشیہ نے قدیم شرائط کی پابندی ملحوظِ خاطر رکھ کر راجہ چیت سنگھ کو مسندِ موروثی پر متمکّن کر دیا۔ راجہ موصوف حسب قرار داد سابقہ سالانہ زرِ خراج معینہ ادا کرتے رہے۔ لیکن ۱۷۷۸ء میں سرکار انگریزی نے کچھ فوج کمکی طلب کی اور اخذِ زر بھی کرنا چاہا۔ راجہ نے ان امور کو اپنے مقدور سے خارج پا کر عذر کیے جو مسموع نہ ہوئے اور وارن ہسٹنگز گورنر جنرل خود اس معاملے کے تصفیے کے لیے بنارس آئے اور راجہ کی گرفتاری کا قصد کیا۔ اس امر سے تہلکۂ عظیم مچ گیا اور چار و ناچار جانبین سے فوج کشی کی نوبت آئی۔ آخر الامر والیِ بنارس راجہ چیت سنگھ نے ۱۷۸۱ء میں شکست پا کر گوالیار کو پناہ گاہ مقرر کیا تو عالی جاہ نے طریقۂ مہمانداری کا سلوک کر کے پانچ لاکھ سالانہ کی جاگیر علاحدہ کر دی۔ بعد وفات مہاراجہ چیت سنگھ مہاراجہ بلوان سنگھ چالیس سال تک آگرے میں تشریف

فرما رہے۔ نظیر اور مرزا حاتم علی مہر کے شاگرد تھے بڑے قادر الکلام، مشتاق، ذکی اور طباع سخنور تھے۔ تلاشِ مضامینِ نو کی طرف میلِ خاص تھا اور اس کے ساتھ ہی زبان کی صفائی کا اس قدر خیال تھا کہ کیا مجال کہ اسلوبِ بیان میں ذرا بھی دقت یا الجھاؤ پیدا ہو۔ مشکل زمینوں میں خوب خوب شعر نکالتے تھے۔ شاعروں کے بڑے قدردان تھے۔ ہمیشہ دولت خانے پر مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ اور شعرا سے ہر طرح سلوک ہوتے تھے۔ قوم کے ترکر ما برہمن تھے۔ ان کے مورثِ اعلیٰ راجہ منسارام کو محمد شاہ نے پندرہ لاکھ سالانہ خراج پر علاقہ جات جون پور، غازی پور، بنارس کا صوبہ دیا تھا۔ سرکار انگلشیہ سے دو ہزار روپیہ ماہوار پنشن مقرر تھی۔ ۱۷۹۹ء سالِ پیدائش تھا۔ صاحبِ دیوان (مسمی بہ گلِ ریاض مطبوعہ عظیم الاخبار پریس آگرہ ۱۲۷۰ء ہجری) تھے ایک کتاب موسوم بہ چتر جندر کا بھی ان سے یادگار ہے۔ دیوان نہیں ملا۔ البتہ تلاش سے بیس پچیس غزلیں بہم پہنچیں۔

(خمخانۂ جاوید جلد سوم ص ۲۹۸)

حسنِ اتفاق سے راجہ صاحب کے متعلق ہمیں ان کا خود نوشت حال ایک مشاعرے کے گلدستے[1] میں ملتا ہے۔ یہ مشاعرہ ۱۶۔ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو راجہ صاحب کی حویلی ہی میں ہوا تھا۔ اس کے بانی منشی نیاز علی پریشان تھے جو مرزا حاتم علی بیگ مہر کے شاگرد تھے۔ اردو کا مصرع مرزا مہر ہی نے دیا تھا۔ اس مشاعرے میں راجہ صاحب کے علاوہ خلیفہ گلزار علی اسیر خلف نظیر اکبر آبادی اور مرزا مہر اور آگرے کے تمام شعرا شریک تھے۔ اس خود نوشت میں راجہ صاحب نے خود کو مرزا مہر کا شاگرد نہیں لکھا ہے۔ معلوم نہیں تذکرہ نویسوں نے یہ روایت کہاں سے لی۔ اس تحریر سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ راجہ صاحب کے اس مطبوعہ دیوان کے علاوہ، جس کا ذکر خمخانۂ جاوید میں ہے دو دیوان اور بھی تھے جو غالباً طبع نہ ہوئے اور اس کے علاوہ ایک مثنوی ایک بیاضِ سلام اور دو کتابیں ہندی کی اور بھی راجہ صاحب نے تصنیف فرمائی تھیں۔ اب راجہ صاحب کی زبان سے ان کا حال سنیے۔

حال سے پہلے راجہ کا نام وغیرہ اس طرح درج کیا گیا ہے کیونکہ مشاعرے کے سلسلے میں اعلان کیا گیا تھا کہ ہر شاعر اپنا نام مع قومیت کے لکھے۔ استاد کا نام اور تخلص لکھے۔ اپنی عمر، سکونت اور شاعری کی مدت اور تصانیف کی تفصیل لکھے:

''مہاراجہ بلوان سنگھ بہادر راجہ کاشی، گوتم برہمن، خلف مہاراجہ چیت سنگھ بہادر راجہ کاشی تخلص راجہ در اردو و در زبان بھاکا کاشی راج۔ شاگرد میاں نظیر در علم فارسی و شاگرد لالہ بھٹ در ہندی عمر ۷۰ سال مدتِ شاعری ۳۷ سال، سکونتِ قدیم بنارس سکونتِ حال آگرہ۔

تصنیفات۔ سہ دیوان و یک مثنوی و یک بیاضِ سلام و مرثیہ و یک کتاب بھا کا موسوم بہ "رس سمدر"

حال۔ جناب مہاراجہ چیت سنگھ بہادر بیکنٹھ باشی راجہ بنارس سے بلا سبب لارڈ ہیس ٹنگز، صاحب بہادر گورنر جنرل برسرِ فساد ہوئے اور مہاراجہ موصوف ریاست ترک کر کے مع فوج ہمراہی گوالیار میں آئے اور بعد ملاقات ہونے مہاراج مادھو جی سندھیا بہادر والیِ گوالیار کے سندھیا ممدوح نے پانچ لاکھ روپیہ کی جاگیر پان کھانے کے لیے مقرر کی۔ یعنی قلعہ و پرگنہ رتوا اور موہ وغیرہ۔ سو وہ جاگیر جب کہ جنرل لیک صاحب بہادر نے گوالیار فتح کیا اس وقت میں یہ حکم دیا کہ ہم کو معلوم نہ تھا، اس باعث سے تمھاری جاگیر سند میں رانا کیرت سنگھ صاحب والیِ گوہد کے مندرج ہوگئی ہے تم کو چاہیے کہ ان کو دخل دے دو۔ بموجب حکم سرکار کے ان کو دخل دے دیا گیا اور یہ فرمایا کہ بالعوض اس کے دوسری جاگیر تم کو سرکار سے مرحمت ہوگی۔ بعد چند روز کے صاحب ممدوح نے کہلا بھیجا کہ پانچ لاکھ روپیہ کی سند جاگیر دھول پور سے تمھارے نام آ گئی ہے۔ لیکن وہ سند ہمارے پاس تک نہیں آنے پائی، کہ اس اثنا میں موصوف چلے گئے۔ بعد چند سال کے مہاراجہ چیت سنگھ بہادر نے انتقال فرمایا۔ اسی تاریخ سے ہماری والدہ کے نام سے واسطے پرورش خاندان مہاراجہ صاحب کے دو ہزار روپیہ ماہواری سرکار دولت مدار انگریزی سے متعین ہوا اور بعد وفات والدہ ماجدہ ہماری کے وہی دو ہزار روپیہ ہمارے نام مقرر ہوئے چنانچہ وہ آج تک جاری ہیں۔ اور بہ سبب خیر خواہی ایامِ غدر زیادہ تر موردِ عنایاتِ سرکار ہوں۔"

اس کے علاوہ راجہ صاحب نے اپنی مثنوی میں، جس کا مفصل ذکر آگے آ رہا ہے، اپنا تعارف اس طرح کرایا ہے:

پہلے کچھ اپنا حال ہو تحریر
تا یہ ظاہر ہو کون ہے یہ حقیر
شکرِ خالق کروں نہ کیوں ہر دم
ذرہٗ آفتاب تا بانم
مجھ کو اس قوم میں کیا پیدا
ہند میں جو ہیں اشرف و اعلیٰ

شکر خالق کا کس زباں سے کروں
یعنی گوتم برہمنوں میں ہوں
جدو آبا ہوئے ہیں والیِ ملک
سب کے سب تھے رئیس عالیِ ملک
یعنی راجوں میں راجہٗ کاشی
مرتبہ ان کا کیوں نہ ہو عالی
راجہ بلونڈ سنگھ عالی قدر
جدِّ امجد تھے میرے زینتِ صدر
پسرِ راجہ چیت سنگھ ہوں میں
جگرِ راجہ چیت سنگھ ہوں میں
عجز لیکن ہے یاں طبیعت میں
خاکساری ہے اپنی طینت میں
جدّ و آبا پہ افتخار نہیں
جاہ و حشمت کا اعتبار نہیں
کیجیے کوئی اس طرح کا کام
جس سے باقی رہے جہاں میں نام

اور راجہ صاحب کا نام حقیقت میں اسی کام سے باقی ہے۔ راجہ صاحب کا دیوان اور مثنوی میرے خاندانی کتب خانے میں محفوظ ہے۔ دیوان کا نام گلِ ریاض نہیں ہے بلکہ ''گلِ ریاضِ راجہ'' ہے۔ راجہ کا لفظ کاتب نے اس طرح لکھا ہے کہ سرسری نظر اس سے گزر جاتی ہے۔ یہ نام تاریخی ہے جس سے ۱۲۷۰ھ نکلتا ہے جو ۱۸۵۳ء سے مطابق ہے۔ دیوان ۱۲۷۰ھ میں مطبع عظیم الاخبار آگرہ محمد حیدر علی خاں کے اہتمام اور مرزا عنایت علی بیگ ماہ کی تصحیح سے چھپا ہے۔ ماہ مرزا مہر کے چھوٹے بھائی تھے۔ مرزا مہر شیخ ناسخ کے اور مرزا ماہ خواجہ آتش کے شاگرد تھے۔ راجہ صاحب کے دیوان میں دوسو چوہتّر غزلیں، کچھ متفرق مطلعے اور شعر پانچ چھ رباعیاں اور قطعے ایک تضمین خواجہ آتش کی غزل پر، ایک تضمین شیخ ناسخ کی غزل پر ایک خود اپنی غزل پر ایک مسدّس اور ایک ترجیع بند ہے۔ آخر میں مرزا مہر، مرزا ماہ، خلیفہ گلزار علی اسیر دوسرے شعراء کی تاریخیں اور تقریظیں ہیں۔

راجہ صاحب کے کلام پر آپ مصنف خمخانۂ جاوید کی رائے ملاحظہ فرما چکے ہیں جو اگرچہ بہت مختصر ہے، مگر جامع بھی ہے۔ تبصرے کی طوالت سے قطع نظر کر کے راجہ صاحب کی چند مشکل زمینوں کے مطلع اور چند شعر پیش کیے جاتے ہیں جس سے شاعر کی کہنہ مشقی قادرالکلامی اور مہارت فن کا اندازہ ہو سکتا ہے:

دیوان اس زمانے کے دستور کے مطابق حمد و نعت سے شروع ہُوا ہے۔ حمد کے تیور ملاحظہ ہوں:

حسنِ صنم سے نورِ خدا جلوہ گر ہوا
سنگِ تپاں سے طور میں روشن شرر ہوا
انگشتِ احمدی سے جو شق القمر ہوا
وہ مطلعِ بیاضِ دلِ نوحہ گر ہوا
کیا مدح بوتراب نے مجھ میں اثر ہوا
مٹی کو میری رتبۂ کحل البصر ہوا

یہاں یہ ذکر بے موقع نہ ہوگا کہ راجہ صاب کو حضرت علی علیہ السّلام سے بے پناہ عقیدت ہے، ان کے دیوان اور مثنوی میں جگہ جگہ حضرت کی مدح ملتی ہے۔

مشکل زمینوں کے کچھ مطلعے ملاحظہ ہوں۔

روشنیِ داغِ دل کرتی اگر تمہیدِ صبح
تیرگیِ گور بنتی مطلعِ خورشیدِ صبح

تارے ہیں موتیا تو روش کہکشانِ چرخ
مہ چاندنی ہے مہر گلِ زعفرانِ چرخ

ابرو سے آئینے نے دکھائے ہلال چار
اب چار چشم ہو کے دکھا تو غزال چار

غضب ہے صبح کا عالم حباب کے منہ پر
ہوائی اڑنے لگی ماہتاب کے منہ پر

یہ کس کی زلف کا آیا خیال شام کے وقت
کہ پڑ گیا مری آنکھوں میں بال شام کے وقت
صرف بالش نہ ہوئے بلبل گلزار کے پر
کچھ بھی کام آئے نہ اس طائرِ بے کار کے پر

کیوں توڑوں جنوں میں کسی تدبیر سے زنجیر
کٹ جائے گی گھس گھس کے یہ زنجیر سے زنجیر

دیر میں جھاڑو دی کعبے کے بٹولے پتھر
خاک چھانی کبھی ہم نے کبھی رولے پتھر

دیوان میں غزلوں کی اکثریت اسی قسم کی مشکل زمینوں میں ہے اور طرفہ یہ کہ غزلوں میں عموماً ۱۸۔۱۹ شعر سے کم نہیں ہیں۔ چند شعر اور مختلف غزلوں میں سے ملاحظہ فرمائیے:

یہی گر دردکا عالم رہے گا
جیے گا تیرا شیدائی کہاں تک

پڑا جو کان کے بالے کا عکس عارض پر
چمکتی آئی نظر ہم کو آفتاب میں برق

جنوں کی ساری علامت ہے تیرے وحشی میں
ادھر کو پھروں ہی دیکھا جدھر خیال بندھا

پھینک دے اب نہیں دوا کا کام
ہوگیا تیرے مبتلا کا کام
کس رات ایک قصہ نہ ہم نے سنا تمام
اب تک مگر فسانۂ گیسو ہے ناتمام
نکہت کی طرح سیرِ گلزار جہاں ہوں
دم لے ابھی بادِ سحری اور کوئی دم

ذکر آیا مرا تو کہنے لگے
اس کا بلوانا کچھ ضرور نہیں
بھولی باتوں پہ اس کی مرتا ہوں
حسن ایسا، مگر غرور نہیں
کیوں نشے میں بہکتا ہے راجہ
ماہ ہے ساغرِ بلور نہیں

شرارے اڑنے لگے رنگِ گل سے اے بلبل
چمن کی خیر نہیں آشیاں کی خیر نہیں

اس کے جی میں جو ہے نیکی تو ہیں بدظن کتنے
ایک وہ دوست ہوا، ہوگئے دشمن کتنے

ہے عالمِ فانی یہ جہاں کس کا کریں غم
یاں نام ونشاں عرش وزمیں کے نہ رہیں گے

دوسری تصنیف راجہ صاحب کی یہ مثنوی ہے جس کا تاریخی نام ''داستانِ گل سخن'' ۱۲۷۶ھ ہے (مطابق ۱۸۵۹ء) یہ مثنوی مارچ ۱۸۶۱ء میں مطبع حیدری واقع کٹرہ حاجی محمد حسن میں مرزا علی حسین کے اہتمام سے چھپی ہے۔ اس مثنوی میں ۱۴۳۷ اشعر ہیں۔ زبان شستہ اور صاف ہے اور غزلوں کی طرح یہاں بھی راجہ کی کہنہ مشقی اور قادر الکلامی نمایاں ہے۔ حمد ونعت اور حضرت علی علیہ السلام کی منقبت کے چند شعروں کے بعد اپنا حال ہے جو اوپر گزر چکا ہے۔ اس کے بعد آغازِ داستان ہے۔ داستان کی نوعیت گل بکاؤلی کی سی ہے۔ یعنی ایک بادشاہ خواب میں ایک باغ اور اس میں مرغِ زرّیں کو دیکھتا ہے۔ بیدار ہونے پر اس کے اشتیاق میں بے قرار ہوتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ کسی طرح مرغِ زرّیں کو حاصل کیا جائے۔ درباریوں میں سے کوئی بھی تعمیل حکم کی ہمت نہیں کرتا۔ آخر بادشاہ کے سات لڑکے اس کام کا بیڑا اٹھاتے ہیں اور آخر میں سب سے چھوٹا بیٹا دیوؤں اور پریوں کے پہروں میں سے گزرتا ہوا مرغ کا پنجرہ حاصل کرلیتا ہے اور اسی کے ساتھ اس کی مالکہ سے، جو ایک پری ہے، اس کی شادی ہوجاتی ہے۔

اس مثنوی کا دوسری مثنویوں سے موازنہ اور محاکمہ میرا مقصود نہیں ہے۔ آپ کے مطالعے میں مشہور مثنویوں کے وہ مواقعے آئے ہوں گے۔ جہاں شاعر، باغ کا نقشہ، محبوب کا سراپا اور جشن کا مرقع کھینچتا ہے۔ درحقیقت یہی چند مقام ایسے ہیں جہاں شعرا اپنا زورِ طبع دکھاتے آئے ہیں۔ راجہ صاحب کی مثنوی میں سے دو ایسے ہی مقامات کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

پریوں اور حسینوں کے سراپا آپ نے بہت ملاحظہ فرمائے ہوں گے۔ راجہ صاحب نے بھی حسینوں کا سراپا کئی جگہ لکھا ہے۔ مگر ان کے قلم سے کھینچی ہوئی ایک دیونی کی تصویر دیکھیے سر سے لے کر پانْو تک کوئی جگہ بھی نظر انداز نہیں کی گئی ہے:

پہلے گھوڑے کو کھا گئی باہر — پیچھے کودی وہ باغ کے اندر
کالی رنگت تمام جسم پہ بال — دانت باہر دہن سے آنکھیں لال
سرِ ناپاک گنبد دوار — بال بھی کمبلوں کا اک انبار
مانگ بھی یوں نمود تھی سر کی — صاف جیسے سڑک جلیسر کی
حال چوٹی کا کیا کروں میں بیاں — جس طرح آگ بوٹ کا ہو دھواں
اُس کے چہرے پہ دونوں زلفیں یوں — جیسے دو لٹھے آبنوس کے ہوں
چوڑی چکلی تھی ایسی پیشانی — جس طرح الٹی ناؤ کی ہو تلی
ابروئیں نقشہ آرے کا بالکل — ناک جس طرح جون پور کا پل
آنکھیں دونوں الاؤ کی صورت — حدقے ان کے کڑھاؤ کی صورت
ابھرے ابھرے تھے اس طرح وہ گال — جیسے پانی سے پھول جائے پکھال
تھے نجس ایسے اُس کے دونوں کان — جیسے تیلی کی ہو کثیف دوکان
ہونٹ دونوں تھے اس قدر پھیلے — دو کڑاڑے ہوں جیسے دریا کے
تھا دہن اس کا گویا کرۂ نار — درِ دوزخ کی شکل آتش بار
چوکا دانتوں کا چونکا تختوں کا — ہو خلال اس میں تو درختوں کا
تھی درازی یہ اس کے دانتوں کی — جن میں دندانِ فیل ایک کچلی

ایک چہرے کا چرسہ منہ زباں | دیکھ کر جس کو عقل ہو حیراں
اور بھوپال تال چاہِ ذقن | خال تھا یا کہ اژدہے کا ہو پھن
کالی کالی تھی لمبی وہ گردن | جس طرح سے سڑک کا ہو بیلن
ارنے بھینسے وہ دونوں شانے تھے | ایسے شانے اس کو پانے تھے
بازو ایسے نظر نہ آئے کہیں | مچھلیاں دونوں دو مگر مچھ تھیں
اس کی کہنی سے تابہ پنجۂ دست | شکلِ خرطومِ نجس فیل مست
پنجے ہاتھوں کے دونوں تھے ایسے | پنج شاخہ بجھا ہوا جیسے
نئی پھبتی یہ داور مجھ سے سن | پاٹ چکی کا تھا ہر اک ناخن
اٹھی اٹھی تھی اس طرح چھچی | دس منی جیسے تیل کی کپّی
سینہ وہ مخزنِ کدورت تھا | جس پہ نو محلے کی پریٹ فدا
ایسا بیڈول چوڑا چکلا پیٹ | لے وہ دو چار شہر جس میں لپیٹ
شک نہیں ہے اگر کرو انصاف | تو حکیموں کی تھی گڑھیاں ناف
یہاں شاعر کو کیوں چھوڑے | کوہِ البرز کی کمر توڑے
وصف پیڑو کا یہ ہے البتہ | دمدمہ تھا قریبِ کلکتہ
رانیں لوہے کے پل کا پیپا تھیں | تھی لگان ایک ناؤ ان کے قریں
پنڈلیاں لمبی لمبی وہ دم جست | کہ دھوریرا ہو مادھو اس کا پست
ایڑیاں پنجے اور وہ کفِ پا | خاتمہ جن پہ ہے نجاست کا
کیوں نہ ہو ہیچ اس کے آگے تاڑ | قد و قامت شہر کی اڑواڑ

اسی طرح ایک سراپا شاہزادے کا، ایک جوگن کا اور ایک نور پری کا ہے۔ باغ کی تفصیلات جشن اور دوسرے مناظر کی مفصل عکاسی کی گئی ہے۔ مضمون طویل ہوگیا۔ مگر دیونی کے سراپا سے اگر طبیعت بدمزہ ہوگئی ہو تو یہ نور پری کا سراپا مزاج کو اعتدال پر لے آئے گا:

سر تو سر مایۂ غرور و جمال | اس پہ اندھیرا اور سر کے بال
سیدھی سیدھی وہ مانگ کی تھی لکیر | اک جہاں جس لکیر پر ہو فقیر
لمبی چوٹی کا تو بہانہ تھا | دلِ عاشق کو تازیانہ تھا
کہیں سودائیانِ سنجیدہ | کہ بلائیں کئی ہیں پیچیدہ

زلفیں چھوٹی ہوئی وہ شانوں تک ‏— مارِ ضحاک کا ہو جن پر شک
سر کو پھوڑے جو دیکھے پیشانی ‏— سب کہیں یوں تھی موت پیش آنی
صاف دل کے یہی ہو ذہن نشیں ‏— جو ہر آئینہ ہے چین جبیں
جھک کے ملتا ہے ابروؤں سے ہلال ‏— اک اشارے میں ان کے سو بھونچال
چشم بد دور آنکھ جادو کی ‏— مژہ ٹٹی شکار آہو کی
کان وہ جن میں کوئی پھونک گیا ‏— نہیں امکان ہو کوئی تم سا
کیوں نہ خود بینی اس کے ہمدم ہو ‏— ناک وہ جس سے ناک میں دم ہو
کیا کہوں کس طرح کے تھے عارض ‏— گل نے دیکھا تو تپ ہوئی عارض
نہیں ہرگز ذہن میں جائے سخن ‏— گومگو کا مقام ہے تو دہن
کیا کہوں وصفِ لب میں دنداں میں ‏— اے لو بجلی گری بدخشاں میں
عشق چاہِ ذقن میں ڈانواں ڈول ‏— ماہِ کنعان کی طرح غول کے غول
گردن اس طرح کی صراحی دار ‏— دخترِ رز کی جس پہ جان نثار
کس[۱] سے ہم دوش ہوئے وہ مہ چہر ‏— سچ تو یہ ہے بقول مرزا مہر

....

سینہ آئینہ شباب نما ‏— کچھ کچھ اس میں ابھار کا نقشا
حسن جوبن کا گھات میں اس کی ‏— پنجۂ مہر گھات میں اس کی
شکم صاف ناف موئے کمر ‏— سطحِ دریائے حُسن موجِ بھنور
اب ہے آگے مقامِ ضبطِ نفس ‏— قلمِ بوالہوس ٹھہر بس بس

....

ساقِ پا دونوں شمعِ کافوری ‏— پائے رنگیں تو ناری وہ نوری
پانو بھی وہ کہ جن کو دیکھ کے ہم ‏— کہیں ہم تو نہ چھوڑیں گے یہ قدم
ان میں پامال کرنے کے گُن تھے ‏— سخت دل عاشقوں کے ناخن تھے
سرے سے پا تک تھی نور سے معمور ‏— مصرعِ انوری قدِ پُرنور

حواشی:۔

۱ اس مشاعرے کی خصوصیت یہ تھی کہ ہر شاعر نے غزل کے ساتھ اپنا خیال لکھا بھی ہے۔اس مشاعرے کا ذکر گارسان وتاسی نے بھی کیا ہے۔اصل گلدستہ مفتی انتظام اللہ صاحب (پاکستان) کے پاس ہوگا۔مگر ہمیں پروفیسر مولانا حامد حسن قادری کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ موصوف نے ان کا خلاصہ "نقد ونظر" میں دے کر اس ذکر کو بقائے جاوید بخش دی۔

۲ حکیموں کی گڑھیاں آگرے کے حکیموں کا ایک مشہور محلّہ ہے

نظیر اور زندگانیِ بے نظیر

پروفیسر عبدالغفور شہباز کی ''زندگانیِ بے نظیر'' کو پڑھنے کا اتفاق تو پہلے بھی ہوا تھا مگر واقفیت حاصل کرنے سے زیادہ لطف اندوز ہونے کے لیے اب ایک ضرورت سے اسے غور سے پڑھنے کا موقع ملا تو اس میں کئی باتیں ایسی نظر آئیں کہ دل نے ان کی صحت کو قبول نہ کیا۔ یہ بہتر معلوم ہوا کہ انھیں اہلِ علم کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں شاید کچھ چیزیں ایسی بھی آجائیں جو ممکن ہے اس وقت غیر اہم معلوم ہوں لیکن پھر کوئی اتنا بھی جاننے والا نہ رہے۔ وقت یوں بھی اہم کو غیر اہم اور غیر اہم کو اہم بناتا رہتا ہے۔

نظیر اکبر آبادی ایک قلندر مزاج شاعر تھے۔ انھوں نے اپنا کلام نہ خود لکھا نہ جمع کیا، یہ سب کام ان کے قدر دان کرتے رہے۔ ان کے قدر دان اکثر ایسے بھی تھے جو زبانی یاد کرنے ہی کو کافی سمجھتے تھے۔ نہ تو سب کے حافظے ایک سے ہوتے ہیں نہ قابلیتیں۔ اس لیے لفظوں میں ہیر پھیر ہوتا رہا اور جب ان کا کلام چھپنے کی نوبت آئی تو کاتبوں نے بھی اپنی عقل و فراست کا ثبوت دیا۔ اس لیے جتنے ایڈیشن بھی شائع ہوئے ان میں کچھ نہ کچھ فرق رہ گیا۔ کسی میں بند کے بند کم ہو گئے، کسی میں مصرعے اور لفظ بدل گئے۔

جناب مخمور اکبر آبادی نے اپنی کتاب ''روحِ نظیر'' میں لکھا ہے: ''افسوس ہے کہ چھاپنے والوں نے ذرا صحت کا خیال نہ کیا جیسا ہاتھ لگا غلط سلط چھاپ ڈالا۔ شہباز کا مرتبہ ''کلّیاتِ نظیر'' اس وقت کلامِ نظیر کا بہترین اور مستند مجموعہ ہے لیکن میرا تجربہ ہے کہ اس میں بھی

غلطیاں موجود ہیں۔ شہباز مرحوم کے یہاں غلطیاں باقی رہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اکبرآباد کے باشندہ نہ تھے اور اس لیے یہاں کی زبان کے محاورے اور مقامی اصطلاحات سے انھیں واقفیت نہ تھی۔''

اردو ادب پر پروفیسر شہباز کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے نظیر کے متعلق وہ مواد فراہم کر دیا جو اُن کے بعد ممکن ہی نہ تھا اور جب بھی نظیر پر کچھ لکھا جائے گا اس سے قطع نظر ممکن نہ ہوگی۔ لیکن جناب مخمور اکبرآبادی نے جو کچھ فرمایا ہے اس کی صحت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا اور موصوف کو اس ایراد کا حق ہے۔ حضرت مخمور کی تنقید کا دائرہ بظاہر صحت الفاظ تک محدود معلوم ہوتا ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ الفاظ کے علاوہ کچھ اور بھی ایسی چیزیں ہیں جن پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے اور جن پر شہباز زیادہ توجہ نہ دے سکے۔ چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

شہباز نے میاں نظیر کی نواسی کا بیان اس طرح لکھا ہے:

''پوچھا کسی بزرگ سے ارادت تھی؟ کہا مرید تو کسی کے نہ تھے لیکن ہاں فقرا کے ساتھ اکثر بیٹھتے اُٹھتے رہتے تھے اور ان لوگوں کے ساتھ ان کو ایک خاص عقیدت بھی تھی۔ مکان کے پاس ایک مسجد تھی جو ابھی تک موجود ہے اس میں غلام رسول ایک بزرگ رہتے تھے۔ بہت بڑے مشائخ تھے، پیری مریدی کرتے تھے، اِن میں اُن میں بڑا ربط تھا۔ وہ بھی آتے تھے، یہ بھی ان کے پاس جاتے تھے۔ انھی غلام رسول کو لوگ خواجہ معظم بھی کہتے تھے۔ ان کی چار بیٹیاں تھیں۔ ایک میرن صاحب کو بیاہی تھیں، شاہ غلام رسول نے اپنے داماد میاں میرن ہی کو گدّی دی۔ ان کے ان کا نواسہ نثار علی ہوا[۱]۔''

اس عبارت سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ نظیر صوفی دوست اور صوفیوں کے عقیدت مند ہونے کے باجود کسی کے مرید نہ تھے۔ دوسرے یہ کہ شاہ غلام رسول اور خواجہ معظم ایک ہی شخص تھے۔ کسی سے مرید نہ ہونے کا حال گھر کے بچوں بلکہ سمجھ دار عورتوں سے بھی زیادہ ہم مذاق احباب کو ہی معلوم ہو سکتا ہے۔ خود شہباز نے ایک دوسرے بزرگ کی زبان سے اس بیان کی تردید کی ہے اور شاہ محمد اکبر دانا پوری کے حوالے سے یہ عبارت لکھی ہے:

''حضرت مولانا فخر الدین جو دہلی کے اکابر مشائخ میں تھے اور اکثر شاہزادے اور امرا اُن کے مرید تھے۔ ایک دفعہ اکبرآباد تشریف لائے اور حضرت سیّدنا امیر ابوالعلاء اکبرآبادی کے مزارِ مبارک پر چند ماہ معتکف رہے۔ اسی زمانے میں حضرت مُلّا محمدی بدایونی المتخلص بیدار[۲] جن کا

مزار اکبر آباد کناری بازار دانت کے کٹڑے میں واقع ہے یہ نظیر کے بڑے دوست تھے۔ یہ اور نظیر دونوں حضرت سیّدنا میر ابوالعلاء اکبر آبادی کے مزار کے حاضر باش تھے۔ وہیں مولانا سے ملاقات ہوئی اور ان کے حلقہ استرشاد میں آئے اور وہیں سے مذاقِ تصوف پیدا ہوا[۳]۔"

خواجہ معظم آگرے کے ایک نامی معلّم تھے جن سے غالب نے بھی پڑھا ہے یہ تو ہو سکتا ہے کہ شاہ غلام رسول صاحب کو کسی نے قدیم زمانے کے آداب القاب کے طور پر خواجہ معظم کہہ دیا ہو ورنہ شاہ غلام رسول اور خواجہ معظم یا محمد معظم دونوں آگرے کے مشاہیر میں تھے۔ شہباز نے قطب الدین باطن کی تذکرہ گلستان بے خزاں سے یہ عبارت نقل کی ہے:

"غالب واسد تخلص اسد اللہ خاں نام ملقب بہ مرزا نوشہ از بنائر غلام حسین خاں کمیدان قبل اس سے جد دہلی (اکبر آباد) میں ان کی سکونت کا مکان استادانِ باشعور مثل خلیفہ معظم جو بڑے معظم و مکرم اور ہادی شعرا جو بے نظیر روزگار تھے جن سے تعلیم پائی...." ہادیِ شعرا سے مراد نظیر اکبر آبادی ہے۔ اسی طرح خواجہ حالی نے یادگارِ غالب میں غالب کی تعلیم کے سلسلے میں لکھا ہے:

"مرزا غالب مع اپنے چھوٹے بھائی کے سنِ شعور تک آگرے ہی میں رہے۔ اگرچہ سات برس کی عمر سے وہ دلّی میں آنے جانے لگے تھے لیکن شادی کے بعد تک ان کی مستقل سکونت آگرے ہی میں رہی اور شیخ معظم جو اس زمانے میں آگرے کے نامی معلموں میں سے تھے، ان سے تعلیم پاتے رہے"

اور اس کے علاوہ سب سے اہم ثبوت یہ ہے کہ میرے جدِ محترم سیّد امجد علی شاہ صاحب اصغر جو میاں نظیر کے ہم عصر تھے۔ تاج گنج میں میاں نظیر کے مکان کے نزدیک ہی ریشم کے کٹڑے میں ان مکان تھا۔ نظیر نے ان کی ایک غزل کی تضمین بھی کی ہے:

غزل کا مطلع ہے:

جب حسنِ ازل پردۂ امکان میں آیا
بے رنگ بہ ہر رنگ ہر اک شان میں آیا

شاہ غلام رسول کی ہمشیرہ حضرت اصغر سے منسوب تھیں اور شاہ غلام رسول صاحب کی صاحبزادی سیّد منور علی شاہ صاحب کو بیاہی تھیں جو سیّد امجد علی شاہ صاحب اصغر کے صاحبزادے تھے۔ سیّد غلام رسول حضرت سیّد رفیع الدین صفوی کی اولاد ہیں جن کا مزار بیلن گنج آگرہ میں ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے ان کا ذکر "اخبار الاخیار" میں بڑی عظمت سے کیا ہے اور ......

لکھا ہے کہ ان کے خاندان کی عظمت وتوقیر کی وجہ سے شیراز میں شیخ جلال الدین دوّانی ان کے مکان پر انھیں پڑھانے آتے تھے۔ اس زمانے کی معاشرت کے اعتبار سے یہ بہت ہی عجیب بات ہے کہ اتنا بڑا علامہ کسی کے گھر پڑھانے کے لیے جائے۔ سیّد رفیع صاحب حدیث میں علامہ سخاوی کے شاگرد ہیں جو مشہور محدّثین میں ہیں یہ سلطان سکندر کے زمانے میں دہلی تشریف لائے اور پھر سلطان ہی کی درخواست پر آگرے میں قیام فرمایا۔ سیّد مجاہد الدین ان کی اولاد میں تھے۔ وہ، ان کے صاحبزادے سیّد مبارز الدین اور سیّد محمد کاظم صاحب یہ سب ملکوں گلی آگرہ میں رہتے تھے اور وہیں مسجد کے پیچھے دفن ہیں۔ سیّد غلام رسول صاحب سیّد محمد کاظم صاحب کے صاحبزادے تھے۔ سیّد امجد علی شاہ صاحب نے کئی دستاویزیں تحریر فرمائی ہیں۔ اس لیے اس بارے میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ سیّد غلام رسول اور محمد معظم ایک ہی شخص نہیں ہیں۔

نظیر کے انتقال کے وقت بقول شہباز ان کی نواسی کی عمر سات سال کی تھی اس لیے ظاہر ہے کہ ان کی معلومات یا سنی ہوئی ہوں گی یا قیاسی اور جذباتی۔ مذہب کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ ان کی نواسی کے بیان کو تسلیم کر لینا چاہیے اور آگرے میں کبھی یہ مسئلہ اختلافی نہیں رہا۔ یہاں کے سب ہی لوگ بلا لحاظ فرقہ و مذہب نظیر سے محبّت کرتے تھے۔ لیکن اب بھی کچھ لوگ تذکروں میں پڑھ کر ان کے مذہب کا ذکر کرنے لگے ہیں۔ اس سلسلے میں بعض لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ نظیر کے باپ کا نام محمد فاروق تھا اور یہ شیعوں کا نام نہیں ہوتا۔ انھوں نے شیخ سلیم چشتی کی مدح کی ہے پھر بھی میں نے شیعہ حضرات کو اس سوال کو اہمیت دیتے نہیں سنا۔ یا تو اس کا یہ ہو سکتا ہے کہ خلیفہ گلزار علی اسیر نظیر کے صاحبزادے علی الاعلان شیعہ تھے۔ بہر حال اس بارے میں دونوں کے دلائل کچھ وقیع نہیں ہیں۔ مثلاً یہ ہو سکتا ہے کہ نظیر کے باپ سنّی ہوں اور نظیر سنّی نہ ہوں۔ شیخ سلیمؒ کی مدح سے اس شخص کو کیا تکلّف ہو سکتا ہے جس نے گرونانک اور شری کرشن کی اس طرح مدح کی ہو کہ بغیر سچے اعتقاد و محبّت کے کوئی ایسی مدح نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ان کے شیعہ ہونے پر جو قیاس شہباز نے کیے ہیں وہ وقیع نہیں ہیں۔ مثلاً یہ کہ ان کے کلام میں خلفا کی تعریف نہیں ہے، اس لیے وہ شیعہ ہوں گے۔ میرے خیال میں یہ قیاس صحیح نہیں ہے کیونکہ خواجہ میر درد تو مانے ہوئے سنّی تھے، ان کے دیوان میں بھی خدا اور رسول کی حمد و ثنا کے ساتھ خلفا کی تعریف نہیں ملتی اسی طرح سیّد امجد علی شاہ صاحب اصغر کے دیوان میں کتنے ہی شعر اور قصیدے نظیر سے زیادہ شدّ و مد سے حضرت المومنین علی رضی اللہ عنہ کی مدحت و منقبت میں ملتے ہیں اور صحابہ کی تعریف نظر نہیں آتی لیکن وہ قادری طریقے کے مانے ہوئے شیخ ہیں۔

اسی طرح یہ دلیل بھی صحیح نہیں ہے کہ چونکہ نظیر کے یہاں تعزیہ داری ہوتی تھی اسی لیے وہ شیعہ تھے کیونکہ آگرے کے سنّی مسلمانوں کی نوے فی صد آبادی تعزیہ داروں یا ان کے ہم عقیدہ لوگوں کی ہے ۱۹۴۶ء سے فسادات کی وجہ سے تعزیہ داری تقریباً موقوف ہی سی ہے پھر بھی گھروں پر تعزیے داری ہوتی ہے۔ آگرے میں تو ہندو بھی کسی زمانے میں تعزیے داری کرتے تھے۔ کلاوے پہنتے اور نذر و نیاز کراتے تھے جوالا ہندو ہی تھے جن کے علم مشہور ہیں۔ اسی طرح نوری دروازے کا مٹھائی کا تعزیہ ابتدا میں ہندوؤں کا پھر ہندو مسلمان مشترک طور پر بنانے لگے۔ ہندو عورتیں اپنے بچوں کو لے کر تعزیوں کے نیچے سے نکلتی تھیں۔

لیکن نظیر کی نواسی کا بیان بالکل بے اصل بھی نہیں ہے۔ منشی عبدالرؤف خاں ہاتفؔ مرحوم مالک عزیزی پریس آگرہ کسی سلسلے سے نظیر کے رشتہ دار ہوتے تھے۔ وہ بیان کرتے تھے کہ اصل میں میاں نظیر کی بیوی شیعہ تھیں، ان کے اثر اور تربیت سے نظیر کے صاحبزادے گلزار علی اسیرؔ اور ان کی صاحبزادی امامی بیگم شیعہ ہوگئیں۔ وہی یہ بھی کہتے تھے کہ میاں نظیر کی بیوی بہت خوبصورت تھیں اور بقول ان کی ایک بزرگ صاحبہ کے کہ چاندنی رات میں وہ چنبیلی کے پھولوں کا ڈھیر معلوم ہوتی تھیں۔ انھوں نے بڑھاپے میں ان کو دیکھا تھا۔

اسی طرح حضرت شیخ سلیم چشتی کی مدح بھی نظیر کے سنّی ہونے کے ثبوت میں نہیں پیش کی جاسکتی۔ نظیر ایک پاک باطن خوش باش مرنجان مرنج انسان ہے، اس کا دل ہر صداقت کی طرف جھک جاتا ہے۔ وہ سری کرشن ہوں۔ گرونانک ہوں یا شیخ سلیم۔ وہ ہر تفریح کا، تماشے کا رسیا ہے، وہ اژدہے کے بچے کا ہو یا بَے کا۔ اسے ہر میلے ٹھیلے میں شریک ہونا ہے وہ پیرا کی کا میلہ ہو یا بلدیو جی کا۔ وہ ہر حسن سے لطف اندوز ہوتا ہے، وہ بازاری عورت ہو، ناچنے والی ہو، یا نارنگی بیچنے والی۔ نظیر کی دلچسپیاں اتنی مختلف قسم کی ہیں کہ ان کے کلام سے اس کا مسلک مقرر کرنا صحیح نہ ہوگا۔ پھر ان کے کلام کا بہت ساحصّہ وہ بھی ہے جو انھوں نے محض فرمائشوں پر لکھا ہے۔

"آگرے کی تیراکی" میں نظیر نے ان مقامات کا ذکر کیا ہے جہاں سے پیراک گزرتے ہیں اور وہاں تماشائی جمع ہو کر میلے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس میں ایک جگہ کا نام سجا کا پیالہ ہے۔ شہباز نے اسے سجا کا نالہ پڑھا اور اس پر یہ نوٹ بھی دے دیا کہ بادشاہی وقت میں سجا یا سجا کوئی امیر عورت تھی اسی نے وہ محلّہ بسایا، نالہ اسی کے نام سے مشہور ہے (زندگانی بے نظیر ص ۴۲)

جناب مخمور اکبرآبادی نے اس کی تصحیح کر دی ہے (روحِ نظیر ص ۵۶۳) مخمور صاحب کی

تحقیق یہ ہے کہ سجا قوم کی ساقن تھی (حقہ پلانے والی) وہ حقہ لے کر تیرتی اور حقہ پلاتی جاتی۔ وہ کسی استاد پیراک کی لڑکی تھی۔ اس کا انتقال پیراکی کے میلے سے دو دن پہلے یعنی منگل کو ہوا۔ تیراکی کا میلہ بھادوں کی نوچندی جمعرات کو ہوتا ہے پیراکوں نے منگل کو بھی میلا مقرّر کرلیا اور جس جگہ سجا کی فاتحہ ہوئی تھی اس جگہ کو بھی سجا کا پیالہ کہنے لگے۔ ورنہ پیالہ اصل میں ہمارے یہاں تیجے کو کہتے ہیں۔ چنانچہ محرم کی بارہ تاریخ کو یعنی عاشورہ کے تیسرے دن جو فاتحہ اور تعزیہ داری ہوتی اسے پیالہ کہتے ہیں۔ اب یہ میلا سجا کے انتقال کے دن ہوتا ہے اور یہاں کا رواج ایسا ہی ہے کہ پہلی فاتحہ تیسرے پھر چالیسویں دن ہوتی ہے۔ اس کے بعد موت کے دن یہ تقریب ہوتی ہے خواہ میلہ ہو، عرس ہو، معمولی فاتحہ ہو— اور نالہ ایسی چیز بھی نہیں ہے کہ جو کسی امیرزادی سے منسوب کیا جائے، کنواں، تالاب، مسجد اور سرائے یا پل تو کسی کے نام سے منسوب ہوتے رہتے ہیں۔

نظیر کی ہولی میں آگرے کے چند محلّوں کے نام آئے ہیں:

اِسی بہار سے گوکل میں جا پہنچے
اور منڈی نائی کی اور سیّد خاں کی منڈی سے
سب عالم گنج میں شاہ گنج و تاج گنج پھرے
ہیں شہر میں نہیں اور گردِ شہر کے رہتے
ہوا ہجوم کا بحرِ کمال ہولی میں

سبھوں کو لے کے کناری بزار میں آئے
پھر موتی کٹرے پھلٹی کے لوگ سب دھائے
کہ پیپل منڈی و پنی گلی کے بھی آئے
جہاں تہاں سے یہ گھر گھر کے لوگ سب دھائے
کہ بے نواؤں کا دیکھیں جمال ہولی میں

یہ بند کلیاتِ نظیر وارث نول کشور پریس سے نقل کیے گئے ہیں۔ دوسرا بند یقیناً غلط ہے کیونکہ اس طرح قافیوں کا مکرر لانا نظیر بھی جائز نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن عرض کرنا یہ ہے کہ اس موقع پر شہباز نے ان محلوں کا اس طرح ذکر کیا ہے:

"ایک لونڈا خوش رو جس کے چہرے پر گلاب کی پتیاں کھلی ہوئی ہیں سب سے آگے

ہے اور سیکڑوں لونڈے پیچھے ہیں جتنے ہیں سب کا کپڑا چھرکواں رنگ ہے یہ گل رخوں کا غول آگے ہے بے نوا بھی ہیں پھر ان کے پیچھے عاشقوں کا غول ہے یہ بھی ہزاروں ہیں عیش وتفریح کے رنگ میں سب ڈوبے ہوئے ہیں، خوشی کی بہاریں دکھاتے چلے جا رہے ہیں۔ میاں نظیر بھی ساتھ ساتھ ہیں۔ پہلے گوکل پورے پہنچے پھر نائی کی منڈی اور سعید خاں کی منڈی سے گزرتے ہوئے عالم گنج میں داخل ہوئے وہاں سے شاہ گنج پہنچے پھر تاج گنج آئے پھر کناری بازار میں رونق افروز ہوئے۔ وہاں سے موتی کٹرے آئے پھر پیپل منڈی اور پنّی گلی پہنچے غرض تمام شہر کا چکّر لگا آئے۔"

اصل میں نظیر کا کہنا تو یہ ہے کہ لوگ محلے محلے ہولی کھیلتے اور ہولی کا تماشہ دیکھنے گلی گلی سے جمع ہوتے ہیں مگر شہباز نے جو ترتیب لکھی ہے اس کی غلطی ہر وہ شخص سمجھ لے گا جو آگرے کے محلّوں سے واقف ہے۔ پھر ہولی کے جلوس کا یہ انداز بھی آگرے کا تو نہیں۔ بے نواؤں کا سوانگ جس کا نظیر نے ذکر کیا ہے وہ میں نے بھی دیکھا ہے۔ یہ سوانگ دھول والے دن تاج گنج سے شہر آتا تھا بیس پچیس آدمی زرد کپڑے پہنے منھ پر بھبوت ملے کانوں میں کنڈل، گلے میں مالا اور کنٹھے ڈالے بے نواؤں فقیروں کی صورت بنائے، میاں نظیر کی ہولیاں دف اور ستار پر گاتے ہوئے آتے تھے۔ یہ سب مسلمان تھے ان پر کوئی رنگ نہیں ڈالتا تھا۔ یہ جلوس تاج گنج سے شروع ہوتا تھا اور کناری بازار، سیب کا بازار پھلانگتی ہوتا ہوا چار سو دروازے میں پنڈت راج ناتھ کنزرو صاحب کے مکان کے پیچھے ختم ہوتا تھا۔ وہاں اہلِ محلہ پھول پان سے ان کی خاطر تواضع کرتے تھے۔ اتفاق واتحاد کی یہ باتیں اپنی مثال آپ تھیں۔

اسی انداز اور اسی طرح کے قیاس سے شہباز نے نظیر کی معشوقہ کی دریافت کی ہے کہ موتی نام کی عورت تھی جس سے نظیر محبت کرتے تھے۔ یہ بات انوکھی تو نہیں ہے تقریباً ہر انسان عمر کے کسی حصہ میں کسی نہ کسی سے محبّت کرتا ہے۔ مگر محض ایک نظم سے یہ ثابت کرنا مشکل ہے۔ اس طرح تو نظیر کی بہت سی معشوقائیں مل جائیں گی۔ یہ بھی کوئی عجیب بات نہ ہوگی مگر پھر موتی کی تخصیص باقی نہ رہے گی۔ یہ ضرور ہے کہ نظیر کی نظموں میں جس عورت کی تصویر نظر آتی ہے وہ کوئی پردہ نشیں یا گھر گرہستن عورت نہیں ہے جس کے لیے نظیر کو دوسرے شاعروں کی طرح جھروکوں اور روزنِ دیوار کا احسان مند ہونا پڑا ہو یا سیاستِ درباں اور پاسباں کی خوشامد سے واسطہ پڑا ہو۔ وہ ایک محفلی معشوقہ ہے جس کا شمار دوسرے میلے تماشوں کی طرح میلوں تماشوں میں ہی ہے جو اپنے جبین سے سب کی تواضع کرتی ہے اور دوسروں کی طرح نظیر بھی اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

اس حل پر مجھے نظیر کی زبان اور وطن کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا ہے —— گلزار نظیر میں جناب سلیم جعفری صاحب نے اعجاز صدیقی مدیر شاعر اور حضرت محمود اکبر آبادی مصنف روحِ نظیر کا شکوہ کیا ہے کہ ان حضرات نے نظیر کا وطن اکبر آباد اور نظیر کی زبان اکبر آباد کی زبان بتائی ہے اور پھر اکبر آباد کی زبان دہلی اور لکھنو کی زبان کی اصل لکھا ہے سلیم جعفر صاحب کا یہ خیال تو صحیح ہے کہ یہ مسئلہ لسانیات کا ہے اور لسانیات کے محققین کو اس کے فیصلے کا حق ہے لیکن یہ تو ان کو بھی تسلیم ہے کہ نظیر کی ماں آگرے کی تھیں اور ظاہر ہے کہ بچہ زبان اپنی ماں سے سیکھتا ہے نہ کہ شاعروں اور ادبی کتابوں سے۔ وہ بھی نظیر جیسا شاعر کہ جس موضوع پر لکھتا ہے اسی کے محاورے اور زبان استعمال کرتا ہے۔ یہ عجیب بات ہوگی کہ وہ آگرے کے میلے ٹھیلوں اور تیج تہواروں پر نظمیں لکھے اور دلی کے محاورے اور زبان استعمال کرے۔ رہا نظیر کے وطن کا معاملہ تو یہ بھی عجیب معاملہ ہے کہ غالب اور میر نام آور ہوئے تو دلی اور لکھنو کے قرار پائے اور نظیر جب تک بدنام رہے اکبر آبادی رہے اور جب ان کی قدر سمجھی جانے لگی تو وہ دہلی کے ہو گئے۔ کوئی کچھ بھی کہے نظیر تو یہی کہتے ہیں:

شاعر کہو نظیر کہو آگرے کا ہے

ایک صاحب نے مجھ سے یہ بھی سوال کیا کہ نظیر کو ان کے مکان ہی میں کیوں دفن کیا گیا؟ کوئی یقینی بات تو میں عرض نہیں کر سکتا مگر خاص مرتبے کے لوگوں کو عموماً گورِ غریباں میں دفن نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ درویشوں اور ولیوں کی قبر عام طور پر وہیں بناتے ہیں جہاں انھوں نے ساری عمر خدا کی یاد میں گزاری ہو۔ نظیر کے شاگرد اور قدرداں نظیر کو صرف شاعر ہی نہیں ایک خدا رسیدہ بزرگ بھی مانتے تھے۔ اسی لیے ان کی قبر ان کے مکان ہی میں ان بیری اور نیم کے درختوں کے نیچے بنائی گئی جہاں وہ معمولاً بیٹھا کرتے تھے۔ اب یہاں نہ نیم ہے نہ بیری، قبر کا نشان بھی معلوم نہیں کب تک رہے۔ لوگوں نے وہاں مکان بنانے شروع کر دیے ہیں۔ بسنت پر ہر سال لوگ جمع ہو کر اس شاعر کی نظمیں سن کر محظوظ ہو لیتے ہیں۔ یہ بھی معلوم نہیں کب تک۔

حواشی:

۱۔ زندگانیِ بے نظیر۔ ص۔ ۱۸۲

۲۔ حضرت شاہ بیدار صاحب اردو فارسی کے مشہور صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ خواجہ میر درد کے شاگرد اور حضرت مولانا فخر الدین دہلوی کے خلیفہ تھے۔ مزارِ مبارک فوارے کے قریب سبزی منڈی آگرہ میں ہے۔ اس کے دروازے میں میوہ فروش بیٹھتے ہیں اس لیے باہر سے قبر نظر نہیں آتی۔ یہ جگہ پرانے زمانے میں دانت کا کٹرہ کہلاتی تھی۔ دستاویزوں میں اسے کٹرہ دندانِ فیل لکھا ہے۔

۳۔ زندگانیِ بے نظیر۔ ص۔ ۱۸۳۔

غبارِ کارواں

(۱)

میں نے جب آنکھ کھولی تو ہمارے گھر کے باہر ہمارے لیے عزت وتوقیر، محبت و عقیدت کے انبار تھے جو نہ صرف یہ کہ ہمارے کسی مصرف کے نہ تھے بلکہ ہماری معیشت اور اقتصادیات پر بار بھی تھے۔ دوسری طرف خاندانی دشمن بندوق تانے کھڑے تھے اور ہمارا مختصر قافلہ جس کا قافلہ سالار راستے میں بچھڑ گیا تھا بے مقصد و بے منزل اندھیری رات میں رواں تھا دشمن تھکتے گئے، عزّت کرنے والے منتشر ہوتے گئے۔ اور ہمارا قافلہ چلتا رہا۔

مجھے ماں کا بھرپور پیار حاصل تھا مگر باپ کا سایہ کہاں، کھلے میدان کی دھوپ میں سارا سامان میسّر ہو تب بھی بغیر سایے کے تو کام نہیں چلتا۔ مجھے اپنے والد یاد نہیں ڈیڑھ دو سال کے بچّے کو یاد بھی کیا رہ سکتا ہے۔ ان کے متعلق جو کچھ سُنا ہے وہ اپنی ماں سے، کنبہ داروں سے، ان کے معتقدوں اور دوستوں، سے سب ان کی خوش اخلاقی، بذلہ سنجی اور خوش طبعی کے قصے سناتے، ان کی غیر معمولی عزّت اور مقبولیت کی داستانیں بیان کرتے اور ہر شخص ان کی جواں مرگی اور خوبصورتی کا بیان کر کے آنسو بہاتا۔ یہاں تک کہ بچپن ہی سے مجھے رونے سے نفرت ہو گئی تھی۔ عید تہوار پر امّاں ہم دونوں بھائیوں کو نہلا دھلا کر کپڑے پہناتی جاتیں اور روتی جاتیں۔ ان کے سُرخ وسپید چہرے پر ان کی بھیگی ہوئی سُرخ آنکھیں مجھے اچھی بھی لگتیں اور پریشانی بھی ہوتی۔ سمجھ میں نہ آتا کہ یہ روتی کیوں ہیں۔ ہم دونوں بھائی سہم جاتے۔ ہمارے چچازاد، پھوپھی زاد بھائی خوش

ہوتے پھرتے اور ہم ایک نامعلوم غم اور معلوم خوشی میں معلّق رہ جاتے۔ جب باہر مردانے میں آتے تو والد کے احباب گلے لگا کر اور معتقد قدموں سے لپٹ کر روتے۔ ہم ڈر جاتے۔ ہمارے دل دھڑکنے لگتے۔ اس طرح ہمارے تہوار منتے رہے۔ پھر ایک مرتبہ میں نے اماں سے کہہ دیا کہ آپ ہمیں کپڑے پہنا کر کیوں روتی ہیں؟ اب آپ روئیں گی تو ہم کپڑے نہیں پہنیں گے۔ آخر اُنھوں نے ہمارے سامنے رونا چھوڑ دیا اور پھر ساری عمر میں نے انھیں رونے ہی نہ دیا۔ وہ جب کبھی موت کو یاد کر کے یا نعتیہ اشعار سُن کر روتیں میں کوئی نہ کوئی ایسی بات کہہ دیتا کہ وہ ہنس پڑتیں۔ بعض اوقات وہ جزبز ہو جاتیں۔ کہتیں تجھے بچپن سے میرے رونے سے چڑ ہے۔ مجھے واقعی ان کے رونے سے چڑ تھی۔ وہ تھیں بہت رقیق القلب، دوسروں کے غم کو بھی اپنا غم بنائے رکھتیں۔ کوئی مکر سے بھی ان کے سامنے روتا تو وہ خود بھی اس کے ساتھ رونے لگتیں۔ میرے نانا الہ آباد اور پھر لکھنؤ پوسٹ آفس میں ملازم تھے۔ وہ میر اعظم علی صاحب (غالبؔ کے مکتوب الیہ) کے پوتے تھے۔ ان کی بسم اللہ غالبؔ کے مکان ہی میں ہوئی تھی۔ ایک ہی محلّے میں دونوں کے مکان تھے۔ میری ماں کا مزاج بھی اپنے والد پر تھا۔ ان لوگوں کو اس بات کا یقین ہی نہیں آتا تھا کہ کوئی جھوٹ بھی بولتا ہے اور کوئی بے ایمانی بھی کر سکتا ہے۔ اماں کی عمر شادی کے وقت ۱۷، ۱۸ سال کی تھی۔ یہ شادی میری دادی کی مرضی کے خلاف تھی۔ وہ اپنی بھانجی سے والد کی شادی کرنا چاہتی تھیں۔ اسے لیے اماں کو دادی صاحبہ کے دل میں جگہ کرنے میں بڑی دقّت اُٹھانا پڑی۔ میرے والد کی پہلی شادی سے دو لڑکیاں تھیں۔ امّاں ان دونوں لڑکیوں کی ہی سوتیلی ماں نہ تھیں بلکہ سارے گھر کے لیے سوتیلی تھیں اس لیے اماں کا سہاگ کا زمانہ بھی کچھ سکون کے ساتھ نہیں گزرا۔ پھر ایک دن دوپہر کے گیارہ بجے والد مردانے میں سے اٹھ کر گھر کے کمرے میں آئے۔ اُنھوں نے کسی سے بات نہیں کی، چادر اوڑھ کر اپنے پلنگ پر لیٹ گئے۔ سارے بدن میں ایک قسم کا رعشہ سا تھا۔ حکیم ڈاکٹر دوڑنے لگے۔ آگرے کے مشہور حکیموں کا سارا خاندان سب ہی قریب کے عزیز، ماشاء اللہ خاں ولایت کے پاس شدہ ڈاکٹر والد کے بہت خاص دوست، سب دن بھر تدبیریں کرتے رہے۔ اُنھوں نے آنکھ بھی نہ کھولی اور رات کے گیارہ بجے ۳۹ سال کی عمر میں دو یتیم بچے اور ایک جوان بیوہ کو بے یار و مددگار چھوڑ گئے۔ یہ نومبر ۱۹۰۳ء کی بات ہے۔ والدہ کی عمر اس وقت ۲۳ سال کی، میری عمر پونے دو سال اور میرے چھوٹے بھائی کی عمر تین مہینے کی تھی۔ کمرے میں میاں کی لاش پڑی ہوئی تھی کہ امّاں سے کنجیاں لے لی گئیں اور لاش اُٹھنے سے

پہلے کمرے کا سامان اُٹھنے لگا۔ خصوصاً کاغذات کی قسم سے کوئی چیز بھی نہ چھوڑی۔ کتابیں اور دیواروں پر لگی ہوئی وصلیاں اور فوٹو تک اتار لیے گئے۔ اماں پتھر کی مورت بنی سب دیکھتی رہیں۔ ان کی نظر میں یہ سب ہیچ تھا۔ وہ تو اس بے روح جسم کو تک رہی تھیں جو اُنھیں ان کا گھر بار چھڑا کر لایا تھا اور جس کی خوشی پر اُنھوں نے اپنی دنیا تج دی تھی۔ سارے شہر میں ان کی جوانمرگی اور اچانک موت پر کُہرام مچا ہوا تھا۔ جو سنتا تھا بدحواس ہو کر دوڑا چلا آ رہا تھا مگر قریب کے عزیزوں کو رونے کی بھی فرصت نہ تھی۔ سارے کاغذ اور گانو کا حساب غُرد بُرد ہو گیا تھا۔ جس جس پر میاں کا واجب تھا اس سے ہم محروم ہو گئے تھے اور جس جس کی امانتیں میاں کے پاس تھیں ان کی ادائیگی ہمارے ذمّے واجب ہو گئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عمر قرض ادا کرتے، سُود دیتے اور تنگی برداشت کرتے گزر گئی۔

یہ زمینداری، جاگیر اور شہری جائداد جو ہمارے لیے رحمت تھی ایک عذاب بنی ہوئی تھی اور خاندان کا بزرگ اور شہر میں مقبولِ عام ہونا ایک آفت ہو گیا تھا۔ یہی ہماری عزّت و آرام اور یہی ہماری مصیبتوں کا سرچشمہ تھا۔ میرے دادا حضور کا جب وصال ہوا تو والد سترہ اٹھارہ سال کے تھے۔ دادا حضور چونکہ تارک الدنیا اور گوشہ گیر قسم کے بزرگ تھے اس لیے عزیزوں نے جائداد اور خاندانی اثاثے اور تبرکات کا ایک بڑا حصّہ اپنے قبضے میں کر لیا تھا اس لیے والد کی مختصر عمر کا ایک بہترین زمانہ مقدمہ بازی میں گزرا۔ ایک مقدمے میں کامیابی ہوئی تھی اور دوسرے مقدموں کے راستے کھلے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ ہمارے مخالفین کے لیے یہ بہترین موقع تھا کہ ہمارے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی ہمیں ختم کر دیا جائے۔ جو بالکل قریب کے عزیز تھے اور جو ہمارے پشت پناہ ہو سکتے تھے ان کا حال پہلے عرض کر چکا ہوں۔ ان حالات میں ہمارے ہمدردوں نے امّاں کو مشورہ دیا کہ ان بچوں کو لے کر آپ میکے چلی جائیں مگر اُنھوں نے کہا مالی کے پھول اس کی چھبڑی ہی میں اچھے لگتے ہیں۔ ان بچوں کی جو عزّت اس گھر میں بیٹھنے سے ہو گی کہیں اور نہ ہو گی، اور وہ خود مرتے دم تک اسی گھر میں رہیں۔ وہ سکون کی تمنا تو بہت کرتی تھیں، میں نے ایک مکان علاحدہ ان کے لیے بنوا بھی دیا مگر وہ یہیں رہیں۔ وہ چاہتیں تو میرے چھوٹے بھائی کے پاس مستقل رہ سکتی تھیں۔ وہاں ان کے لیے موٹر کاریں تھیں، عالی شان کوٹھی تھی اور اعلیٰ سے اعلیٰ عزّت اور حکومت تھی۔ دو تین مہینے سال میں وہ وہاں گزار آتی تھیں لیکن وہ اپنے شوہر کے گھر کو ایک مقدّس مقام سمجھتی تھیں اور اپنے آپ کو اس گھر کی لونڈی کہتی تھیں۔ وہ اکثر کہتیں "میں تمھارے

باپ دادا کو کیا جواب دوں گی کہ میں نے ان کی دہلیز کیوں چھوڑی''؟ اور آخر اُنھوں نے اسی گھر میں اس طرح جان دی جس طرح بہت بڑے اور روحانی آدمی جان دیتے ہیں۔ اُنھیں اسی جگہ کفن پہنایا گیا جس جگہ وہ بیاہ کر پہلی دفعہ آ کر بیٹھی تھیں اور ان کا جنازہ اسی دروازے سے نکلا جہاں سے ان کی پالکی آئی تھی۔ یہی ان کی تمنا تھی۔

ہمارے خاندان نے بڑے انقلاب دیکھے بھی اور جھیلے بھی۔ میرے جدِّ اعلیٰ سیّد ابراہیم قطب مدنی جہانگیر کے آخری عہد میں مدینے سے آگرے آئے۔ یہ پچیس واسطوں سے امام حسین علیہ السّلام کی اولاد میں تھے۔ آنے کے اسباب کی جو روایت عام صوفیوں کی ہے تقریباً وہی ان کی بھی ہے۔ خاں جہاں لودھی اور عہد جہانگیری کے دوسرے امراء حضرت کے معتقد ہوئے۔ سکونت کے لیے ایک حویلی اور درس و تدریس کے لیے ایک مسجد بنوادی۔ اب سے کچھ پہلے تک یہ جگہ لودھی خاں کا ٹیلہ کہلاتی تھی اور جمنا کے ساحل پر واقع تھی۔ خان جہاں لودھی نے شاہجہاں سے بغاوت کی اور لڑائی میں مارا گیا۔ پھر جاٹ گردی کا زمانہ آیا۔ اسی زمانے میں ہمارے یہاں آگ لگی اور علاوہ دوسرے سامان کے ایک ہزار قلمی کتابیں جل گئیں۔ اس سانحے کا ذکر خصوصیت سے میرے جدِّ سوم سیّد امجد علی شاہ المتخلص بہ اصغر نے کیا ہے۔ پھر کمپنی کے دورِ حکومت میں اس مسجد اور زمین کے ایک حصّے پر سے بھی قبضہ جاتا رہا۔ مرہٹوں کا جب زمانہ آیا تو مہاراجہ دولت راؤ سندھیا میرے جدِّ سوم سیّد منور علی شاہ کا معتقد ہو گیا اور اس نے تین گانو حینِ حیات اور ایک گانو بطور آل تمغہ نسلاً بعد نسلٍ نذر کیا اور سند میں لکھا کہ شاہ صاحب موصوف کے بزرگوں کی خدمت شاہانِ پیشیں کرتے آئے ہیں اس لیے مجھ پر بھی ان کی خدمت لازمی ہے۔ یہ معافی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نسلاً بعد نسلٍ تھی مگر جب ۱۸۵۷ء کا انقلاب ہوا تو میرے دادا صاحب کے بڑے بھائی سیّد امیر علی شاہ صاحب قید کر لیے گئے اور قلعے میں ان کی پیشی ہوئی۔ وہ تو جیسے تیسے بری ہو گئے مگر معافی ضبط ہو گئی جو کوششوں اور جانفشانی سے واگزاشت ہوئی۔ گورنر جنرل نے لکھا کہ یہ معافی سیّد منور علی شاہ اور ان کی اولاد کے لیے ہمیشہ کے واسطے ہے اس لیے واگزاشت کی جاتی ہے۔ لیکن یہ ہمیشگی ۱۹۵۲ء میں قانون خاتمہ زمینداری کے تحت ختم کر دی گئی۔

میری ابتدا ایسے گھر میں ہوئی جہاں جاگیرداری قرض خواہوں اور سود خوار مہاجنوں کے شکنجے میں دم توڑ رہی تھی اور جہاں تصوّف کی صرف روایات ہی رہ گئی تھیں۔ ویسے بھی میرے خاندان میں مریدوں سے نذر قبول کرنے کا دستور نہ تھا بلکہ آمدنی کا ایک معقول حصّہ مریدوں پر

ہی خرچ کیا جاتا تھا۔ میرے والد مرید بھی نہیں کرتے تھے اور عام رئیسوں کی وضع اور رہن سہن رکھتے تھے۔ ان کے بعد ہمیں تو ہماری زمینداری کی پوری آمدنی بھی نہیں ملتی تھی۔ اماں تنگی ترشی سے گزر کرتی تھیں۔ اکثر روزمرہ کے خرچ کے لیے وہ زیور رہن رکھواتیں اور جب گانو سے فصل کی آمدنی آتی تو زیور چھوٹ کر آتا۔ یہ سلسلہ جب میرے چھوٹے بھائی احمد علی شاہ منصفی کے عہدے پر مقرر ہوئے تو ختم ہوا مگر موروثی قرضے کا بار اس کے بعد بھی قائم رہا اور اس کو ادا کر کے ذرا سانس لی تھی کہ زمینداری ختم ہوگئی۔ لیکن ہم نے بزرگوں کی روایات اور وضع داری کو قائم رکھا۔ اس کے لیے بڑی سختیاں جھیلنی پڑیں۔ اس رکھ رکھاؤ کو قائم رکھنے میں امّاں کے سلیقے کو بڑا دخل ہے۔ گھر کے باہر ہی نہیں بلکہ خاندان والے بھی ہمیں بڑا مالدار سمجھتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ خاتمۂ زمینداری کے بعد جب میں نے اپنے خاندانی اصول کے خلاف مطب شروع کیا تو یہ مجھ پر ایک اور بار بن گیا۔ نہ مجھے کسی سے دوا کی قیمت مانگنے کی ہمت ہوئی اور نہ کسی کو قیمت دینے کی، اور آخر اس شغل یا اس وضع کو قائم رکھنے کے لیے مجھے ہومیوپیتھی کی سستی دواؤں کا سہارا لینا پڑا اور اب لوگوں سے ملنے اور لکھنے پڑھنے کے مستقل مشاغل کے علاوہ یہ مشغلہ بھی مجھ پر مسلّط ہوگیا ہے۔۔

سب سے پہلی استاد تو میری ماں تھیں۔ وہ اردو کے علاوہ تھوڑی بہت فارسی بھی جانتی تھیں اور خدا، رسول کی باتیں بڑے دلچسپ انداز اور قصّے کہانیوں کی صورت میں سُنایا کرتی تھیں۔ ضروری مسائل اور قصص الانبیا کا بہت ساحصّہ انھیں یاد تھا۔ پھر ہماری دادی کی سوتیلی بہن ہمارے لیے مقرّر ہوگئیں۔ وہ ہمارے یہاں ہی رہتی تھیں۔ ان کے بعد کئی معلّم بدلے اور اسی طرح انگریزی کے معلّم بھی بدلتے رہے۔ قابلِ تذکرہ ایک تو مولوی عبدالمجید صاحب ٹونکی ہیں۔ ان سے عربی کی تعلیم کی ابتدا ہوئی۔ یہ مولوی برکات احمد صاحب ٹونکی کے شاگرد تھے۔ اور مذہبی اعتبار سے بڑے کٹّر تھے۔ ہمارے یہاں کے عرس و فاتحہ اور صوفیانہ عقائد کے خلاف ہمارے ذہنوں کو متاثر کرتے رہتے تھے۔ وہ ہمارے یہاں ہی رہتے تھے اور اس لیے ہر وقت مسلّط رہتے۔ وہ شعر و شاعری اور ہر لطیف شے سے معرّا تھے۔ یاد نہیں کبھی عید بقرعید بھی اُنھوں نے ہم سے مسکرا کر بات کی ہو۔ اُنھوں نے دس گیارہ سال کی عمر میں تفسیر جلالین، مشکوٰۃ اور منطق کی ابتدائی کتاب مرقاۃ تک ہم دونوں بھائیوں کو پڑھا دیا تھا اور اردو سے عربی میں بھی ہم اچھا خاصا ترجمہ کرلیتے تھے۔ میرے بہنوئی سیّد شہزاد علی صاحب اس زمانے میں علی گڑھ میں جیلر تھے اور ہم لوگ نمائش دیکھنے وہاں جایا کرتے تھے۔ ان کے تعلّقات علی گڑھ کالج میں بھی تھے۔ اس زمانے میں کالج ہی

تھا، یونیورسٹی نہیں ہوا تھا۔ امّاں عربی بالکل نہیں جانتی تھیں۔ اُنھیں فکر تھی کہ مولوی صاحب بچّوں کو کچھ پڑھاتے بھی ہیں یا نہیں۔ بظاہر تو ہم صبح سے دس بجے تک مولوی صاحب سے پڑھتے تھے۔ پھر کھانے کی چھٹی ہوتی اور گیارہ بارہ بجے پھر مولوی صاحب کے پاس آجاتے۔ مولوی صاحب سوتے، اُٹھتے، بیٹھتے اور ہم شام کے چار بجنے کا انتظار دھوپ کے اندازے سے کرتے رہتے۔ چار بجے چھٹی ہوتی تو مکان کی سب سے اوپر کی چھتوں پر چڑھ جاتے۔ مولوی صاحب کی نگاہیں وہاں بھی ہمارا تعاقب کرتی رہتیں۔ مغرب کے بعد رات کا کھانا کھا کر ذرا سانس لیتے تو انگریزی کے ماسٹر آجاتے۔ ہمارے پڑھنے کی سب ہی کو فکر تھی۔ جب ہم علی گڑھ گئے ہوئے تھے تو شہزاد علی صاحب ایک روز ہمیں کالج لے گئے اور امتحان کی غرض سے مولانا عبداللہ انصاری ناظم دینیات کی خدمت میں پیش کیا۔ چاروں طرف بڑی بڑی عمر کے داڑھی والے طالبِ علم جمع تھے۔ مولانا نے تفسیر جلالین اور مشکوٰۃ شریف میں ہمارا زبانی امتحان لیا اور پھر کاغذ پر ایک ایک عبارت اردو میں علاحدہ علاحدہ دونوں بھائیوں کو ترجمہ کرنے کے لیے دے دی۔ نتیجے میں مولانا بہت مسرور ہوئے اور متعجب بھی۔ میرے چھوٹے بھائی کو عربی کے طالب علم خوشی اور تعجب میں گود میں لیے لیے پھرے۔ مولانا نے باقاعدہ ہمارے امتحان کا نتیجہ اور حاصل کردہ نمبر لکھ کر جیلر صاحب کو بھیج دیے۔ یہ ہمارا پہلا امتحان تھا اور مولانا سب سے پہلے ممتحن۔ مولوی عبدالمجید صاحب کی قدر اور بڑھ گئی اور وہ کچھ روز کے لیے ہم پر اور مسلّط کر دیے گئے۔ کاش ہم امتحان میں فیل ہوجاتے تو مولانا کا بستر جلدی گول ہو جاتا۔ پھر بھی ان سے چھٹکارا جلد مل گیا، کیوں کہ چھوٹے بھائی کو انگریزی اسکول میں داخل کرانا تھا اس لیے طے یہ ہوا کہ مجھے مدرسہ عالیہ میں داخل کر دیا جائے۔ مدرسہ عالیہ میں حضرت مفتی سعادت اللہ صاحب سنبھلی مدرس اوّل تھے۔ ابتدا میں ان سے گھر پر کچھ کتابیں پڑھیں، پھر بھائی وکٹوریہ ہائی اسکول میں اور میں مدرسہ عالیہ میں داخل ہوگئے اور اس زمانے میں حضرت مفتی صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے اور مستفید ہونے کا موقع ملا۔ میں نے مدرسہ عالیہ میں اور وہاں کے علاوہ کتنے ہی عالموں سے پڑھا اور ان کی صحبت میں بیٹھا مگر یہ واقعہ ہے کہ میں نے مفتی صاحب جیسا وسیع علم، آزاد رائے، بے تعصب، ذکی ذہن اور خوش مزاج اور خوش لباس عالم نہیں دیکھا۔ اگر ان کی صحبت اور تعلیم مجھے میسّر نہ آتی تو مجھے یقین نہ آتا کہ علما میں اتنے صاحبِ دل اور بلند انسان بھی ہو سکتے ہیں۔ ان کی تعلیم سے مجھ میں آزاد ہو کر سوچنے، بات کو سمجھنے اور تنقید کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ یہ ان کی ہی تعلیم کا اثر تھا کہ میں نے

اٹھارہ سال کی عمر میں درسِ نظامیہ کی سندِ تکمیل حاصل کر لی۔ درسِ نظامیہ کے علاوہ اُنھوں نے مجھے کئی کتابیں جامعہ الازہر کے نصاب کی پڑھائیں اور یہ ان کی تربیت ہی کا فیض تھا کہ میں نے نوعمری ہی میں ''نغمہ اور اسلام'' جیسی تصنیف پیش کی جس نے علما کی مجلسوں میں تہلکہ مچا دیا۔ میرے خلاف منبروں پر وعظ کیے گئے۔ چندے جمع ہوئے مگر نتیجہ صفر رہا۔ نہ کسی نے جواب لکھا نہ مجمع عام میں کوئی مباحثے کے لیے تیار ہوا۔ یہ واقعہ مجھے یاد رہے گا کہ حضرت مفتی صاحب نے اس تصنیف پر ہمیشہ میرے سامنے میری ہمت شکنی کی اور غائبانہ میری بے حد تعریف فرمائی۔ مفتی صاحب سنبھل کے مشہور علما کے خاندان سے تھے۔ مولوی محمد حسن صاحب سنبھلی محشی ہدایہ ان کے ماموں تھے۔ وہ اپنے نانا حضرت مفتی عبدالسلام صاحب کے بہت معتقد و معترف تھے اور ان کے شعر بھی سُنایا کرتے تھے۔ مفتی صاحب خود بھی فارسی اردو کے شاعر تھے اور سعدیؔ تخلص فرماتے تھے۔ فارسی کے بڑے گہرے اور بہت اچھے شعر فرماتے تھے اور اردو میں بہت سادہ اور زبان کے -- وہ داغؔ کے بہت معترف تھے۔ مفتی صاحب کی خدمت میں مجھے شاعری میں کچھ حاصل کرنے کا موقع نہ ملا۔ میرے شعر کہنے کا علم بھی مفتی صاحب کو میرے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ہُوا اور اس کے بعد بھی میں ادب کی وجہ سے ان کے سامنے اپنے شعر کبھی نہ پڑھ سکا۔ مفتی صاحب کے صاحبزادے مفتی محمد حبیب صاحب پشاور یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر اور مفتی صاحب کے داماد محمد طاہر فاروقی مصنف سیرت اقبال' اردو کے پروفیسر ہیں۔

استادوں کے سلسلے میں سب سے زیادہ اہم شخصیت حضرت سراج السالکین شاہ محی الدین احمد نظامی بریلوی رحمتہ اللہ علیہ کی ہے وہ میرے استاد ہی نہیں استاد سے زیادہ میرے شیخِ طریقت بلکہ شیخِ طریقت سے بھی بہت زیادہ تھے۔ اگر میرے اندر کوئی خوبی ہے تو ان کی ہے۔ میری عمر دس گیارہ سال کی تھی کہ بغداد شریف سے حضرت پیر سیّد ابراہیم سیف الدین ہندوستان اور پھر آگرے تشریف لائے اور سارا شہر پروانوں کی طرح حضرت کے گرد جمع ہوگیا۔ میرے جدِّ اعلیٰ سیّد امجد علی شاہ اصغر کو اپنے خاندانی سلسلوں کے علاوہ قادری سلسلہ حضرت سیّد عبداللہ بغدادی رحمتہ اللہ علیہ سے پہنچا تھا۔ اس علاقے سے میری والدہ اور دادی صاحبہ نے ہم دونوں بھائیوں کو حضرت پیر صاحب کی خدمت میں حاضر کیا اور حضرت نے نہایت شفقت اور خصوصیت سے ہمیں سلسلۂ عالیہ قادریہ میں بیعت کر لیا۔ غالباً یہ اس بیعت ہی کی برکت تھی کہ اس کے چند عرصے بعد ہی مجھے حضرت سراج السالکین کی زیارت اور شرفِ غلامی حاصل ہوا۔ حضرت سراج السالکین

حضرت شاہ نیاز بے نیاز بریلوی کے پوتے اور جانشین تھے۔ حضرت شاہ نیاز رحمتہ اللہ علیہ میرے جد حضرت اصغر کے ہم خرقہ اور حضرت بغدادی کے خلیفہ تھے۔ اس طرح کی مجھے کئی خاندانی نسبتیں حاصل تھیں۔ اگر مجھے یہ حدیث (غالباً حضرت علی علیہ السّلام کا قول ہے) یاد نہ ہوتی کہ لوگوں سے ایسی سچی باتیں بھی نہ کہو جو وہ خدا اور رسول کو جھٹلائیں تو میں حضرت کے وہ واقعات بیان کرتا جو میں نے خود مشاہدہ کیے ہیں اور جن کے لیے ایک علاحدہ تصنیف کی ضرورت ہے۔ اتنا ضرور عرض کروں گا کہ حضرت کی زیارت کے بعد مجھے جنیدؒ و بایزیدؒ کی زیارت کی تمنا نہیں رہی۔ میں نے حضرت سے تصوّف کے دو مختصر رسالے سبقاً سبقاً پڑھے ہیں اور مختلف تقریریں سنی ہیں۔ میرے علمِ تصوّف کا سرمایہ یہی ہے۔

اس کے باوجود کہ میری عمر کا بہترین حصّہ علما اور صوفیا میں گزرا ہے مجھے سب علما اور صوفیوں سے حُسنِ ظن نہیں ہے۔ میرا پختہ یقین ہے کہ ان دس بیس ہزار میں مشکل سے دو چار آدمی نکلیں گے۔ صوفیوں کی اکثریت جاہل، غلط کار اور ریا کار ہے اور علمائے ظاہر متعصب، کوتاہ نظر اور کور باطن ہیں۔ ان کا ظاہر شریعت سے آراستہ اور باطن معصیت سے پیراستہ ہے اور اس کی ذمّہ داری اور باتوں کے علاوہ نصابِ تعلیم اور ماحول پر بھی ہے جو اس زمانے کے اعتبار سے قطعاً ناقص ہے۔ علمِ دین پڑھنے والے عموماً ایسے خاندانوں سے تعلّق رکھتے ہیں جن کا ماضی اور گرد و پیش اخلاقی یا علمی نہیں ہوتا اور وہ خاندانی اعتبار سے کند ذہن اور پست ہوتے ہیں۔ تعلیم حاصل کرنے سے ان کا مقصد بھی کوئی بلند نہیں ہوتا۔ امامت، وعظ، فتویٰ اور مدرّسی، یہی ان کی معراج ہے۔ میں کئی سال مدرسہ عالیہ کا ممتحن بھی رہا ہوں۔ طالبِ علموں کو بالعموم ان کے درسیات کے مصنفین کا حال اور نام بھی معلوم نہیں ہوتا۔ زمانے اور عقیدے کا سوال تو بعد کی چیز ہے۔ اب بھی درس میں ایسی کتابیں ہیں جن میں زمین کو ساکن ثابت کیا جاتا ہے۔ موجودہ اور رائج علوم اور نظریات سے یہ لوگ بالکل ناآشنا ہوتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ لوگ آپس میں خوب لڑ سکتے ہیں لیکن زندگی کے کسی خانے میں فٹ نہیں ہو سکتے۔ رہے صوفی تو چوں کہ ایک صوفی باپ کے بعد اس کا بیٹا ہی اس کی جگہ بیٹھتا ہے اور اس کے باپ کے مرید اس کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں۔ اس طرح اس کا کاروبار چل نکلتا ہے اور نہ ریاضت و مجاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے نہ تحصیلِ علم کی۔

میرے لیے یہ مشکل ہے کہ میں شاعری کو محبّت یا محبت کو شاعری سے علاحدہ کر کے بیان کر سکوں۔ ایسا نہیں کہ میری شاعری میں محبّت کے سوا کسی اور جذبے کی نمائندگی نہیں ہے لیکن

حسن ومحبت میری شاعری میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ میرے والد محترم سیّد اصغر علی شاہ صاحب اصغرؔ، چچا سیّد عبدالعلی شاہ صاحب بیدلؔ اور جدِ محترم حضور سیّد مظفر علی شاہ صاحب الّلہی مصنف ''جواہرِ غیبی'' اردو، فارسی کے شاعر تھے اور جدِّ سوم مولانا سیّد امجد علی شاہ صاحب اصغر صاحبِ دیوان فارسی اردو کے شاعر اور نظیر اکبر آبادی کے ہم عصر تھے۔ مختلف تذکروں میں حضرت کا بہ حیثیت شاعر کے ذکر ہے لیکن میری شاعری تو بہت ہی نوعمری سے شروع ہوئی جب گرمی کی ایک رات کو پلنگ پر لیٹے لیٹے میں نے گنگنانا شروع کیا اور چند مصرعوں یا شعروں کی صورت میں کوئی چیز مرتب ہوگئی۔ اس زمانے میں اچھی طرح لکھنا نہیں جانتا تھا مگر صبح اٹھ کر میں نے ان مصرعوں کو لکھ لیا اور پھر ایک کاغذ سے دوسرے کاغذ پر بار بار نقل کرتا رہا۔ یہ شعر عاشقانہ نہ تھے بلکہ اس حقیقتِ اعلیٰ سے متعلق تھے جسے میں بہت بچپن میں ایک مرتبہ خواب میں دیکھ چکا تھا کہ وہ میرا ہاتھ پکڑے ہوئے ہے اور میں اس کے ساتھ ایک نامعلوم اور غیر معین راستہ طے کر رہا ہوں۔ پھر میں نے ایک حسین عورت کو خواب میں دیکھا اور اس نے مجھ سے اور میں نے اس سے محبت کی اور صبح مجھے اس کی جدائی کا شدید احساس ہوا اور ایک مسدّس نما نظم میں میں نے اپنے جذبات اور اس واقعے کو ظاہر کیا اور رفتہ رفتہ بہت سی غزلیں اور نظمیں جمع ہوگئیں۔ خواب کی حقیقت کچھ بھی ہو مگر میری پوری زندگی کو یہ دونوں خواب گھیرے ہوئے ہیں۔ دو مختلف طاقتوں کی یہ کشمکش زندگی کی کسی منزل میں بھی ختم نہ ہوئی اور میرا یقین ہے کہ اگر وہ پاکیزہ طاقت میرا ہاتھ تھامے ہوئے نہ ہوتی تو میری تباہی یقینی تھی کیوں کہ اس عورت نے کبھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ وہ خواب ہی میں نہیں، جاگتے میں بھی میرے سامنے آئی۔ بہت سے جمیل ناموں اور بہت سی حسین صورتوں میں جانی پہچانی اور انجانی شکلوں میں۔ اس نے مجھ سے اور میں نے اس سے محبت کی، کبھی پاس سے اور کبھی دور سے۔ اسی کشمکش میں میری زندگی اور شاعری پھلتی پھولتی اور پھیلتی رہی۔ اسی میں مسائلِ حیات اور غمِ روزگار بھی شامل ہوتا گیا۔ میں محبت کو جنس اور ماورائے جنس دونوں سے عام اور دونوں میں مشترک مانتا ہوں۔ یہ میرا ذاتی نظریہ ہی نہیں ذاتی تجربہ اور مشاہدہ بھی ہے اسی لیے میری شاعری میں دوسرے مضامین کے علاوہ صرف محبت کے بھی آپ کئی روپ دیکھیں گے۔

میرا خیال یہ ہے کہ شاعر کو حقیقت سے بحث نہیں ہوتی بلکہ وہ حقیقت کو جس طرح محسوس کرتا اور جس طرح اس سے اثر پذیر ہوتا ہے، اس کو بہترین الفاظ اور اندازِ بیان میں ظاہر

کر دیتا ہے ورنہ صرف حقائق کا بیان شاعری نہیں ہے۔ غالباً شاعری اور فلسفے کا فرق اس طرح واضح ہو سکے۔

خود کا اظہار حُسن کی فطرت ہے۔ حقیقت ازلی ابدی ہے، اسے فنا نہیں ہے۔ لیکن اس کے مظاہر اور لباس بدلتے رہتے ہیں۔ خود نمائی کا تقاضا یہی ہے کہ لباس بدلتے رہیں۔ شاعر کی نظر حقیقت کو ان لباسوں میں ہی محسوس کر سکتی ہے اور جب مظاہر بدلتے ہیں تو وہ اضطراب محسوس کرتا ہے اور ایک مصوّر کی طرح اس حُسن کو جس نے اسے مضطرب کیا ہے اپنے الفاظ سے حیاتِ ابدی بخش دیتا ہے اور ان مٹتے ہوئے اور گزرتے ہوئے لمحات کو جاوداں بنا دیتا ہے۔ حُسن، خیر اور حق ایک ہی شے کے مختلف نام ہیں۔ شر اور باطل کا وجود فی الواقع نہیں ہے بلکہ وہ ایک سلبی اور اضافی شے ہے۔ حُسن یا خیر اور حق کا نہ ہونا ہی شر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حقیقی شاعر وہی ہے جو حُسن کی فطرت کا معمول بن جائے، جس کی زبان سے حُسن اپنی رنگینی اور بوقلمونی ظاہر کر سکے۔ یہی مجازی شاعری ہے اور یہی حقیقی شاعری۔

میرے حالات نے مجھے شاعری میں کوئی استاد میسّر نہ آنے دیا لیکن میری اس محرومی کی تلافی میری اس عادت نے کر دی کہ میں کبھی اپنی غلطی پر خبردار کرنے والوں سے بدمزہ نہیں ہوا بلکہ اُنھیں محبوب رکھنے لگا۔ یہ عادت غالباً اسے لیے پڑی کہ میں نے شعر کہنا شروع کیے تو اپنے بھائی اور چچازاد، پھوپھی زاد بھائیوں کو سُنائے۔ ان میں سے بعض نے داد دی اور بعض نے مذاق اُڑایا۔ داد بیداد کا یہ سلسلہ چلتا رہا پھر ہم سب نے ایک انجمن بنالی۔ پندرھویں دن گھر کے بزرگوں سے چھپ کر مشاعرے ہوتے اور اس میں بھی داد بیداد کا یہی سلسلہ قائم رہتا۔ پھر اس میں باہر کے کچھ نوعمر شریک ہوتے گئے اور بڑھتے بڑھتے اس انجمن کی شہرت شہر کے اساتذہ تک بھی پہنچی اور ساتھ ہی ساتھ میرے اچھے شعر بھی ایک زبان سے دوسری زبان تک پہنچتے گئے یہاں تک کہ میں نے بعض رسائل کو اپنی غزلیں بھیج دیں اور وہ چھپ گئیں۔ آگرے میں جو باہر کے شعرا آتے تو یہاں کے شعرا سے میرا ذکر سنتے اور مجھ سے ملتے۔ مشاعروں کی شرکت سے اس زمانے میں میں معذور تھا۔ میری ماں کی اجازت نہ تھی۔ مشاہیر شعرا میں سب سے پہلے مجھ سے ملنے آنے والوں میں جگر مرادآبادی مرحوم تھے۔ پھر ۱۹۲۴ء میں جوش صاحب سے ملاقات ہوئی اور اس کے بعد فانی بدایونی مرحوم سے۔ ان سب نے میری ہمّت افزائی کی۔ ان میں صرف جوش ملیح آبادی ایک ایسے شاعر تھے جو مجھے ٹوکتے بھی تھے۔ غلطیوں پر ٹوکنے والوں اور ہمّت افزائی کرنے

والوں میں جے پور کے شعرا حضرت بسمل خصوصیت سے اور مولانا اسمٰعیل خاں رزمی، سیّد احمد علی شاہ اور عبدالوہاب خاں عاصم قابلِ ذکر ہیں۔ آگرے میں اس زمانے میں بڑے اچھے صاحبِ ذوق ادیب اور شاعروں کا مجمع تھا۔ مولانا سیماب، خاں صاحب اخضر، شاہ دلگیر، ل۔ احمد، حامد حسن قادری، مخمور اکبرآبادی، مانی جائسی، فانی بدایونی، قمر بدایونی جیسے اصحاب کی محفلوں اور صحبتوں میں مجھے شرکت کا موقع ملتا رہا۔ جب فانی آگرے آئے تو یہ صحبتیں اکثر گرم ہونے لگیں اور مجھے نوعمروں کی صف سے نکال کر ان بزرگوں نے اپنی صف میں شامل کرلیا۔ ان حضرات کے ساتھ مخصوص صحبتوں میں شرکت کرنا پڑتی تھی۔ ان صحبتوں کی داد اور بیداد میرے لیے بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ مخصوص سخن فہم اور مشاہیر شعرا کی ان بے تکلف اور علمی محفلوں نے میری انفرادیت کو ابھارا۔ ان شعرا کے رنگ اور مضامین سے بچ کر کہنے کی عادت ڈالی اور ان شعرا کے مقابلے میں مخصوص سخن فہم حضرت اور خود ان شعرا سے داد حاصل کر کے مجھ میں خود اعتمادی پیدا ہوئی۔

میں یہ تو عرض نہیں کرسکتا کہ میری شاعری تقلید سے پاک ہے کیوں کہ علامات اصطلاحات اور ہیئت میں ذرا بھی نہ بدل سکا مگر میرا مزاج شاعری تقلیدی نہیں ہے اور جو کچھ میں نے دیکھا، سمجھا اور مجھ پر گزرا ہے، بیان کیا ہے۔ ایک مخصوص صحبت میں ایک دفعہ میں نے غزل پڑھی۔ ایک شعر تھا:

میرے رونے پہ رو دیے وہ بھی
بدگمانی نکل گئی دل کی

شاہ دلگیر ایڈیٹر "نقاد" نے کہا یہ شعر مسلّماتِ شاعری کے خلاف ہے۔ معشوق کبھی روتا نہیں ہے۔ دوسرے شعرا نے اپنے تیوروں اور نظروں سے ان کی تائید کی۔ دلگیر صاحب میرے رشتہ دار بھی تھے، ہم محلّہ بھی اور عمر میں مجھ سے بہت بڑے لیکن میں نے کہا: "میرا معشوق رو دیا تھا اس لیے میں نے شعر میں صحیح بات کہہ دی۔" ابھی کچھ روز کی بات ہے کہ دہلی میں علاّمہ نیاز فتحپوری سے شرفِ ملاقات حاصل ہوا اور موصوف کی فرمائش پر میں نے اپنی غزل پیش کی۔ جب یہ شعر پڑھا:

میں نہ دیکھوں تو ترے حُسن کی قیمت کیا ہے
میں نہ تڑپوں تو یہ اندازِ جفا کچھ بھی نہیں

تو علاّمہ داد دیتے دیتے سنجیدہ ہوگئے۔ فرمانے لگے "یہ توہینِ معشوق ہے۔" میں احتراماً خاموش ہوا مگر تاباں نے کہا یہ واسوخت ہے۔

فانی مرحوم کے کہنے سے میں نے طرح پر غزل کہنا چھوڑ دی، ویسے بھی میں طرح پر یا مشاعرے کے لیے غزل کہہ کر کبھی خوش اور مطمئن نہیں ہوا۔ اسی طرح میں اساتذہ کی یا کسی کی مشہور غزل پر غزل کہنا اپنے لیے جائز نہیں سمجھتا، مجبوری کی اور بات ہے کہ طرح ہی ایسی دی گئی ہو اور اس پر کہنا ضروری ہو۔ مثلاً پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی مرحوم ہمیشہ اپنے یہاں کے مشاعروں میں غالب کی غزل کا مصرع طرح دیا کرتے تھے اور ایک دو بار مجھے اس طرح پر غزل کہنا پڑی۔ اسی طرح میں دوسرے شعرا کا مضمون لے کر اس پر اضافہ کرنا اپنے لیے اچھا نہیں سمجھتا۔ اگر میرے یہاں ایسا کوئی شعر ہو تو وہ میرا ارادی اور بالقصد فعل نہ ہوگا لیکن جن اساتذہ اور شعرا نے میری غزلوں یا اشعار پر شعر کہے ہیں ان پر میں یہ اعتراض وارد نہیں کرتا ہوں بلکہ میں اسے اپنی عزت افزائی سمجھتا ہوں کہ انھوں نے میری غزل اور میرے اشعار کو اس درجہ قابلِ التفات سمجھا کہ بعض نے مضمون کے علاوہ مصرعے کے مصرعے اور شعر کے شعر اپنے کلام میں شامل کر لیے۔

میرے نظریات، افتادِ مزاج اور سوانح حیات بہت کچھ آپ کو میرے اشعار میں ملیں گے۔ کئی سال ہوئے جب کہا تھا:

اور کون جانے گا تیری بزم کے آداب　　　ہم نے دل دیا بھی ہے ہم نے دل لیا بھی ہے

بات کو طول دیجیے تو طویل ہو جاتی ہے —— ورنہ میرے سوانح حیات ہی کیا، بس یہی کہ نام محمد علی شاہ تخلص میکش۔ سنہ پیدائش ۱۹۰۲ء، تعلیم انگریزی کم فارسی اس سے کچھ زیادہ اور عربی ان دونوں سے کچھ اور زیادہ اور اب نہ کچھ کم نہ کچھ زیادہ۔ حتی الامکان تمام مشہور مذاہب مشہور فلسفوں اور مختلف علوم و فنون سے واقفیت کا شوق اور ہمت، تکمیل کسی کی بھی نہیں۔ اگر تصانیف کا اظہار بھی ضروری ہو تو ''نغمہ اور اسلام'' (جو اِزِسماع میں) ''میکدہ'' اور ''حرفِ تمنا'' (مجموعہ ہائے نظم و غزل) اور ''نقدِ اقبال''۔ ''متفرق مضامین'' ان کے علاوہ۔ یہ تو مطبوعہ ہیں، دو تین کتابیں مکمل اور غیر مکمل غیر مطبوعہ۔ ''داستانِ شب'' توحید و شرک، ''مسائلِ تصوف'' وغیرہ فقط!　　　(مطبوعہ نقوش، آپ بیتی نمبر۔ لاہور)

(۲)

لودھی خان کی نذر کردہ حویلی تباہ ہونے کے بعد سیّد امجد علی شاہ اصغر (متوفی ۱۲۳۰ھ) نے تاج گنج میں[1] سکونت اختیار کر لی اور کچھ عرصے بعد نائی کی منڈی حویلی خواجہ میں مکان تعمیر کر لیا اور وہیں عمر گزار دی۔ ان کے صاحب زادے سیّد متوّر علی شاہ صاحب (متوفی ۱۲۳۵ھ) نے

اپنے والد بزرگوار کے سامنے ہی میوہ کٹرہ خرید کر تعمیر کرایا اور پونے دوسو سال سے یہ خاندان اسی جگہ اور انھی مکانوں میں آباد ہے کیوں کہ ابتدا ہی سے ہمارے خاندان کی اولادِ ذکور بہت ہی محدود اور قلیل رہی چنانچہ سیّد منوّر علی شاہ کی اولادِ مذکور میں کل پانچ لڑکے دو بھائی ہم ہیں اور تین چچازاد بھائی تھے[۲]۔

میرے والد اپنے خاندان میں اولادِ اکبر اور بزرگوں کے صحیح جانشین تھے اس لیے میں اُن کا بڑا لڑکا ہونے کی وجہ سے ان کی جگہ اور ان کا قائم مقام سمجھا جانے لگا۔ رسم و رواج کے علاوہ اس کا کچھ جواز نہ تھا کیوں کہ جب والد صاحب قبلہ کا وصال ہوا تو میں ڈیڑھ سال کا تھا۔ گھر والے اور بزرگوں کے معتقدین گھنٹوں ان کے کارنامے اور واقعات سُنایا کرتے جس میں ان کی کرامات اور خدارسی سے لے کر ان کی عزّت و وجاہت اور تموّل کی بہت سی داستانیں ہوتی تھیں۔ بچپن سے ہم دونوں بھائی بڑے ذوق اور فخر سے یہ قصّے سنتے چلے آتے تھے۔ ہمیں یقین تھا کہ یہ سب چیز یں ہماری وارثت ہیں جو ہمارے بڑے ہونے کے انتظار میں کہیں امانت رکھی ہوئی ہیں۔ ہم یہ بھی د یکھتے تھے کہ ابھی سے بوڑھے اور جوان ہمارے ہاتھ پاؤ چومتے ہیں اور محفلوں میں ہمیں صدر پر بٹھایا جاتا ہے۔

ہماری تعلیم کے لیے ایک عربی فارسی کے عالم مستقل گھر پر رہتے تھے اور انگریزی پڑھانے کے لیے ایک ماسٹر روزانہ آتے تھے۔ کسی اسکول یا مدرسے میں داخلہ لے کر پڑھنا بھی خاندانی روایات کے خلاف تھا۔ اسکول اور مدرسہ تو جب دیکھا کہ اہلِ علم نے یہ مشورہ دیا کہ اب تعلیم گھر پر رہ کر ممکن نہیں ہے۔ غرض گزری ہوئی اور فضول رسموں کا ایک جال تھا جو ہر وقت گھیرے رہتا تھا لیکن کم عمری ہی میں میں نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ اِن قصّے کہانی بیان کرنے والوں کے اور ایک بڑی سی حویلی اور تھوڑی سی معافی زمینداری کے علاوہ بزرگوں کی عظمت و ثروت کی یادگار ہمارے پاس نہیں ہے جس پر ہم فخر کریں اور جیسی کہ توقع کی جاتی ہے ویسا ہونا مشکل ہے۔ اس کے بعد اکثر ایسا معلوم ہوتا کہ بزرگوں کی تعریف کرنے والے دراصل طنز کرتے ہیں کہ دیکھو وہ ایسے تھے اور تم کچھ بھی نہیں ہو۔ چوں کہ مجھے اپنے بزرگوں کا قائم مقام سمجھا جاتا تھا اور اگرچہ ''متاعِ بردہ'' کو میں نے کبھی ''قرض رہزن پر'' نہیں سمجھا مگر متاعِ بردہ کا جائز اور صحیح حقدار ہونے کا غیر اختیاری گناہگار ضرور رہا اس لیے میری ذات رہزنوں کی بھی اور محافظوں کی بھی مرکزِ توجہ بنی رہی۔ ان کی بھی جو مجھے راہ کا کانٹا سمجھتے تھے اور ان کی بھی جو مجھے بزرگوں کے نقشِ قدم پر دیکھنا

چاہتے تھے، اس لیے میرے نصیحت کرنے والے، میری غلطیوں کی تشہیر کرنے والے اور اتہام لگانے والے بھی بہت تھے۔ میرے مکان کا مردانہ حصّہ برِ راہ ہے۔ سڑک کے دوسری طرف چند ارباب نشاط کے مکان ہیں۔ ارباب نشاط بھی میرے لیے ناصح مشفق کا فرض انجام دیتے تھے۔ اُنھیں میری ذرا سی بے راہ روی یا خاندانی رواج کے خلاف کوئی بات برداشت نہ ہوتی تھی۔ کسی نہ کسی ذریعے سے میری نقل وحرکت کی خبر میری والدہ صاحبہ کو پہنچا دی جاتی۔ یہ پابندیاں جو اس وقت سخت ناگوار تھیں اگر نہ ہوتیں تو میری اخلاقی تباہی لازمی تھی۔

ہر بچّے کی طرح میری تعلیم وتربیت کی ابتدا والدہ صاحبہ نے ہی فرمائی۔ اُنھوں نے ناسمجھی کے زمانے ہی سے اچھے اعمال اور پاکیزگی کی تلقین اور برائیوں سے بچنے کی تاکید شروع کردی جب کہ صحیح معنی میں اچھے بُرے کا شعور بھی پیدا نہ ہوا تھا۔ وہ قصص الانبیاء کی حکایتیں اور اچھے لوگوں کے حال کہانیوں کی طرح دلچسپی سے سنایا کرتی تھیں۔ میری والدہ صاحبہ میر اعظم علی صاحب (غالب کے مکتوب الیہ اور ہمسایہ) کی پوتی تھیں، جس طرح میرے بزرگ اپنی سیادت اور رُوحانی علوم کے لیے مشہور تھے، اس طرح یہ خاندان اپنی سیادت کے ساتھ شریعت کی پابندی اور تقویٰ طہارت میں مشہور تھا۔ میر اعظم علی صاحب آگرہ کالج میں فارسی کے پہلے پروفیسر تھے۔ اُن کے صاحبزادے سیّد مشیر علی کو بھی اُنھوں نے اسی کالج میں معلّم کرادیا تھا مگر اُنھوں نے انگریز پرنسپل کو سلام نہ کیا اور جب ان کے والد نے اس بات پر جواب طلب کیا تو ملازمت چھوڑ دی اور ساری عمر توکّل پر بسر کی۔ اس حکایت کا مقصد اس خاندان کے افراد کی مزاجی کیفیت کا بیان کرنا تھا۔ والدہ صاحبہ بھی اپنی انتہائی محبّت کے باوجود ہم لوگوں کی ذرا سی طفلانہ غلط روش یا بے ادبی کی کوئی بات گوارا نہ کرسکتی تھیں۔

والد صاحب قبلہ کے انتقال کے وقت اُن کی عمر ۲۳ سال کی تھی۔ وہ معمولی اُردو فارسی پڑھی ہوئی تھیں مگر گھر کے حساب اور آمدنی وغیرہ سے ان کو کوئی واقفیت نہ تھی۔ والد صاحب کا انتقال چند گھنٹے بے ہوش رہ کر ہوگیا تھا اِس وقت گھر میں کوئی اور ذمّہ دار مرد بھی نہ تھا۔ ایک چچا صاحب تھے وہ پردیس میں تھے۔ گھر کی ہر چیز جو لے جائی جاسکتی تھی لے لی گئی۔ اور حساب کے کاغذات سب تلف ہوگئے۔ آمدنی کا تھوڑا سا حصّہ اخراجات کے لیے والد صاحب کو دیا جانے لگا۔ یہ سلسلہ اس وقت ختم ہوا جب ہم دونوں بھائیوں نے اپنا کام خود سنبھالا اور جب سنبھالنے اور سنبھلنے کا موقع جاتا رہا تھا۔

والد صاحب نے یہ زمانہ بڑے صبر اور خودداری سے بسر کیا۔ وہ اپنی معاشی پریشانی کسی پر بھی ظاہر نہیں ہونے دیتی تھیں۔ کبھی کبھی اُنھیں اپنا زیور رہن رکھنا پڑ جاتا تھا۔ خاندان والے اُنھیں کفایت شعاری کا طعنہ دیتے۔ اور ان کے سلیقے اور انتظام کے بھی مداح رہتے تھے۔ ہماری جائداد کا انتظام جن لوگوں کے ہاتھ میں تھا اُن کی آمدنی قلیل ہوتے ہوئے بھی بڑی فارغ البالی سے گزر بسر ہوتی تھی ہمارے ایک کارندے کے پاس دو گھوڑے اور چار بھینسیں تھیں۔

والدہ صاحبہ ہمیشہ ہماری دل جوئی کرتی رہتیں۔ اُنھوں نے کبھی ہمیں اپنی یتیمی اور بے چارگی محسوس نہ ہونے دی۔ ہم ہمیشہ یہی سمجھتے رہے کہ ہماری معاشرت، رہن سہن اور خرچ، اخراجات کا طریقہ سب سے بہتر اور شرافت کا مقتضا ہے۔ میں نے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ جو لوگ ہمیں ہمارے ماضی کے خواب دکھاتے رہتے ہیں، وہ ہمارے نادان دوست ہیں۔ نہ وہ زمانہ لوٹ کر آسکتا ہے نہ ہم اُن حالات کو پیدا کر سکتے ہیں، ہمارے بزرگوں کی سیاست یہ تھی کہ وہ عوام کی خدمت کرتے تھے، عوام اُن کے پیچھے چلتے اور اُن کی عزّت کرتے تھے۔ اس سے متاثر ہو کر حکام اُن سے تعلقات پیدا کرنے میں اپنی عزّت بھی سمجھتے تھے اور عوام کو قابو میں رکھنے کے لیے اُن بزرگوں سے تعلّقات پیدا کرنا ضروری بھی سمجھتے تھے۔ اس طرح یہ عوام کے کام حکّام سے کراتے رہتے۔ یہ ایک دائرہ تھا، پھر یہ سیاست ختم ہوگئی۔ میرے ابتدائی دور میں ہی چند سرمایہ دار آگے آ گئے تھے۔ وہ حکّام کو ناجائز ذریعوں سے متاثر کرتے تھے اور عوام پر بے پناہ رعب جما کر اور حکّام کے تعلّقات سے متاثر کر کے اپنا کام نکالتے اور عزّت پیدا کرتے تھے۔ یہ طریقہ ہر ایک کے قابو کا نہ تھا مگر اب یہ طریقہ بھی ختم ہی سا ہے۔ اب معزّزین ہر قسم کی دلالی کرتے ہیں، ان کے ساتھ غنڈوں کی ایک جماعت رہتی ہے اور اس لیے عوام ان کے قابو میں رہتے ہیں، گو اس سیاست کا دائرہ مقامی تھا مگر شہری زندگی پر اس کا بڑا اثر تھا۔ اس لیے اس میدان سے بھی مجھے پسپا ہونا پڑا۔

ابتدا سے میرے مزاج میں حجاب اور عزلت پسندی بہت ہے جو اکثر و بیشتر میری ترقّی کی راہوں میں حائل رہی ہے۔ والدہ صاحبہ کی خواہش کے باوجود میں نے بچپن میں بھی گوٹے پٹھے اور زری کا لباس نہیں پہنا حالاں کہ اس زمانے میں جوان اور بڈّھے رؤسا بھی اکثر ایسا لباس پہنتے تھے۔ محفلوں میں نمایاں جگہ بٹھایا جانا اور بزرگوں کا سا برتاؤ میرے لیے سخت پریشان کن تھا۔ میں ظاہری وضع داری کے اِن تقاضوں کو پورا نہ کر سکا جو لوگ مجھ سے چاہتے تھے۔ میں نے

۱۸۔۱۹سال کی عمر میں درس نظامی سے فراغت حاصل کر لی تھی لیکن صوفیوں کی طرح علماء بھی میری وضع قطع اور میرے عقائد سے متفق اور مطمئن نہ رہے البتہ اس تمام روایتی تہذیب و معاشرت میں جو چیز مجھے سب سے زیادہ عزیز تھی اور ہے وہ اپنی نسل کو خالص رکھنے کی کوشش اور اس کی حفاظت ہے جو صدیوں سے ہمارے بزرگ اپنا فریضہ سمجھتے آ رہے ہیں۔ میں اس بارے میں نہ کسی کو قائل کرنا چاہتا ہوں اور نہ خود قائل ہونا چاہتا ہوں۔ مجھے اس خون سے جو کربلا کی تپتی ہوئی ریت پر بہنے کے بعد بھی میری رگوں میں گردش کر رہا ہے، بے انتہا عقیدت ہی نہیں بے انتہا محبّت بھی ہے، اس عقیدت میں بڑی برکت بھی ہے اور بڑی ہدایت بھی۔ میری شاعری کی ابتدا بچپن اور کھیل کود کی عمر سے ہوئی، جب مجھے اچھی طرح لکھنا پڑھنا بھی نہیں آتا تھا لیکن میں گنگنا کر شعر موزوں کر لیتا تھا پھر بڑے اہتمام سے ایک کاغذ سے دوسرے کاغذ پر بار بار نقل کرتا۔ اس عمر کا تعیّن مشکل ہے۔ طالبِ علمی کے دَور میں ہمارے یہاں شعر شاعری معیوب اور تعلیم میں حارج سمجھی جاتی تھی۔ اس لیے اسے پوشیدہ رکھنا ضروری تھا۔ رفتہ رفتہ میرے چھوٹے بھائی پھوپھی زاد اور چچا زاد بھائی سب ہی شعر کہنے لگے اور پھر ایک انجمن سی بن گئی جس میں پندرہ روزہ مشاعرہ ہونے لگا۔ چچا زاد اور پھوپھی زاد بھائیوں پر ان کے سرپرستوں کی پابندیاں زیادہ نہ تھیں اس لیے ان کا حلقۂ احباب گھر سے باہر پھیلتا گیا اور وہ لوگ بھی ہماری انجمن میں شریک ہوتے گئے۔ اس طرح ہم سب کے شعر باہر جانے شروع ہو گئے۔ شاگردی اور استادی کا پیشہ کرنے والے شاعروں کی توجہ بھی ہم سب کی طرف ہونے لگی۔ اگرچہ ہم سب اپنی جگہ اپنے کو استاد سمجھتے تھے لہٰذا کسی استاد کے شاگرد نہ ہوئے۔ مگر اس طرح شعر و سخن کی محفلوں میں ہمارا ذکر پھیلتا گیا۔ اس زمانے میں آگرے میں شعر و شاعری کا بڑا چرچا تھا۔ مرزا خادم حسین رئیسؔ اور سیّد تصوّف حسین واصفؔ کا انتقال ہو چکا تھا۔ مرزا صاحب کے شاگرد خاص فلکؔ صاحب استادی کا پرچم بلند کیے ہوئے تھے۔ ان کے سو کے قریب شاگرد تھے جو ہر مشاعرے میں اُن کے ساتھ رہتے اور ان کے ایک ایک شعر پر زمین آسمان سر پر اُٹھا لیتے تھے۔ پُرانے اُستادوں میں شیخ بزرگ عالی تھے جو مرثیے اور سلام کہنے لگے تھے۔ یا پھر سیّد نثار علی صاحب نثارؔ باقی رہ گئے تھے جو ایک صوفی منش آدمی تھے۔ ان کے شاگردوں میں بیدمؔ وارثی، مظہر شامؔ اور صوفیؔ مخصوص تھے۔ اِدھر شاہ دلگیر اور خادم علی خاں اخضرؔ تھے۔ یہ سب لوگ مشاعروں کی رونق تھے اور بہت سے ہنگامے برپا کیے رہتے تھے۔ مخمورؔ صاحب اور ل۔ احمد اکبر آبادی علمی کام کرنے والے اور ایسے لوگ تھے جن کی ادبی

محفلوں میں وقعت تھی۔ مخمور صاحب کی نظمیں بڑی معیاری سمجھی جاتی تھیں اور نقاد میں بڑی قدر سے شائع کی جاتی تھیں۔ ایک عرصے کے بعد مولانا سیماب صاحب ملازمت سے مستعفی ہوکر ساغر نظامی کے ساتھ آگرے آگئے۔ اُن کے آنے سے آگرے کی ادبی فضا چمک اٹھی پھر بزم آفندی، نجم آفندی اور نیّر صاحب اپنے وطن لوٹ آئے۔ اس عہد کے نوعمر شاعروں میں رعنا صبا منظر اور شاہد صدیقی نے بڑی مقبولیت اور شہرت حاصل کی۔ اور جب فانی بدایونی اور مانی جائسی اور قمر بدایونی آگرے آگئے تو معلوم ہوتا تھا کہ آگرے والوں کے لیے شاعری کے علاوہ دلچسپی کا اور کوئی موضوع ہی نہیں رہا۔ آگرے کے بعض شعرا میں آپس میں چشمکیں بھی تھیں۔ مشاعروں سے الیکشن کے کنویسنگ کا کام بھی لیا جاتا تھا۔ کچھ اربابِ نشاط بھی بحیثیت شاعر، مشاعروں میں شریک ہونے لگی تھیں جس کی وجہ سے مشاعروں کا ماحول اکثر ہنگامہ خیز اور فتنہ پرور بھی ہوجاتا تھا۔ مگر آداب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹتا اور داد دینے میں کوئی بخل یا جانب داری سے کام نہیں لیتا تھا۔

میری شاعری کی ترقّی اور اصلاح میں ان مشاعروں کا کوئی خاص دخل نہ تھا۔ مجھے اِن مخصوص صحبتوں سے فائدہ پہنچا جو مولانا بسمل جے پوری سے تعلقات کی بنا پر میرے گھر پر منعقد ہوتی تھیں، جن میں شاعر کم اور سخن فہم زیادہ ہوتے تھے اور اُن کے علاوہ اُن مختصر صحبتوں سے فائدہ پہنچا جو اکثر کسی دوست یا صاحبِ ذوق کے یہاں ہوتی تھیں جن میں اکثر صرف فانی، مانی، مخمور، اور میں شریک ہوتے تھے۔ یا جب جگر یا جوش آجاتے تو ان کی وجہ سے مشاعروں کے علاوہ نشستیں ہوتی رہتی تھیں۔ پھر مخمور صاحب کے اثر سے آگرہ کالج میں بڑے شاندار مشاعرے ہونے لگے جس میں باہر کے مشاہیر بھی کبھی کبھی آجاتے تھے۔ یاس یگانہ بھی اس مشاعرے میں شریک ہوئے ہیں اور فانی صاحب جو مقامی مشاعروں میں شریک نہ ہوتے تھے مخمور صاحب کی وجہ سے کالج کے مشاعرے میں شریک ہوجاتے تھے۔ اسی طرح سینٹ جانس کالج میں مولانا حامد حسن قادری اور عابد حسن فریدی اُردو فارسی کے پروفیسر تھے۔ وہاں انجمن ترقیِ اُردو قائم تھی، اس کے سالانہ مشاعرے ہوتے تھے۔ آلِ احمد سرور، مجاز، جذبی، تاباں، یکے بعد دیگرے اس کالج میں آتے گئے اور کالج کی ادبی فضا کی رونق بڑھاتے رہے۔ کالج کی انجمن ترقّی اُردو کے سکریٹری کے فرائض آل احمد سرور نے بھی انجام دیے ہیں۔ مجھے خوشی ہوتی ہے کہ اب وہ کل ہند انجمن ترقیِ اُردو کے جنرل سکریٹری اور اُردو کے اہم ناقد اور مصنّف کی حیثیت سے روشناس ہیں، اسی طرح ساغر، مجاز، جذبی اور تاباں کا شمار، اُردو کے اہم اور مشہور شاعروں میں ہوتا ہے۔ یہ سب ابتدا سے میرے ہم صحبت اور مخلص دوست رہے ہیں۔

ان محفلوں اوران لوگوں میں بیٹھنے اُٹھنے اور شریک ہونے کا میری شاعرانہ تعمیر میں بڑا دخل ہے۔ اِن مخصوص محفلوں کی داد بڑی اہم سمجھی جاتی تھی۔ ایک ایک شعر پر مہینوں اہلِ علم اور عوام میں تبصرے ہوتے تھے۔ اور جو شعر مقبول ہوتے تھے وہ زبانوں پر چڑھ جاتے اور لوگ اُنھیں یاد رکھتے تھے ایک بات یہ بھی تھی کہ مجھے کم عمری کے باوجود فانیؔ صاحب اور مولانا سیمابؔ وغیرہ اپنی صف میں شمار کرتے تھے۔ یہ میری عزت افزائی بھی تھی اور میرے لیے ایک مشکل بھی اور آزمائش بھی۔ ہر مرحلے پر میری کوشش یہ ہوتی تھی کہ اِن حضرات کو نااُمید نہ کروں اور اپنی انفرادیت قائم رکھوں۔ اس کوشش سے مجھے بڑا فائدہ پہنچا۔ فانیؔ، مانیؔ، اور مخمورؔ صاحب اپنی نجی صحبتوں میں جب اشعار پر تبصرہ کرتے تو میں اسے بہت غور سے سنتا اور کوشش کرتا کہ اپنے اشعار کے متعلق ان حضرات کی غائبانہ رائے معلوم کروں۔

یہاں یہ ذکر شاید بے محل نہ ہو کہ اس زمانے کے اساتذہ دوسروں کے مضمون کو اپنے شعر میں کچھ ترمیم کر کے یا بقولِ خود ترقی دے کرلے لینا جائز سمجھتے تھے۔ مجھے اِن میں سے بعض شاعروں کے اس نظریے کا شکار بننا پڑا اور میرے دل کو تکلیف ہوئی تو میں اس طریقے کا مخالف ہو گیا اور جب سے اپنے اختیار سے جان کر کسی کے شعر کا مضمون اپنے شعر میں باندھنا اپنے لیے جائز نہیں سمجھتا۔

اب محفلوں کا وہ انداز، وہ وضع قطع، وہ آداب سب ''نقش ونگار طاق نسیاں'' ہو گئے۔ ان میں جو لوگ آگرے کی عزت آبرو تھے یا تو اس دُنیا سے گزر گئے یا پھر حضرت مخمورؔ اکبرآبادی، رعناؔ اور صباؔ اکبرآبادی، منظرؔ صدیقی، ریاض الدین احمد جیسے حضرات ''کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را'' کے مصداق پاکستان کی زینت بن گئے۔ ل احمد صاحب کاروبار کے سلسلے میں کلکتے میں اور اعجاز صدیقی شاعر کی ادارت کی وجہ سے بمبئی میں مقیم ہیں۔ اس زمانے کی یادگار اور میرے مخصوص احباب میں ساغرؔ جذبیؔ، تاباںؔ اور آل احمد سرورؔ رہ گئے ہیں۔ جوشؔ ملیح آبادی پاکستان چلے گئے مگر میرے لیے اپنا ایک بہتر جانشین عرشؔ ملسیانی کو یہاں چھوڑ گئے۔ یہ لوگ اپنی علمی اور شاعرانہ اور اس سے زیادہ اخلاقی اور انسانی خصوصیات کے علاوہ مجھے اس لیے بھی محبوب ہیں کہ اُنھیں دیکھ کر، ان کے پاس بیٹھ کر وہ سارے زمانے نظر میں پھر جاتے ہیں جو اب کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے:

مجھے چمن میں جو آتی ہے عمرِ رفتہ یاد
ہے ان گلوں میں مگر میری نکہتِ برباد

مجھ میں محبت کا جذبہ بہت شدید ہے۔ بچپن میں مجھے اپنی کھلائی اور اپنی ماں سے بے حد و بے حساب محبت تھی۔ گھر میں کوئی مہمان آ کر رخصت ہوتا تو میں چھپ چھپ کر روتا تھا۔ کئی کئی روز ایک نامعلوم کیفیت پریشان رکھتی تھی۔ میں نے کسی عمر میں بھی محبت کو جنسی جذبات میں محدود نہیں سمجھا۔ اگرچہ اُسے میں زندگی کے تقاضوں کی طرح ایک فطری ضرورت سمجھتا ہوں اور شریک زندگی کی اہمیت اور موانست کا ہمیشہ قائل رہا ہوں مگر بیوی کی موت پر مجھے خودکشی کرنے کا خیال کبھی نہیں آیا۔ میں نیاز فتح پوری کی یہ منطق کبھی نہ سمجھ سکا کہ ایک ایسے آدمی سے محبت ہو ہی نہیں سکتی جو ہماری جنسی تسکین کا آلہ نہ بن سکے۔

برتر اور برتر ترین کی تلاش اور حسن کو اپنانے کی کوشش ہر صحیح المزاج انسان کی فطرت ہے یہی فنونِ لطیفہ کی خالق ہے۔ اس میں مجاز و حقیقت کی تفریق محض نزاعِ لفظی ہے۔

شعر و ادب میں جو حالات و کیفیات جھوٹے اور سچے بڑے ذوق اور فخر سے بیان کیے جاتے ہیں۔ سوانح اور واقعات بیان کرتے وقت اُنھیں بیان کرنے میں ایک مہذب آدمی کو لاج آتی ہے۔ ویسے یہ حالات کوئی انوکھی بات بھی نہیں جنھیں بیان کیا جائے۔ یہ زمانہ سب پر ہی آتا ہے جب موجِ ہوا سے دل کا جام چھلک اُٹھتا ہے اور جب دل کے تار بے مضراب کے بج اُٹھتے ہیں۔ کوئی اس آگ سے دامن بچا جاتا ہے اور کوئی جل جاتا ہے، یہ واقعات کسی کے لیے کتنے ہی غیر اہم ہوں مگر ایک شاعر کے لیے، ان کی اہمیت بہت غیر معمولی ہوتی ہے:

فاش می گویم واز گفتۂ خود دلِ شادم
بندۂ عشقم واز ہر دو جہاں آزادم

سب کی طرح مجھ پر یہ بھی عالم ٹوٹ کر آیا اور میرے فطری حجاب نے میرا بہت ساتھ دیا۔ اکثر وہ لوگ جو مجھ سے متاثر تھے اور وہ جن سے میں متاثر تھا کوئی یقین حاصل نہ کر سکے:

زباں پہ نامِ محبت بھی جرم تھا، یعنی
ہم ان سے جُرمِ محبت بھی بخشوا نہ سکے

ان پے در پے صدموں سے میری شاعرانہ قوتیں جاگ اُٹھیں فکر پر جلا ہوگئی اور انسانیت کی رُوح جاگ اُٹھی۔ سب سے بڑھ کر عشق و ہوس میں امتیاز پیدا ہو گیا اور غالب کے اس شعر کے معنی پوری طرح سمجھ میں آ گئے :

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ چوں کہ میرا تعلق صوفیوں کے خاندان سے ہے اس لیے مجھے تصوّف سے واقفیت ہونا ہی چاہیے اور میری شاعری پر تصوّف کا رنگ غالب رہنا چاہیے لیکن واقعہ ایسا نہیں ہے۔ اوّل تو میں نے اپنے بزرگوں کی زیارت ہی نہیں کی۔ نہ اُن کی تعلیم وصحبت مجھے میسّر آئی۔ عموماً جسے تصوّف سمجھا جاتا ہے وہ کشف وکرامات کی داستانیں یا کچھ زبان زد صوفیانہ فقرے اور دو چار اشغال کے نام ہیں۔ اس کے علاوہ ابتدا میں مجھے جن علما نے تعلیم دی وہ تصوّف کے مخالف تھے۔ اگر مجھے شیخ الحدیث مولانا سعادت اللہ سنبھلیؒ سے تعلیم حاصل کرنے کی سعادت میسّر نہ آئی ہوتی تو میں یہ سمجھتا کہ سارے علما ظاہر ہیں، تنگ نظر اور برخود غلط ہیں اور ان کا:

دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے

اور اگر مجھے سراج السالکین شاہ محی الدین احمد نظامی بریلویؒ کی مختصر صحبت اور غلامی کا شرف نہ حاصل ہوا ہوتا تو میں سمجھتا کہ جنید وبایزید محض فرضی شخصیتیں تھیں۔ حضرت کی تعلیم سے کائنات کے متعلق میرا نقطۂ نظر بدل گیا اور یقین آ گیا کہ ؎ زیک آتش چراغِ کعبہ وبُت خانہ می سوزند

میں اس سے پہلے بھی مختلف مذاہب کی الہامی اور غیر الہامی کتابوں اور مابعد الطبیعات کے مختلف مکاتیبِ فکر کا مطالعہ ایک طالبِ علم کی حیثیت سے کر چکا تھا یہاں تک کہ بہائی مذہب کی تصانیف خصوصاً ہُفت وادی، کا ادبی حیثیت سے مدّاح رہ چکا تھا لیکن اس وقت معلوم ہوا کہ حکیم الامتہ علاّمہ اقبال نے کتنا صحیح کہا ہے:

گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشّاف
ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب

یہ اظہار ضروری ہے کہ اس کے باوجود کہ میں ایک خاص مکتبِ فکر کا ماننے والا ہوں، میں نے اپنی فکرِ شعری اور غزل کو راہِ مجاز سے ہٹانے کی کوشش نہیں کی۔ میں مجاز کو حقیقت سے علاحدہ بھی نہیں سمجھتا ہوں اس لیے تصوف کو شاعری کا موضوع بنانے کا نہ قایل ہوں نہ اس کی ضرورت سمجھتا ہوں۔

مجھے اپنے اس گھر سے بڑی محبّت وعقیدت ہے اس لیے ہی نہیں کہ یہ میرے بزرگوں کا مسکن ہے اور میرا بچپن اور جوانی اس میں گزری ہے بلکہ اس لیے کہ اس میں ابتدا سے اب تک بڑے بڑے بزرگانِ دین، مشاہیرِ ادب اور ہر فن کے اہلِ کمال آتے رہے ہیں اگر ان دیواروں کی زبان ہوتی تو وہ آپ کو میاں نظیرؔ، شاہ بیدارؔ، مرزا غالبؔ، محسنؔ کاکوری، غلام غوث بے خبرؔ، غلام

امام شہیدؔ کی باتیں سُناتیں ۔ فانیؔ ، یگانہؔ ، جگرؔ ، جوشؔ ، تلوک چند محرومؔ اور دوسرے نامی گرامی شعرا کی نظمیں غزلیں اور لطیفے بیان کرتیں ۔ ڈاکٹر ذاکر حسین ، قاضی عبدالغفار ، رشید احمد صدیقی کے ترشے ترشائے فقرے اور نصیحتیں سُناتیں ۔ تذکرۂ غوثیہ والے ، گل حسن شاہ ، یوسف شاہ جی ، بسمل جے پوری کے صوفیانہ کلمات اور لطائف اور آفتابِ موسیقی ، فیاض خاں ، مشتاق حسین خاں اور امیر خاں کے نغمے اور موسیقی پر تبصرے بیان کرتیں ۔

میں ان سب سے متاثر ہوا ہوں جو مجھے یاد ہیں اور ان سے بھی جو مجھے یاد نہیں ۔ جن کا ذکر کرسکتا ہوں اُن سے بھی اور جن کا ذکر نہیں کرسکتا ان سے بھی ۔ مجھے پوری طرح خود بھی اندازہ نہیں کہ کِس کِس نے مجھے بنایا ہے اور بگاڑا ہے جیسے بچے ریت میں گھر بناتے ہیں اور بگاڑ دیتے ہیں ۔ (مطبوعہ ۔ آج کل ، نئی دہلی ۔ دسمبر ۱۹۷۱ء)

(۳)

شاعری جزویست از پیغمبری کا مطلب اگر یہ ہے کہ

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

تو اس میں کوئی شک نہیں اور اگر اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ شاعر دُنیا والوں کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوتا ہے تو مجھے اس میں کلام ہے ۔ میں شاعری کو اظہارِ ذات کا وسیلہ سمجھتا ہوں ۔ ذات سے میری مراد شاعر کی شخصیت اور انفرادیت ہے ۔ شاعر کی شخصیت جتنی تناور ، جتنی حسین اور جتنی وسیع ہوگی اس کی شاعری بھی اس کا سایہ اور ظل ہوگی ۔ یہ اس کی طبیعت اور اس کے ماحول کی سازگاری وعدم سازگاری پر موقوف ہے کہ وہ کیا صورتیں اختیار کرتی ہے ۔

شاعر کی شخصیت اگر اپنی انفرادی حدود سے گزر چکی ہے اور آفاقیت کی طرف سفر کر رہی ہے جب بھی میں اسے اظہارِ ذات ہی کہوں گا اور اس وقت ذات سے وہ آفاقی ذات مراد لوں گا جو انبساط پذیر ہے ۔ یہ ساری کائنات میرے عقیدے میں اظہارِ ذات ہی ہے جو آفاق اور اَنفُس دونوں کو حاوی ہے ۔

میں ادب کو جدید وقدیم کے خانوں میں بانٹنے اور ان کے سانچوں سے ان کا حُسن و قبح متعیّن کرنے کا قائل نہیں ہوں کیوں کہ اچھائی اور بُرائی ، پستی و بلندی اضافی تو ہوسکتی ہے مگر سانچوں سے متعیّن نہیں کی جاسکتی ۔ یہ باتیں اپنے آپ کو دوسروں سے بے کاوش کے بلند ثابت کرنے کے سوا کچھ نہیں ہیں :

دلیل کم نظری قصۂ قدیم وجدید

مرزا غالبؔ نے کہا ہے:

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

بالکل یہی حالت میری اور میری شاعری کی ہے۔ میرا خاندان درویش جاگیرداروں کا ہے۔ شہر کے شریفوں اور رئیسوں میں اس کا شمار ہوتا چلا آیا ہے۔ میں ڈھائی سال کا تھا کہ میرے والد کا انتقال ہوگیا اور بڑا بیٹا ہونے کی وجہ سے میں اُن کی جگہ بٹھا دیا گیا۔ یہ روایت اور رسم کی پابندی تھی۔ مجھ تک میرے بزرگوں کا جو ورثہ پہنچا وہ قرض سے دبی ہوئی اور خورد بُرد کی ہوئی کچھ جائداد یا عزّت و وجاہت کی خالی خولی روایتیں جو جھوٹی تسکین تو دے سکتی تھیں مگر کسی کام نہ آسکتی تھیں۔ البتہ ایک چیز ضرور مجھے ملی اور وہ خواص عوام کی بے پناہ محبّت تھی جو مجھ سے وابستہ ہوگئی لیکن اس کی قیمت جو مجھے چُکانی پڑی وہ شدید پابندیوں اور رسم و روایت کے علاوہ آداب کا لحاظ رکھنے کی جکڑ بندیوں کی صورت میں تھی جو ہر قدم پر ہر طرح کی مشکلیں پیدا کرتی تھی۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو ایک ایک کر کے ان قیدوں کو توڑا البتہ صرف ایک مزاج باقی رہ گیا جو اگلی شرافت کے تصوّر اور میری ماں کی تربیت نے بنا دیا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ میں اس کے اثر سے آج تک آزاد نہ ہوسکا اور نہ میں نے آزاد ہونا چاہا کیوں کہ یہ دولت مجھے بہت عزیز تھی یہ میرے بزرگوں کا خون اور میری ماں کا دودھ تھا جو میری رگوں میں دوڑ رہا تھا اور جس کے بغیر میں کچھ بھی نہیں رہتا۔

میرے دبے ہوئے احساسات کو ظاہر ہونے کے لیے صرف ایک راستہ ملا اور وہ میری شاعری تھی۔ ایک گوشۂ تنہائی ایک قلم اور تھوڑا سا کاغذ۔ یہی وہ مقام تھا جہاں میں دل کی بات کہہ سکا اور جو میرے ہاتھ نہ آسکا اور مجھے اپنے دل کی بات نہ کہہ سکا۔ اس سے میں نے اپنے دل کی باتیں شعر کی زبان میں کہہ دیں۔ جس کو میں جانے سے نہ روک سکا اسے میں نے لفظوں میں نظر بند کردیا۔ وہ کوئی دل رُبا انسان تھا۔ کوئی ہوش رُبا منظر تھا یا کوئی بگڑتا ہوا سماج تھا۔ یا کوئی فلسفیانہ نظریہ۔ میں نے بہت کم عمری میں شعر کہنا شروع کردیا تھا لیکن نوعمروں کا شعر شاعری کرنا اور شاعروں کی صحبت میں بیٹھنا میرے گھر کی روایات کے خلاف تھا اس لیے میں کسی سے اصلاح نہ

لے سکا۔ اس کے علاوہ میری عمر کم اور تعلیم زیادہ تھی۔ میں نے بیس سال کی عمر میں ایک کتاب "نغمہ اور اسلام" لکھی جس کا علما ظاہر میں برسوں چرچا رہا اور پھر مولانا عبدالماجد دریابادی اور مرزا عظیم بیگ چغتائی کی معرکے کی بنیاد ہی کتاب بن گئی۔ غرض اپنی ناتجربہ کاری یا برخود غلط ہونے کی وجہ سے کوئی استاد نہ ملا۔ اس دَور کے چند شعر عرض کرتا ہوں یہ میری ابتدائی عمر سے لے کر ۱۵۔۱۶ سال کی عمر تک کی شاعری کا نمونہ ہے :

جنوں میرا زلفیں تری اور ناصح
مقدّر سے ہیں سب ہی اُلجھانے والے

پھر رہی ہے وہ بزم آنکھوں میں
یادِ صحبت بھی خوب صحبت ہے

وہ گئے حشر جو اُٹھاتے تھے
وہ نہیں ہیں تو کیوں قیامت ہے

تھوڑے روز میں آہستہ آہستہ لوگوں کو میری شعر گوئی کا علم ہوتا گیا اور شہر کے اور پردیس کے شاعر مجھ سے شعر سُننے اور مجھ سے ملنے آنے لگے۔ جن لوگوں نے میری ہمّت بڑھائی اُن میں خصوصیت کے ساتھ جگؔر مرادآبادی، فانؔی بدایونی، جوشؔ ملیح آبادی۔ بسمؔل جے پوری وغیرہ ہیں۔ مولانا سیمابؔ اکبرآبادی نے اپنے رسالے ''پیمانہ'' میں میری غزلیں شائع کرنا شروع کردیں اور پھر باہر کے رسالے بھی میری غزلیں مانگنے اور شائع کرنے لگے۔ اس طرح میری ہمّت بڑھتی رہی۔ آگرہ اس زمانے میں اہلِ ذوق اور سخن فہم حضرات کا مرکز تھا، کوئی شعر اچھا ہوتا تو محفلوں محفلوں اس کا ذکر رہتا اور لوگ ایک دوسرے کو سُناتے پھرتے۔ اس زمانے میں میرے یہ شعر بہت مشہور ہوئے اس سے آپ کو یہ اندازہ بھی ہوجائے گا کہ میری شاعری کا ابتدائی رنگ کیا تھا:

کچھ اس طرح ہوئیں تقسیم شوخیاں اُن کی
ہرایک نے یہی سمجھا مجھی کو دیکھتے ہیں

وہ میری التجا سے پھیری ہوئی نگاہیں
وہ نازکی لب سے چھلکا ہُوا تبسّم

عجیب طرح محبّت میں انقلاب ہُوا
نگاہِ شوق ہوئی شوقِ اضطراب ہُوا

ترے شباب نے یوں دی مری نگاہ کی داد
ستارا چاند ہُوا چاند آفتاب ہُوا

تم نے دکھائی ہیں وہ چُراکر نگاہ کو
جو شوخیاں کہ چھوٹ گئی تھیں نگاہ سے

بربادِ آرزو کو دیوانہ کہہ دیا ہے
اِک لفظ کہہ کے تم نے افسانہ کہہ دیا ہے

مجھ میں بھی اک ترا جلوہ ہے وہ کافر جلوہ
دیکھ لے تو بھی جواے شمع تو پروانہ بنے

دل ہے اور آپ کے وعدے کا یقیں کیا کہیے
کوئی اتنا نہ بنائے کوئی اتنا نہ بنے

پھر میرے اشعار میں فلسفیانہ خیالات کا غلبہ ہونے لگا اور میں روایتی مابعد الطبیعات کی ترجمانی کرتا رہا لیکن اس زمانے میں بھی تقلیدی رنگ سے بچتا رہا اور اپنی انفرادیت قائم رکھنے میں غالباً کامیاب رہا۔ ان شعروں کو میں اپنی تائید میں پیش کرتا ہوں :

ترا حجاب اُٹھانا ہے صرف میرا کام
اگرچہ ہے مِری ہستی ترے حجاب کا نام

یہ کائنات زمان ومکاں سَفر ہی سَفر
نہ عاشقی مِری منزل نہ حُسن تیرا مقام

تھی فَنا ہی مِرا مقام مگر
نہ رہے تم بھی جب حجاب اُٹھا

آعاشقوں میں بیٹھ فنا عاشقوں سے سیکھ
یہ حُسن خود حجاب ہے اے حجابِ حُسن

پھر مَیں نے اس روایتی مابعدالطبیعات پر ناقدانہ نظر ڈالی اور میں نے محسوس کیا کہ حقیقت اور مجاز عشق اور حُسن میں اور تو یہ سب اعتبارات ہوتے ہوئے بھی حقیقت ہیں۔ باطل بھی حق ہی کی ایک صورت ہے تو میں نے اپنا یہ خیال اس طرح بیان کیا:

تو حقیقتِ عالم و ہم غیریت باطِل
بلکہ وہمِ باطل بھی حق تو یہ ہے تو ہی ہے

ترکِ جستجو کرکے دل کا مدّعا پایا
ترکِ جستجو لیکن فیضِ جستجو ہی ہے

زلفِ مشکبو کا غم دل کو کیوں کرے برہم
دل کو جو کرے برہم زلفِ مشکبو ہی ہے

یہ فریبِ تسکیں ہے ترکِ آرزو معلوم
ترکِ آرزو میکشؔ یہ بھی آرزو ہی ہے

لیکن اس دَور میں بھی میں ایسے اشعار بھی کہتا رہا جو میرا اصلی مزاج تھا اور جن میں میرے دماغ کی روشنی میں میرا دل بھی دھڑکتا تھا :

بے ہاتھ اُٹھائے ہوئے انگڑائی کا عالم
طوفان کی وہ موج جو پہنچی نہ کنارے
مہک پاکر تری گلشن کی شاخیں جھوم اُٹھتی ہیں
کلی کا رنگ ہوجاتا ہے گہرا چوم کر تجھ کو

آخر میں یہ بھی عرض کرنا اور خُدا کا شکر ادا کرنا ضروری ہے کہ مجھے زمانے کی ناقدری کی شکایت نہیں ہے اور ہندوستان کے صفِ اوّل کے شعرا اور ناقدین، بھارت گورنمنٹ، اور سخن فہم عوام وخواص نے جس طرح میرے کلام اور نثری تصانیف کی قدر افزائی کی ہے وہ میرے لیے بہت کچھ ہے۔ مجھے یاد ہے کہ مولانا حسرتؔ موہانیؒ نے میری ایک غزل لینے کے لیے کانپور سے ایک صاحب کو بھیجا تھا۔ وہ غزل میکدے میں شائع ہوئی جو ۲۹ء تک کے کلام کا مجموعہ ہے اس کا مطلع ہے:

قید و اطلاق کا نقاب اُٹھا
بے حجابی اُٹھا حجاب اُٹھا

سائلؔ دہلوی مرحوم نے میری شاعری کو ''ورائے شاعری'' قرار دیا۔ فانیؔ بدایونی، جگر مرادآبادی اور یگانہ ہمیشہ میری غیر معمولی عزّت افزائی کرتے رہے۔ نیازؔ فتحپوری، نواب اثرؔ لکھنوی مرحوم، پروفیسر آلِ احمد سرور وغیرہ نے رسائل میں ''حرفِ تمنّا'' پر جس طرح تبصرہ کیے وہ میرے لیے سرمایۂ افتخار و مسرّت ہیں۔ میں نے کبھی کسی سے اپنے یا اپنے کلام پر کچھ لکھنے کو نہیں کہا اور نیازؔ فتحپوری نے اس بات کو اپنے تبصرے میں بہت پسندیدہ قرار دیا:

مجھی کو قدرِ زمانہ نہیں ہے اے میکشؔ
وگرنہ ہے تو زمانے میں قدرِ فن باقی

میری وطن اور سیاسی شاعری یا طنزیہ کلام میری محنت یا آورد کا کارنامہ نہیں ہے بلکہ میں

اپنی پوری شاعری آورد اور زور زبردستی سے کرتا رہا ہوں البتہ نثر کی تصانیف پر مجھے بہت محنت تحقیق تلاش و جستجو کرنا پڑی ہے۔

میں ہمیشہ ظلم و استحصال کے خلاف رہا ہوں اور ان تمام سیاسی اور مذہبی نظریوں کا مخالف ہوں جو انسان کو انسان کے آگے ذلیل ہونا سکھاتی ہیں اور جو انسانی خون اور ناانصافی پر اپنی بنیاد قائم کرتی ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں خود استحصال کا شکار رہا ہوں اور اس مصیبت سے ذاتی طور سے واقف ہوں۔

میں ادب میں کسی خاص نظریے کا مخالف یا جانب دار نہیں ہوں۔ میرا محبوب حُسن ہے جہاں بھی ہو، وہ لالۂ کوہسار میں ہو یا سبزہ زار میں یا کسی دلربا انسان میں ہو میں اُسے قبول کر لیتا ہوں اُسے چومتا ہوں، اسے سجدہ کرتا ہوں اور پھر اُسے اپنے دل میں رکھ لیتا ہوں۔

میرے اشعار میری زندگی کا رَس ہیں جن میں غم اور مسرّتیں ہیں، بہاریں اور خزائیں ہیں، دانشوروں اور شاعروں کی محفلیں ہیں اور مجھ سے محبّت کرنے والوں کی صحبتیں ہیں۔ دلوں کے نشتر اور مرہم ہیں خواب اور حقیقتیں ہیں، اپنے دل کا سوز اور کائنات کے دل کی دھڑکنیں ہیں۔ وہ پھول ہیں جن کی طرف میں نے ہاتھ بڑھائے تھے۔ وہ کانٹے ہیں جو چُبھے تھے اور وہ خون کے قطرے ہیں جو ہاتھوں سے ٹپکے تھے۔

مطبوعہ ادبی مجلّہ (سوونیر) ۱۹۸۸ء

آگرہ
اور آگرے والے
مصنف
میکش اکبر آبادیؒ
مرتب: سید حیدر علی شاہ رندا کبر آبادی